طاہر بن جلون

یہ بصارت کُش اندھیرے

ناول

انگریزی سے ترجمہ

ارجمند آرا

یہ بصارت کُش اندھیرے
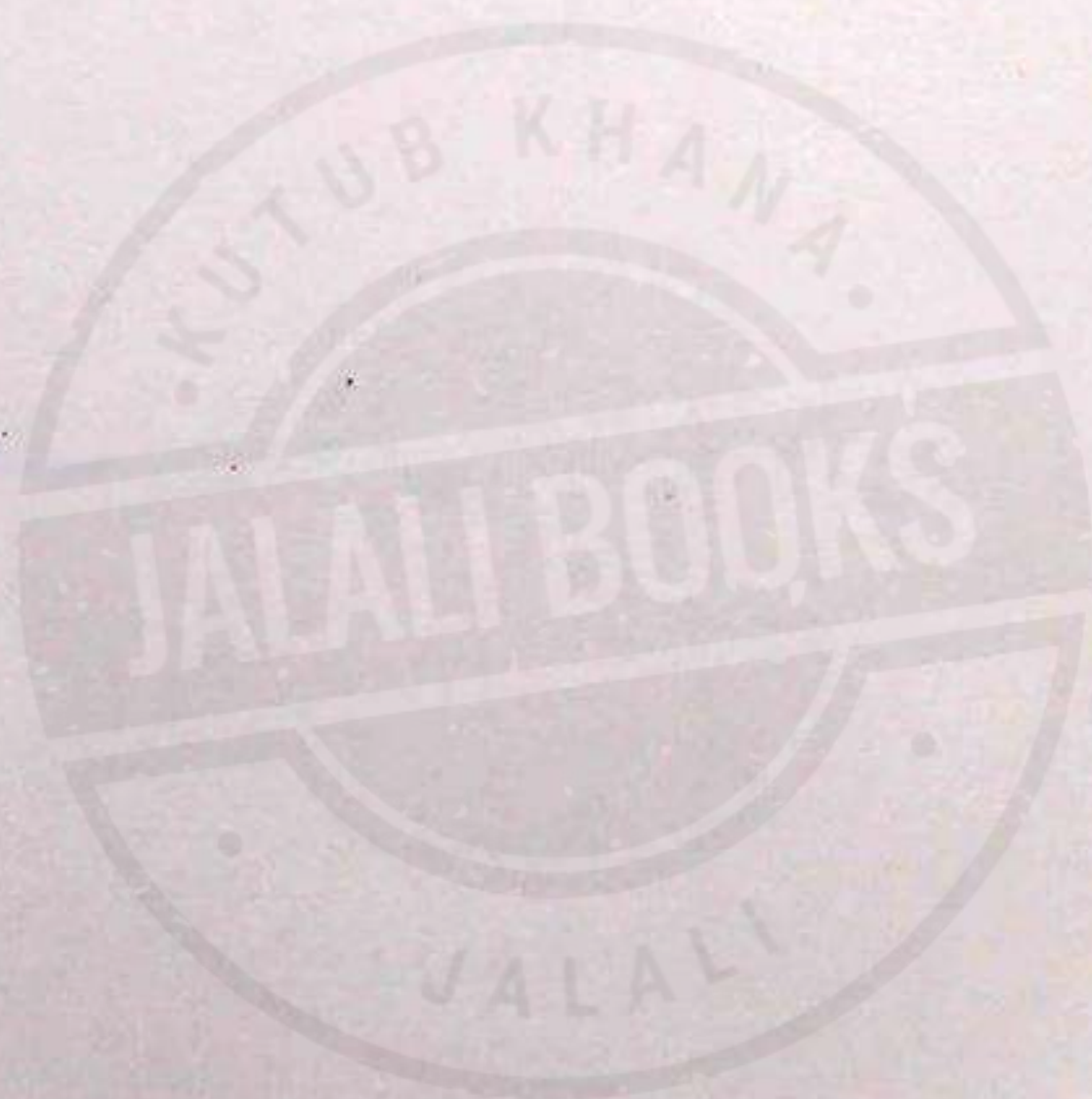
طاہر بن جلون

یہ بصارت کُش اندھیرے

انگریزی سے ترجمہ:

ارجمند آرا

طاہر بن جلون

یہ بصارت کش اندھیرے

انگریزی سے ترجمہ: ارجمند آرا

پہلی اشاعت: 2020

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

طباعت: واحد آرٹ پریس، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400

فون: 35650623 (92-21)

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

cpkarachi2020@gmail.com

ویب سائٹ: www.citypressbooks.com

ناول نگار، شاعر اور نقاد طاہر بن جلون 1944 میں مراکش کے شہر فاس (Fez) میں پیدا ہوا، طنجہ میں عربی اور فرانسیسی اسکول میں تعلیم پائی اور بعد میں رباط کی محمد خامس یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈگری حاصل کر کے کاسابلانکا میں فلسفہ پڑھانا شروع کیا۔ لیکن 1971 میں جب یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم عربی کر دیا گیا تو اس نے عربی میں فلسفہ پڑھانے سے انکار کر کے ترکِ وطن کو ترجیح دی اور پیرس میں سکونت اختیار کر لی۔ اس سے پہلے 1966 میں طلبہ کے ایک سیاسی مظاہرے میں شرکت کرنے کے نتیجے میں اسے بہت سے دوسرے طالبعلموں کے ساتھ گرفتار کر کے انیس مہینے ایک ملٹری کیمپ میں قید رکھا گیا۔ اس عرصے کے دوران ان قیدیوں کو سخت بدسلوکیوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں بھوکا اور شدید سردی میں گرم کپڑوں کے بغیر رکھے جانے کے علاوہ یہ نفسیاتی تشدد بھی شامل تھا کہ ان سب کو یقین تھا کہ وہ اس قید سے زندہ باہر نہیں نکل سکیں گے۔ بن جلون نے تحریر کا آغاز اسی قید کے دوران فرانسیسی میں نظمیں لکھنے سے کیا اور بعد میں فکشن لکھنے کی طرف آیا۔

یہ بصارت کُش اندھیرے
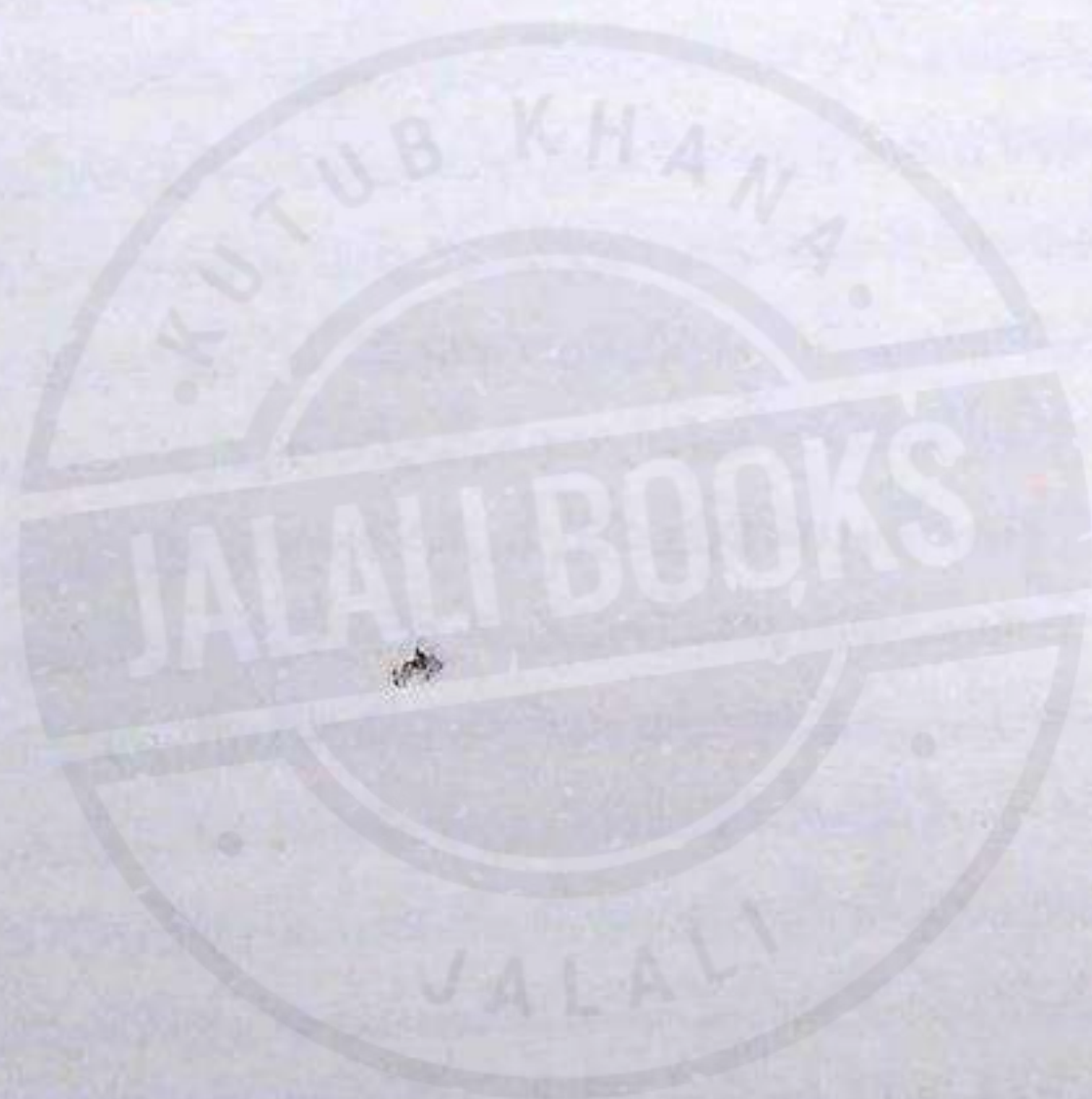
تعارف

10 جولائی 1971 کو مراکشی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کو ٹرکوں میں لاد کر الصخیرت کے گرمائی محل لے جایا گیا جہاں سلطان حسن الثانی (زمانۂ حکومت 1961 تا 1999) اپنی بیالیسویں سالگرہ کی تقریب منا رہا تھا۔ تقریب میں پہنچ کر کمانڈنگ افسروں نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سلطان کو ڈھونڈ کر قتل کر دیں۔ اس حکم سے شروع ہونے والے قتلِ عام میں تقریباً سو مہمان ہلاک کر دیے گئے لیکن سلطان بچ نکلا۔ اس ناکام بغاوت کا ذمے دار سمجھے جانے والوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے بعض کو مختصر سماعت کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور باقی کو دس سال کی سزا دے کر قنیطرہ کے بدنام زندان میں قید کر دیا گیا۔ لیکن دو سال بعد ان سزایافتگان میں سے اٹھاون لوگوں کو ٹرکوں میں لاد کر صحرائی علاقے تازمامرت میں نوتعمیر شدہ جیل پہنچا دیا گیا۔ اس جیل میں دس فٹ لمبی اور پانچ فٹ چوڑی زمین دوز کوٹھریاں بنائی گئی تھیں جن کی اونچائی پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی تاکہ قیدی کھڑا نہ ہو سکے۔ کوٹھریوں میں روشنی کا مطلق گزر نہ تھا۔ بستر کے نام پر دو پتلے کمبل دیے گئے تھے۔ کھانے کے لیے قلیل ترین غذا اور پانی دیا جاتا تھا کہ برسوں تک موت کی نگر پر اٹکے رہیں۔ رفعِ حاجت کے لیے کوٹھری کے فرش میں ہی ایک چھوٹا سا گڈھا تھا۔ کوٹھریوں میں کاکروچ اور بچھو رینگتے پھرتے تھے جن کو قیدی دیکھ نہ سکتے تھے، بس ان کی سرسراہٹ سن سکتے تھے۔ اٹھاون قیدیوں کو، روشنی، علاج معالجے اور ورزش سے محروم کر کے ان زمین دوز کوٹھریوں میں سسک سسک کر مرنے کے لیے بند کر دیا گیا۔ انھیں صرف اس وقت باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی جب انھیں اپنے کسی ہلاک ہو جانے والے ساتھی کو دفن کرنا ہوتا۔ ان میں بیشتر لوگ جاں بحق ہو گئے، بعض مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر اور بیشتر ٹھنڈ سے ٹھٹھر کر۔ بعض کاکروچوں اور بچھوؤں کی خوراک بن گئے۔

باہر کی دنیا تازمامرت کے اس جہنمی زندان کے وجود سے تیرہ سال تک بےخبر رہی۔ حقوقِ انسانی کے کارکنوں کی کوششوں کو رنگ لانے میں مزید پانچ سال لگ گئے۔ بین الاقوامی سطح پر دباؤ کے نتیجے میں اٹھارہ سال کے بعد 1991 میں اس جیل کو مسمار کیا گیا۔ تب تک صرف اٹھائیس لوگ زندہ بچے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے جسم اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ سکڑنے کے سبب ان کے قد ایک فٹ تک گھٹ گئے تھے۔ بچ جانے

والوں کو خبردار کیا گیا کہ وہ کسی غیر ملکی صحافی سے بات نہ کریں۔ تاہم، ان میں سے ایک کیڈٹ نے باہر آنے کے بعد اس عقوبت خانے میں اپنے زندہ رہ جانے کی داستان طاہر بن جلون کو سنائی جس کے نتیجے میں وجود میں آنے والا ناول آپ کے ہاتھ میں ہے۔

ناول نگار، شاعر اور نقاد طاہر بن جلون 1944 میں مراکش کے شہر فاس (Fez) میں پیدا ہوا، طنجہ میں عربی اور فرانسیسی اسکول میں تعلیم پائی اور بعد میں رباط کی محمد خامس یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈگری حاصل کر کے کاسابلانکا میں فلسفہ پڑھانا شروع کیا۔ لیکن 1971 میں جب یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم عربی کر دیا گیا تو اس نے عربی میں فلسفہ پڑھانے سے انکار کر کے ترکِ وطن کو ترجیح دی اور پیرس میں سکونت اختیار کر لی۔ اس سے پہلے 1966 میں طلبہ کے ایک سیاسی مظاہرے میں شرکت کرنے کے نتیجے میں اسے بہت سے دوسرے طالبعلموں کے ساتھ گرفتار کر کے انیس مہینے ایک ملٹری کیمپ میں قید رکھا گیا۔ اس عرصے کے دوران ان قیدیوں کو سخت بدسلوکیوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں بھوکا اور شدید سردی میں گرم کپڑوں کے بغیر رکھے جانے کے علاوہ یہ نفسیاتی تشدد بھی شامل تھا کہ ان سب کو یقین تھا کہ وہ اس قید سے زندہ باہر نہیں نکل سکیں گے۔ بن جلون نے تحریر کا آغاز اسی قید کے دوران فرانسیسی میں نظمیں لکھنے سے کیا اور بعد میں فکشن لکھنے کی طرف آیا۔

زیرِ نظر ناول پہلی بار 2000 میں فرانسیسی میں *Cette aveuglante absence de lumiere* کے عنوان سے شائع ہوا، اور اگلے برس اس کا عربی ترجمہ تلك العتمة الباہرہ کے عنوان سے سامنے آیا۔ انگریزی میں یہ ناول *This Blinding Absence of Light* کے نام سے 2002 میں شائع ہوا۔

اورحان پامک کی انگریزی مترجم اور معروف تبصرہ نگار مورین فریلی (Maureen Freely) کا اس ناول کے بارے میں کہنا ہے: ''تازمامرت کے ایک سابق قیدی کے بیانیے پر مبنی ہونے کے باوجود یہ ناول ان تمام توقعات کے برخلاف نکلتا ہے جو لوگ ان واقعات کو سن کر قائم کرتے ہیں۔ یہ ہیومن رائٹس ہارر جرنلزم کے نیک نیت لیکن گھسے پٹے اور بالآخر تذلیل آمیز بیانیے کے قواعد کی پیروی کرنے سے انکار کر دیتا ہے؛ یہ کوئی سیاسی دستاویز نہیں ہے۔ یہ ان دروغ گویوں، قاتلوں اور اذیت دہندوں کو بے نقاب ضرور کرتا ہے جو تازمامرت کی ہولناکیوں کے ذمے دار تھے لیکن ان پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے سے انکار کرتا ہے۔ کہانی واحد متکلم میں سنائی گئی ہے، لیکن خودسوانحی نہیں ہے۔ اگرچہ تکنیکی طور پر یہ ناول ہے لیکن، اپنے موضوع کی طرح، زندگی کی تمام آسائشوں سے عاری ہے۔ ہم تک صرف سلیم کی آواز پہنچتی ہے، جو تاریکی میں ملفوف ہونے کے باعث اور زیادہ باوقار ہو گئی ہے۔ ناول کی سیدھی، حشو و زوائد سے پاک نثر میں بعض لوگوں نے سیموئل بیکٹ کی گونج محسوس کی ہے، اور اس

گھٹے ہوئے ماحول اور بے بسی پر غور وفکر کی خصوصیت میں بیکٹ جیسی کوئی بات ضرور موجود ہے۔ لیکن ناول کی ابتدائی سطروں ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سلیم نے کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے امید کو ترک کر دیا ہے۔ ان سطروں میں استعمال کی گئی زبان اسلامی تصوف کی زبان ہے۔ تازمامرت میں لائے جانے کے وقت سلیم مذہبی رجحان نہیں رکھتا لیکن اس کی صورت حال اس روحانی دوزخ کا حقیقی روپ ہے جس کا ذکر مسلمان صوفی استعاروں میں کیا کرتے ہیں۔ وہ اپنی ہولناک اذیت سے فرار پانے کے لیے انھی صوفیوں کے نقش قدم پر چلتا ہوا اپنے ذہن میں اتنا گہرا اترتا چلا جاتا ہے جتنا اس کا دھیرے دھیرے گلتا، مسخ ہوتا ہوا جسم اسے اجازت دیتا ہے۔"

طاہر بن جلون نے اپنے اس ناول میں مذہب کے دو تصورات کو جرأت مندانہ طور پر ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا ہے: ایک طرف مسلمان حکمران مذہب کو اپنی سفاک، مطلق العنان آمریت قائم رکھنے کے ہتھیار کے طور پر برتتے ہیں اور سیاسی اختلاف کو مذہب کے خلاف بغاوت قرار دے کر اسے کچلتے ہیں، وہیں دوسری طرف عقیدہ اور مذہبی واردات ایک فرد کو وہ طاقت بخشتے ہیں جو طویل عرصہ (بیشتر اوقات پوری عمر) ہولناک تجربات سے گزرنے اور ان کے باوجود نفرت سے آزاد زندہ رہنے کے کام آتی ہے۔

اس ناول کی ایک خوبی یہ ہے کہ ایک ہولناک قید کا بیان اپنے فوری سیاق و سباق سے اوپر اٹھ کر ہر طرح کی بے انصاف انسانی صورتحال کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے عجب نہیں کہ متعدد دوسرے ناولوں اور آپ بیتیوں میں دکھائے گئے مناظر اور بیان کیے گئے احساسات پڑھنے والے کے ذہن میں جا بجا منور ہوتے رہیں جن کا قید سے تعلق نہ ہو۔ مثلاً کسی کو ملیالم ادیب بن یامین کا ناول بکری بیتی یاد آ سکتا ہے جو ایک انسان کے غلامی جیسی صورتحال سے گزرنے کی کہانی سناتا ہے، کسی اور کو ایرانی فکشن نگار ہوشنگ گلشیری کا ناول شہزادہ احتجاب، جو اقتدار کے ہاتھوں سیاسی مخالفین کے وحشیانہ قتل کا منظر دکھاتا ہے، اور کسی کو دلت آپ بیتیاں جن میں انسانوں کے پورے پورے گروہوں کو انسانی شرف اور دنیا کی قریب قریب ہر آسائش سے محروم کر کے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور اور اس زندگی کو بدلنے کی نہایت دشوار کوششوں میں مصروف دکھایا جاتا ہے۔ عالمی وبا کے دنوں میں اس ناول کو پڑھنے والے اس میں اپنی جھیلی یا دیکھی ہوئی صورتحال کی بھی کچھ جھلکیاں پا سکتے ہیں۔

آج میں اس سے پہلے طاہر بن جلون کے دو ناول کرپشن اور رخصت بالترتیب شمارہ 69 اور شمارہ 74 میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ ناول سچے واقعات پر مبنی ہے جو تازمامرت جیل کے ایک قیدی کے بیان سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اس ناول کا انتساب اس قیدی کے چھوٹے بیٹے عزیز اور اس کی تیسری زندگی کی روشنی رِدا کے نام کیا جاتا ہے۔

نوٹ: متن میں نجمیہ علامت (*) ان لفظوں پر لگائی گئی ہے جو ناول کے آخر میں دی گئی وضاحتی فرہنگ میں شامل ہیں۔

طاہر بن جلون

1

میں ایک طویل عرصے تک اُس سنگِ اسود کی تلاش میں رہا جو روح مرگ کو پاک کر دیتا ہے۔ جب میں 'طویل عرصے' کی بات کرتا ہوں تو مجھے ایک اتھاہ پاتال کا خیال آتا ہے، ایک ایسی سرنگ کا جسے میں نے اپنی انگلیوں اور دانتوں سے کھود کر نکالا ہے —— روشنی کی ایک کرن دیکھنے کی سرکش امید میں، فقط ایک ثانیے کے لیے، ایک لامحدود طولانی لمحے کے لیے —— ایک ایسے شرر کے دیدار کے لیے جو میری آنکھوں میں اپنا نقش بہت گہرائی تک چھوڑ دے گا، جو میرے باطن میں کسی راز کی مانند محفوظ ہو جائے گا۔ وہ یوں ہی رہے گا، میرے سینے میں بسا ہوا، میری لامختتم راتوں کی پرورش کرتا ہوا۔ وہیں، مرطوب زمین کی گہرائیوں میں۔ اس مقبرے میں جہاں ایک ایسے انسان کی بو سمائی ہوئی ہے، تیشوں کی ضربوں نے جس سے اس کی انسانیت چھین لی ہے، ضربوں نے اس زندہ انسان کی کھال ادھیڑ دی ہے، اس سے اس کی بصارت، آواز اور عقل چھین لی ہے۔

لیکن ہماری قبروں میں عقل و ادراک کا کیا کام؟ میرا مطلب ہے اُس جگہ جہاں ہمیں زمین کے اندر دفن کر دیا گیا تھا اور جس میں صرف ایک سوراخ تھا تاکہ ہم سانس لیتے رہیں، تاکہ ایک مخصوص عرصے تک زندہ رہیں، اتنی راتوں تک جییں کہ اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگت سکیں۔ جہاں ہمیں ایسی موت کی معیت میں چھوڑ دیا گیا تھا جسے انتہائی سست روی کے ملبوس میں آنا تھا، ایسی موت جسے آنے میں بہت وقت لینا تھا، وہ سارا وقت جو لوگوں کے پاس تھا —— ہم لوگوں کے پاس جو اَب انسان نہیں رہ گئے تھے، اور ان لوگوں کے پاس جو اَب بھی ہم پر نگراں تھے، اور ان لوگوں کے پاس جو ہمیں یکسر بھول چکے تھے۔ وائے ری سست روی! یہی ہماری بنیادی دشمن تھی —— ایسی دشمن جس نے ہمارے مضروب جسموں کو ڈھانپ لیا تھا، جس نے ہمارے کھلے ہوئے زخموں کو اتنا وقت دیا تھا کہ ان پر کھرنڈ نہ جمنے پائیں۔ ایسی سست روی جو ہمارے دلوں کو ہل ہل موت کے پُرسکون آہنگ کے ساتھ ایسے دھڑکاتی تھی جیسے کہ ہم یوں ہی محو ہو جانے کے لیے بنے ہوں —— ایسی شمع کی مانند جو کہیں فاصلے پر جھلملا رہی ہو

اور خود کو سکون سے یوں جلا رہی ہو جیسے مسرت خود کو ختم کرتی ہے۔ میں اکثر ایسی شمع کے متعلق سوچتا تھا جو موم سے نہیں بلکہ کسی ایسے نامعلوم مادے سے بنی ہو جس پر ہمیں ایک لافانی شعلے کا گمان ہوتا تھا، ایسے شعلے کا جو ہماری بقا کی علامت تھا۔ نیز، میں ایک ایسی عظیم الجثہ ریت گھڑی کا تصور کیا کرتا تھا جس کی ریت کا ہر ذرہ جو اس پاتال میں گرتا تھا جس میں ہم پڑے ہوئے تھے، درحقیقت ذرہ نہیں تھا بلکہ ہماری جلد کا خلیہ تھا، ہمارے خون کی بوند تھا، آکسیجن کا وہ قلیل ترین سانس تھا جو ہمارے اندر گم ہوتا رہتا تھا۔

لیکن ہم کہاں تھے؟ جب ہم یہاں آئے تھے تو کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہ تھے۔ کیا یہ رات کا وقت تھا؟ شاید ہاں۔ رات ہی ہماری رفیق ہوگی، ہمارا خطہ، ہماری دنیا اور ہمارا قبرستان۔ یہی پہلا سبق تھا جو میں نے یہاں سیکھا تھا۔ میری بقا، میری بیچارگی، میری تعذیب، سب کی سب رات کے نقاب پر نقش تھیں۔ یہ بات مجھے فی الفور سمجھ میں آگئی تھی۔ یوں، جیسے میں اسے سدا سے جانتا تھا۔ وائے ری شب! میرا کمبل گویا برف کے منجمد غبار کا بنا ہوا تھا، میری انگلیاں گویا خودکار پستول کے دستے سے کچل دی گئی تھیں، کھڑے کھڑے میری ٹانگیں ایسے درد کرتی تھیں جیسے سیاہ درختوں میں برفانی ہوا نے لرزش پیدا کر دی ہو... رات اترتی نہیں تھی، جیسا کہ محاورتاً کہا جاتا ہے، بلکہ موجود تھی، کبھی نہ ختم ہونے کے لیے موجود۔ ہماری اذیتوں کی اسی ملکہ نے ہماری توجہ ان چیزوں کی طرف دلائی، کہ مبادا ہم کسی شے کو محسوس کرنا بند کر دیں، اور ہم میں سے بعض لوگوں نے اتنی شدت سے اپنا ذہن ان پر مرکوز کیا کہ وہ نہ صرف اپنے جسموں سے آزاد ہو گئے بلکہ اپنی اذیت کو بھی عبور کر گئے۔ ہم نے اپنے بدن اپنے اذیت دہندوں کے حوالے کر دیے تھے، اور یہ سب فراموش کرنے کے لیے خود کو عبادت کی پناہ میں دے دیا تھا، یا پھر اپنے دل کے کسی مخفی گوشے میں سمٹ گئے تھے۔

رات نے ہمیں لباس پہنایا۔ باہر کی دنیا میں لوگ کہہ سکتے ہیں کہ رات ہماری خدمت میں ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ روشنی کہیں نہ تھی۔ روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم اپنی نظر کھو چکے تھے، ہماری آنکھیں اس اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ ہم اندھیرے میں دیکھ سکتے تھے، یا ایسا خیال کرتے تھے کہ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے خیالی پیکر ایسی پرچھائیاں تھے جو تاریکی میں متحرک تھیں۔ باہم ٹکراتے، پانی کے جگ سے جا ٹکراتے اور کبھی باسی روٹی کا وہ ٹکڑا بھی کھسکا

دیتے جو ہم میں سے بعض لوگ شکم کی اینٹھن کو دور کرنے کے لیے بچا کر رکھ لیتے تھے۔

رات اب رات نہیں تھی، کیونکہ دِن کا وجود نہیں تھا، تارے نہیں تھے، چاند نہیں تھا، آسمان نہیں تھا۔ ہم ہی رات تھے۔ ہم رات کی اولاد تھے: ہمارے بدن، سانسیں، دل کی دھڑکنیں، ہمارے ہاتھوں کا ٹٹولنا، زندوں کے مقبرے کے طول وعرض میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک بلاسعی حرکت کرنا — گو کہ لفظ 'زندوں' کی جگہ مجھے 'زندہ رہ جانے والوں' استعمال کرنا چاہیے تھا — خیر، میں واقعی ایک زندہ وجود تھا، انتہائی محرومی میں زندگی کو برداشت کرتا ہوا، آزمائش میں مبتلا، ایسی زندگی جیتا ہوا جس کا خاتمہ صرف موت کے ساتھ ہونا تھا، پھر بھی جو عجب ڈھنگ سے زندگی جیسی ہی لگتی تھی۔

ہماری رات محض رات نہ تھی۔ ہماری رات سیلن زدہ تھی، نہایت ٹھنڈی اور نم، چپچپی، غلیظ، گیلی، انسانوں اور چوہوں کے پیشاب سے متعفن۔ یہ ایسی رات تھی جو ہمارے پاس خاکستری گھوڑے پر سوار ہو کر آئی تھی اور اس کے تعاقب میں پاگل کتوں کا غول آیا تھا۔ رات نے اپنا لبادہ ہمارے چہروں پر ڈال دیا تھا جو اَب کسی بھی بات پر حیران نہ ہوتے تھے — ایسا لبادہ جس میں بھنگے جیسے ننھے سوراخ تک نہ تھے۔ اُف، نہیں: یہ لبادہ تو گیلی ریت سے بنا تھا۔ ہر نوع کے جانوروں کی لید ملی ہوئی مٹی ہماری جلد پر یوں بیٹھ گئی تھی جیسے ہم دفن کیے جا چکے ہوں۔ لبادے میں سے گزر کر ہوا اتنی قلیل مقدار میں ہم تک ضرور پہنچ جاتی تھی کہ ہم فی الفور مر نہ سکیں۔ صرف اتنی ہوا جو ہمیں زندگی سے دور رکھے اور موت سے قریب تر۔ یہ لبادہ منوں ٹنوں وزنی تھا۔ غیر مرئی، پھر بھی محسوس ہونے کے قابل۔ جب میں نے اسے چھوا تو میری انگلیوں نے اس کی کرختگی کو محسوس کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ پشت پر چھپا لیے تاکہ رات کے ساتھ کوئی رابطہ نہ رہے۔ یوں ان کی حفاظت کرتے ہوئے بعض دفعہ یہ ہوتا کہ مرطوب سیمنٹ کی شدید ٹھنڈک مجھے بار بار اپنی پوزیشن بدلنے پر مجبور کر دیتی، لیٹ کر اس کا شکار ہونے کو مجبور، فرش سے چہرہ ستانے پر مجبور، درد میں مبتلا ہاتھوں کے مقابلے میں پیشانی کے درد کو ترجیح دینے پر مجبور۔ اس طرح ترجیحات صرف دو طرح کی ایذاؤں کے درمیان مہیا تھیں۔ خیر، سچ مچ اس طرح بھی نہیں۔ ایذا تو سارے بدن کو برداشت کرنی پڑتی تھی، بدن کے ہر عضو کو، بلا استثنیٰ۔ مقبرہ اس طرح تیار کیا گیا تھا (زندوں کی دنیا سے ایک اور لفظ، لیکن زندگی سے چھوٹی چھوٹی چیزیں مستعار لیتے رہنا مجبوری ہے) کہ جسم تمام قابلِ تصور ایذاؤں کے تجربے سے گزرے، انھیں ہمیشہ اسی طرح دھیرے دھیرے سہتا رہے

اور آئندہ مزید عقوبتیں برداشت کرنے کے لیے زندہ رہے۔

دراصل اس قبرنما کوٹھری کی لمبائی دس فٹ سے کم اور چوڑائی اس سے آدھی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی چھت بہت نیچی تھی۔ صرف پانچ فٹ بلند۔ میں اس میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ پیشاب پاخانے کے لیے ایک سوراخ تھا۔ ایسا سوراخ جس کا قطر چار انچ سے بھی کم تھا۔ یہ سوراخ ہمارے جسموں کا حصہ تھا۔ ہمارے لیے اپنے وجود کو جلد از جلد بھولنا ضروری تھا، پیشاب پاخانے کی بدبو محسوس کرنا چھوڑنا تھا، ہر شے کی بو محسوس کرنا چھوڑنا تھا۔ ہم اپنی ناک بند نہیں کر سکتے تھے۔ نہیں، ہمیں انھیں کھلا رکھنا تھا، کوئی بھی بو محسوس کیے بغیر۔ شروع میں یہ کرنا مشکل لگا۔ اپنے آپ میں ایک مشقت بھرا کام، ایک ایسی دیوانگی جس کا ہونا ضروری تھا، ایک ایسا امتحان جو ہمیں بہر حال پاس کرنا تھا۔ وہاں رہے بغیر وہیں رہنا تھا۔ پانچوں حواس بند کر کے، انھیں کسی اور طرف مبذول کر کے، انھیں کوئی اور زندگی دے کر اس طرح رہنا تھا جیسے مجھ سے میرے حواس چھین کر مجھے اس قبر میں پھینکا گیا ہو۔ بس یہی صورت تھی — مجھے اس طرح رہنا تھا جیسے میں سفر میں ہوں اور سامان کو میں نے کلوک روم میں رکھوا دیا ہے، سوتی یا ریشمی کپڑے میں اچھی طرح لپیٹ کر، چھوٹے سے سوٹ کیس میں بند کر کے، اسے اپنے اذیت دہندوں کی نظروں سے چھپا دیا ہے، ہر شخص سے چھپا دیا ہے۔ مستقبل کے لیے داؤ پر لگا دیا ہے۔

میں اس گڈھے میں ریت کے بورے کی مانند گرا تھا۔ ایسے بورے کی مانند جو دیکھنے میں انسان جیسا لگتا تھا، میں گرا اور میں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ میں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا اور کہیں چوٹ بھی نہیں لگی۔ نہیں: ایسا بھی نہیں — اس حال کو میں برسوں تک سخت تکلیفیں اٹھانے کے بعد پہنچا تھا۔ بلکہ یہ مانتا ہوں کہ تکلیفوں نے میری مدد کی۔ مصائب کی مدد سے، اذیتوں کی مدد سے، میں نے بتدریج اپنے قالب سے دور ہونا اور خود کو اس قبر میں بچھوؤں سے لڑتے دیکھنا سیکھ لیا۔ میں اپنے ہی سر کے اوپر معلق رہنے لگا۔ میں نے رات کو عبور کر لیا۔ لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے، مجھے صدیوں تک ایسی سرنگ کی تاریکی میں چلنا پڑا تھا جس کا کوئی سرا نہ تھا۔

ہمارے پاس بستر نہیں تھے، گدے کے نام پر فوم یا ربر کا ٹکڑا تک نہیں، بھوسے کا ڈھیر یا ایسپارٹو گھاس* کا گٹھر تک نہیں جس پر مویشی سوتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو دو دو مٹیالے کمبل دیے گئے تھے جن پر 1936 کا عدد چھپا ہوا تھا۔ کیا یہ ان کی ساخت کا سال تھا یا پھر کوئی مخصوص کوڈ، ان

لوگوں کے لیے جن کو ست رو موت کی سزا دی گئی تھی؟ ان کرخت اور ہلکے کمبلوں میں سے ہسپتال کی بو آ رہی تھی۔ انھیں ضرور جراثیم کش دواؤں میں بھگویا گیا ہوگا۔ ہمیں خود کو اس بو کی عادت ڈالنی تھی۔ گرمیوں میں ہمیں ان کی قطعی ضرورت نہ تھی، جبکہ سردیوں کے لیے یہ ناکافی تھے۔ ایک کمبل کو تہہ کر کے میں نے اس کا سنکرا گدا بنا لیا۔ اس پر کروٹ کے بل سونا پڑتا تھا۔ اور جب کروٹ بدلنی ہوتی تو اٹھنا پڑتا تھا تا کہ کمبل کی تہیں بگڑ نہ جائیں۔ ایسا کرتے وقت، خصوصاً ابتدائی دنوں میں، گھڑی کی کل کی طرح میرا سر چھت سے جا ٹکراتا تھا۔

میں دوسرے کمبل میں خود کو لپیٹتا تھا اور جراثیم کش دوا کی بو سونگھتا تھا جس سے میرے سر میں عجیب و غریب درد ہوتا تھا۔ یہ کمبل زہر میں بجھے ہوئے تھے!

کتنی ہی بار میں خود کو یقین دلاتا تھا کہ بس اب زمین پھٹے گی اور مجھے نگل جائے گی! ہر بات کی منصوبہ بندی اچھی طرح کی گئی تھی۔ مثلاً ہمارے لیے یومیہ پانی کی مقدار پانچ کوارٹ (ایک کوارٹ مساوی 1.1 لیٹر) مقرر تھی۔ کس نے یہ مقدار مقرر کی تھی؟ شاید ڈاکٹروں نے۔ بہر حال، یہ بھی پینے کے قابل نہ ہوتا تھا۔ میں اس میں سے تھوڑا پانی پلاسٹک کے اُس جگ میں بچا کر رکھ لیتا تھا جو مجھے دیا گیا تھا، اور پھر اسے سارا دن کے لیے رکھ چھوڑتا تھا۔ اس سے جگ کے پیندے میں ریت اور گاد کی باریک سی تہہ بیٹھ جاتی تھی۔

انھوں نے ہر شے کا انتظام کیا تھا، اسی لیے شاید کوٹھری کا فرش اس طرح بنایا گیا تھا کہ چند مہینوں یا چند برسوں میں یہ ایک طرف کو جھک جائے اور ہمیں اس اجتماعی قبر میں دھکیل دے جو اس عمارت کے ٹھیک نیچے کھودی گئی ہوگی۔

2

یہ 10 جولائی 1971 کی رات تھی جب میرے لیے وقت تھم گیا۔ تب سے میری عمر نہ تو بڑھی ہے، نہ گھٹی ہے۔ میں اپنی عمر کھو چکا۔ آپ میرے چہرے سے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ درحقیقت، میں اب وہاں نہیں ہوں کہ اپنی عمر کو کوئی چہرہ دے سکوں۔ میں عدم میں ساکت ہو چکا ہوں، جہاں

وقت ختم ہو چکا، خلا میں واپس اچھال دیا گیا، اُس سفید چادر کے وسیع ساحل کے حوالے کر دیا گیا جو مدھم ہوا میں پھڑ پھڑا رہی ہے۔ اس آسمان کو لوٹا دیا گیا جو ستاروں سے، پیکروں سے، بچپن کے ان خوابوں سے جو اس میں پناہ لیتے تھے، ہر شے سے، یہاں تک کہ خدا سے بھی عاری ہو چکا۔ میں اس عدم کے اندر فراموشگاری سیکھنے کے لیے داخل ہوا تھا، لیکن عدم میں برقرار رہنے میں مجھے پوری کامیابی کبھی نہیں مل سکی، تصور تک میں نہیں۔

بدبختی ہوا کے جھونکے کی مانند آئی تھی، اتنی ہی سادگی سے جتنا کہ ممکن تھی۔ ایک ایسی صبح کو جب آسمان نیلا تھا، اتنا نیلا کہ میری چکا چوند آنکھیں کئی لمحوں تک کچھ بھی دیکھ نہ سکیں اور میں نے اپنا سر یوں جھکا لیا جیسے یہ ابھی گر پڑے گا۔ میں جانتا تھا کہ یہی دن ہے جب نیلاہٹ خون سے داغدار ہو جائے گی۔ میں یہ بات اتنی اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے وضو کیا اور بیرک کے کمرے کے ایک گوشے میں، جہاں دم گھونٹ خاموشی کا راج تھا، نماز پڑھی۔ میں نے زندگی، موسم بہار، اہل خانہ، دوستوں، خوابوں، اور زندگی کے لیے الوداعی نوافل تک پڑھ ڈالے۔ سڑک کے دوسری طرف، پہاڑی کے دامن میں، ایک گدھے نے میری طرف ان حیوانوں کی مانند اداس اور ویران نظروں سے دیکھا جو کسی انسان کے ساتھ اس کے دکھ میں ہمدردی جتانا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا، ''چلو، کم از کم اسے تو خون نہیں بہانا ہے، اور اسے اندازہ نہیں کہ آج آسمان کس قدر نیلا ہے۔''

صخیرات * کے محل کی سفید دیواریں کیا اب بھی کسی کو یاد ہوں گی؟ میز پوشوں پر اور چمکدار سبز لانوں پر پھیلا ہوا خون کسے یاد ہو گا؟ رنگوں کا بڑا شدید الجھاوا تھا۔ آسمان سے نیلا رنگ غائب ہو چکا تھا، جسموں میں سرخی باقی نہیں تھی، آفتاب خون کو اپنی آغوش میں غیر معمولی سرعت سے سمیٹ رہا تھا اور ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔ آنسو جو خود بہ خود بہہ رہے تھے، اور ہمارے ہاتھوں کو بھگو رہے تھے جن میں اب ہتھیار اٹھانے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ ہم کہیں اور تھے، شاید اتنی دور کہ جہاں سے آنکھیں لڑھکتی ہوئی واپس سر میں سما جاتی ہیں۔ ہماری آنکھیں سفید پڑ چکی تھیں۔ اب ہمیں نہ تو آسمان نظر آ رہا تھا، نہ دریا۔ سرد ہوا کے ایک جھونکے نے ہماری جلدوں کو سہلایا۔ گولیوں کی آواز کا لامتناہی سلسلہ ابد تک پہنچ رہا تھا۔ ایک طویل عرصے تک اس کو ہمارے تعاقب میں رہنا تھا۔ یہی واحد آواز تھی جو ہم سن

رہے تھے۔ ہمارے کان مصروف تھے۔ مجھے اب قطعی یاد نہیں کہ ہم نے شاہی دستے کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے یا ان لوگوں کے سامنے جو باغیوں کی سرکوبی کر رہے تھے، یا پھر ان افسروں نے ہمیں گرفتار کیا اور ہتھیار چھینے جنھوں نے بازی پلٹتے ہی اپنا پالا بدل لیا تھا۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ ہم محض سپاہی تھے، پیادے اور جونیئر افسر۔ اتنے غیر اہم کہ خود کوئی اقدام نہ کر سکتے تھے۔ ہم ایسے اجسام تھے جو گرمی کی تندی میں بھی سرد تھے۔ ہمارے ہاتھ ہماری پشتوں پر باندھ کر ہمیں ان ٹرکوں میں ٹھونس دیا گیا جن میں لاشوں اور زخمیوں کے انبار لدے تھے۔ میرا سر دو مردہ سپاہیوں کے درمیان پھنس گیا۔ ان کا خون بہہ بہہ کر میری آنکھوں میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ گرم تھا۔ پیشاب اور غلاظت ان دونوں کے جسموں سے خارج ہو رہے تھے۔ کیا مجھے ایسے حالات میں بھی قے کرنے کا حق حاصل تھا؟ مجھے تلخ قے ہو ہی گئی۔ انسان ایسے میں کیا سوچ سکتا ہے جب دوسرے انسانوں کا خون اس کے چہرے پر بہہ رہا ہو؟ کسی پھول، یا پہاڑی پر کھڑے گدھے، یا لکڑی کے ڈنڈے کو تلوار سمجھ کر شمشیر بازی کرتے ہوئے بچے کے بارے میں سوچے...؟ یا شاید کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ وہ وہاں موجود نہ ہونے کی سعی کرتا ہے، اپنا قالب چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے، یہ یقین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ سو رہا ہے اور کسی روح فرسا خواب میں قید ہے۔

نہیں، میں جانتا تھا یہ خواب نہیں۔ میرا ذہن بالکل صاف تھا۔ میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ میں نے سانس کو روکا نہیں۔ میں نے قے اور موت سے بھرا ہوا گہرا سانس کھینچا۔ میں گھٹن سے مر جانا چاہتا تھا۔ میں نے جسموں کے قریب پڑے پلاسٹک کے تھیلے میں اپنا سر گھسانا چاہا۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ ایک سپاہی کو غصہ آ گیا اور اس نے میرے سر پر پیچھے سے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ بے ہوش ہو کر میں اب لاشوں کا تعفن سونگھنے سے بچ گیا تھا۔ میں اب کچھ بھی سونگھنے کے قابل نہ رہا تھا۔ میں آزاد تھا۔ پنڈلیوں پر رائفل کے دستے کی ضرب مجھے پھر سے زندگی کی طرف لے آئی۔

ہم کہاں تھے؟ بہت سردی تھی۔ شاید رباط میں ملٹری ہسپتال کے مردہ گھر میں۔ زندوں کو ابھی مُردوں سے الگ نہیں کیا گیا تھا۔ بعض زخمی کراہ رہے تھے، بعض اپنے سروں سے دیواروں میں ٹکریں مار رہے تھے، قسمت کو، مذہب کو، فوج کو اور سورج کو کوس رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بغاوت سورج کی وجہ سے ناکام ہوئی: سورج جو حد سے زیادہ روشن تھا، اس میں حد سے زیادہ حدت تھی۔ کسی نے چیخ

کر کہا: "لیکن — کیسی بغاوت؟ ہمارا اصول تو ہمارے خون میں شامل ہے: اللہ، وطن، سلطان۔" وہ اس نعرے کا وِرد مناجات کی طرح کر رہے تھے جیسے ان کی غداری کا بس یہی کفارہ ہو۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ میں خلا میں تحلیل ہو جانا چاہتا تھا تا کہ کچھ نہ سن سکوں، کچھ بھی محسوس نہ کر سکوں۔

3

جیل کے بی بلاک میں ہم کل تیئس لوگ تھے، ہر ایک الگ کوٹھری میں قید۔ زمین میں بنے اس سوراخ کے علاوہ جو ٹوائلٹ کا کام دیتا تھا، لوہے کے دروازے کے اوپر ایک اور سوراخ تھا جو ہوا کی آمد کے لیے تھا۔ اب ہم میں سے کسی کا کوئی نام نہیں تھا، کوئی ماضی نہیں، کوئی مستقبل نہیں۔ ہر شے ہم سے چھین لی گئی، سوائے ہماری چمڑیوں اور سروں کے۔ خیر، یہ بھی سب کے پاس نہ رہے۔ نمبر بارہ پہلا تھا جس کا دماغ پہلے اُلٹا۔ وہ بہت جلد بے حس ہو گیا۔ ہم میں سب سے آگے نکل گیا۔ وہ اپنے ذہن کو — یا اس کا جو بھی حصہ بچا تھا — جیل کے دروازے پر ہی چھوڑ کر خانہ رنج و محن میں داخل ہوا تھا۔ بعض نے بتایا کہ انھوں نے اسے اپنا سر دُھنتے ہوئے اور جھک کر دو پتھروں کے درمیان اسے دفن کرنے کی کوشش میں مصروف دیکھا تھا۔ یوں اس کا داخلہ بالکل آزاد ہوا تھا۔ کچھ بھی اس کے اندر گزرتا نہ تھا۔ وہ خود سے ہی باتیں کرتا رہتا تھا، مسلسل۔ نیند میں بھی نا قابلِ فہم الفاظ بڑبڑاتا تھا۔

واضح احکامات کے برخلاف ہم ایک دوسرے کو اسمِ معرفہ اور خاندانی ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ بارہ نمبر کا نام حمید تھا۔ وہ دبلا پتلا اور طول قامت تھا اور رنگ کا زردی مائل۔ اس کا باپ فوج میں ایڈجوٹنٹ تھا جس کا ایک بازو انڈوچائنا کی جنگ میں کام آ گیا تھا۔ فوج نے اس کے بچوں کی تعلیم کا ذمہ لے لیا تھا، اور وہ سب فوج میں ہی بھرتی ہوئے تھے۔ حمید ایر لائن پائلٹ بننا چاہتا تھا اور فوج چھوڑنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

دن میں اسے خاموش کرانا ممکن نہ تھا۔ اس کے ہذیان نے ہمیں تھوڑا سا یقین دلایا: ہم میں ابھی ردِ عمل ظاہر کرنے کی صلاحیت باقی تھی، ایسے الفاظ سننے کی چاہت تھی جو بامعنی ہوں، جو ہمیں

سوچنے، مسکرانے اور امید قائم رکھنے پر اکسائیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ حمید جا چکا۔ وہ ہمیں چھوڑ چکا۔ وہ اب نہ ہمیں دیکھ سکتا تھا اور نہ سن سکتا تھا۔ حمید ہمارا اِمکانی مستقبل تھا، گو کہ ہمیں بار بار یہ بتایا جا چکا تھا کہ ہمارا اب کوئی مستقبل نہیں۔ شاید ڈاکٹروں نے اسے دوائیں دے کر ازراہِ نمونہ پاگل کر دیا ہو، تا کہ ہم دیکھ لیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن نہ تھا، کیونکہ جو وقت آئندہ ہم نے تہہ خانے میں ہر قسم کی ایذائیں برداشت کرتے ہوئے گزارا اس میں ہم میں سے بعض نے جانیں گنوائیں اور بعض نے حمید کی طرح ہوش و حواس کھو دیے۔

اس کی آواز اندھیرے میں گونجتی رہتی تھی۔ بسا اوقات کوئی لفظ ہماری سمجھ میں آ جاتا، کبھی کوئی جملہ بھی: پینتھر، پاٹ اینڈ پاٹ ہرڈ، پاسیبل، پاپلین، پُش کارٹ، پک نس، پیری پک، پائی آف پنجر اینڈ پرسٹ.... یہ حرف 'پ' کا دن تھا۔

گارڈ اسے بولنے سے نہ روکتے تھے، اس خیال سے کہ اس کی حالت دیکھ کر ہماری جھلاہٹیں مزید تکلیف دہ ہو جائیں۔ ان کے کھیل کو ناکام کرنے کی غرض سے دس نمبر، غربی نے قرآن کی تلاوت شروع کر دی جو اسے سارا حفظ تھا۔ ہم میں سے اکثر کی مانند اس نے بھی دینی مدرسے میں تعلیم پائی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ وہ بیرکوں کا مفتی بننا چاہتا تھا۔ اس نے قرأت کے مقابلے میں بھی حصہ لیا تھا اور تیسرا انعام جیتا تھا۔ وہ ایک نیک مسلمان تھا، نماز کا کبھی ناغہ نہیں کرتا تھا، اور سونے سے پہلے چند دعائیں ضرور پڑھتا تھا۔ افسروں کے تربیتی اسکول میں سب اسے استاد پکارتے تھے۔

جب استاد قرآن کی تلاوت شروع کرتا تو حمید کی آواز دھیمی پڑنی شروع ہو جاتی اور ہوتے ہوتے خاموش ہو جاتی۔ لگتا تھا جیسے مقدس صحیفے کی آیتیں اسے سکون پہنچاتی ہیں، یا کم از کم اس کے ہذیان کو موقوف کر دیتی ہیں۔ اور جیسے ہی استاد اپنا طے شدہ آخری جملہ دہراتا، ''یوں قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ کا کلام صادق ہے۔'' تو حمید پھر اسی شدت سے، اسی مجنونانہ آہنگ اور الجھن کے ساتھ بڑبڑانا شروع کر دیتا تھا۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ فرانسیسی یا عربی کے الفاظ اس کے منھ سے یوں برآمد ہوتے جیسے پانی کی ٹونٹی کھل گئی ہو۔ ہمیں چھوڑ کر جانے، خود کو تنہا کرنے اور موت کو پکارنے کا یہ اس کا اپنا طریقہ تھا۔ موت اس کے قریب تب آئی جب وہ بے خودی کی کیفیت میں اپنے سر سے دیوار میں ٹکریں مار رہا تھا۔ اس نے ایک طویل چیخ ماری اور پھر اس کی آواز اور سانسیں ہمیشہ کے لیے خاموش

ہو گئیں۔ استاد نے قرآن کی پہلی سورت (فاتحہ) پڑھی، بلکہ لحن کے ساتھ پڑھی، بہت پُرکشش انداز میں۔ اس کے بعد جو خاموشی چھائی وہ بے حد پُرجلال تھی۔

حمید کے کفن دفن کے سلسلے میں محافظوں سے بات کرنے کی ذمے داری استاد کو سونپی گئی۔ یہ ایک طولانی اور پیچیدہ عمل تھا۔ محافظوں کو کیمپ کے کمانڈنٹ سے مشورہ کرنا تھا، جبکہ اسے دارالخلافہ سے آنے والی ہدایات کا انتظار کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ آخری رسومات، نمازِ جنازہ اور تلاوتِ قرآن کے بغیر ہی لاش کو گڑھے میں پھینک دیا جائے۔ ہماری پہلی مزاحمت اس مطالبے سے شروع ہوئی کہ ہمارے ساتھی کو معقول طریقے سے دفنایا جائے۔ ہم بائیس زندہ وجود اس لاش کے اردگرد تھے جس کی آواز ہمارے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی۔ ہم نے مسلمانوں کی اس روایت کا حوالہ دیا جس کے مطابق دفنانے میں تاخیر کو ناپسندیدہ بتایا گیا ہے، اور یہ کہ مرنے والے پر سورج صرف ایک بار ہی غروب ہونا چاہیے۔ سب باتیں جلدی طے ہونا ضروری تھیں، خصوصاً اس لیے کہ ستمبر کی دم گھونٹ گرمی لاش پر جلد ہی حملہ کرنے والی تھی۔

تدفین دوسرے دن، صبح کے وقت عمل میں آئی۔ ایسے حالات میں بھی ہم خوش ہوئے تھے۔ سینتالیس دن تاریکی میں گزارنے کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر سورج کی روشنی دیکھ رہے تھے۔ ہم کھڑے کھڑے پلکیں جھپکا رہے تھے، اور ہم میں سے بعض رو رہے تھے۔ استاد نے آخری رسومات ادا کیں۔ اس نے جسد کو غسل دینے کے لیے پانی طلب کیا اور کفن کے لیے چادر مانگی۔ بظاہر متاثر ہو کر ایک محافظ چند بوتلیں پانی کی اور ایک کوری سفید چادر لے آیا۔

یہ ایسا موقع ملا تھا جس میں ہر شخص اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ میں نے رہنمائی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہماری عمارت کم از کم تیرہ فٹ اونچی فصیل سے گھری ہوئی تھی۔ ایک بات طے تھی کہ ہم سمندر کے قریب نہ تھے۔ کیمپ کے چاروں طرف خاکستری پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ درخت ندارد۔ فاصلے پر ایک بیرک۔ اور کچھ بھی نہیں۔ صرف خلا۔ ہمارے محبس کا نصف حصہ زمین کے اندر تھا۔ محافظ ان دو چھوٹی کوٹھریوں میں رہتے تھے جو اس مقام سے جہاں حمید کو دفن کیا گیا، چند سو گز کے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔

ایک گھنٹے کے مختصر سے وقفے کے لیے میں نے اپنی آنکھوں کو، اور منھ کو بھی، یکسر کھلا رکھا تا کہ زیادہ سے زیادہ روشنی نگل سکوں۔ روشنی میں سانس لے سکوں، اسے اپنے اندر ذخیرہ کرلوں، اسے اپنے پاس محفوظ رکھوں اور اس وقت اسے یاد کروں جب تاریکی میری پلکوں پر ازحد گراں گزرنے لگے۔ میں نے بدن کا بالائی حصہ ننگا کرلیا تا کہ میری جلد اس بیش بہا شے کو جذب اور ذخیرہ کرلے۔ ایک محافظ نے مجھے قمیص پہننے کا حکم دیا۔

ایک ساتھی کے جنازے پر یوں خوش ہونے پر اس شام میں خود سے نہایت شرمندہ ہوا۔ کیا میں اتنا بے رحم اور شنیع ہوں کہ اپنے ہی لوگوں میں سے کسی کی موت سے خود کو فائدہ پہنچاؤں؟ سچائی صریحاً واضح تھی، تلخ اور سفاک سچائی۔ اگر میرے ہمسائے کی موت سے مجھے سورج دیکھنا نصیب ہوا، چند ثانیوں کے لیے ہی سہی، تو کیا مجھے اس کے مرنے کی تمنا کرنی چاہیے تھی؟ بہرحال، اس طرح سوچنے والا میں تنہا نہیں تھا۔ نمبر نو، ادریس نے اس پر بولنے کا حوصلہ کیا۔ جنازہ ہمارے لیے باہر نکلنے اور دن کی روشنی دیکھنے کا ایک موقع فراہم کرگیا تھا۔ یہ ہمارے لیے انعام تھا، ہماری خفیہ امید، ایسی امید کہ آپ جس کا ذکر تک کرنے کی ہمت نہ کریں، بس سوچ کر رہ جائیں۔

اور موت سورج کی ایک پرشکوہ کرن میں تبدیل ہوگئی۔ بے شک، ہمیں یہاں مرنے کے لیے پھینکا گیا تھا۔ محافظوں کا مشن ہمیں ممکن حد تک موت کے قریب رکھنا تھا۔ ہمارے جسموں کو بتدریج سڑنے کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ اذیت کو طویل عرصے تک جاری رہنا تھا، دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی، کسی عضو کو چھوڑے بغیر، جلد کے ایک ایک حصے میں، پیر کے انگوٹھے سے سر کے بالوں تک، ہر جوڑ، ہر شکن میں سرسراتی ہوئی، ایسی سوئی کی مانند جو اپنا زہر اتارنے کے لیے کسی رگ کی متلاشی ہو۔

اجل کو آنے دو! بچ جانے والوں کو اس کا استعمال دن کی روشنی دیکھنے کے لیے کرنے دو! موت کا کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ حمید پہلا شخص تھا جو ہمارے لیے روشنی کا جھماکا لے کر آیا تھا۔ یہ اس کا الوداعی تحفہ تھا۔ وہ بلا اذیت مرگیا، یا تقریباً بلا اذیت۔

بھٹ میں ایک برس گزارنے کے بعد جو سوال ہم سب کا تعاقب کر رہا تھا یہ تھا: ''اب کس کی باری ہے؟'' میرا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ ادریس کو ہڈیوں اور جوڑوں کی بیماری تھی۔ اس کو ہمارے کمانڈ ویونٹ

میں شامل نہیں ہونا تھا، بلکہ اسے رباط کے ملٹری ہسپتال پر اتارا جانا تھا۔ لیکن ہمارا کمانڈر بھول گیا۔ ادریس کے نصیبوں میں اس زندان میں آکر مرنا بدا تھا، زیرِ زمین زندان میں۔ اس کی مرجھائی ٹانگیں سکڑ گئیں اور چھاتی سے جا چپکیں۔ اس کے سارے عضلات تحلیل ہو رہے تھے۔ وہ ہاتھ تک نہیں اٹھا سکتا تھا۔ محافظوں نے مجھے اتنی اجازت دے دی کہ میں اسے کھانا کھلایا کروں اور ٹوائلٹ کا سوراخ استعمال کرنے میں اس کی مدد کروں۔ وہ اب غذا بھی نہیں چبا سکتا تھا۔ میں روٹی چباتا اور چھوٹے چھوٹے لقمے اس کے منہ میں ڈال دیتا، اس کے بعد ایک گھونٹ پانی پلاتا۔ بعض اوقات اسے پھندا لگ جاتا۔ جب اس میں کھانسنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تو وہ جھکتا اور سر کو اپنے گھٹنوں میں دے کر زمین پر لوٹ جاتا تاکہ پانی اس کے حلق سے اتر کر براہِ راست معدے کی نلکی میں چلا جائے۔ کمزوری کے سبب وہ ایسے پرندے کی مانند لگنے لگا تھا جس کے بال و پر نوچ دیے گئے ہوں۔ میں اس کی آنکھیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ضرور پتھرا گئی ہوں گی، خالی ہوں گی۔ وہ اکڑوں بیٹھ کر سوتا تھا، سر کو دیوار سے ٹکا کر، ہاتھ اپنے پیروں کے نیچے دبائے ہوئے۔ اس زاویے سے بیٹھنے میں، جس سے اسے جوڑوں میں شدید تکلیف کے بغیر سونے میں مدد مل جائے، اسے کچھ وقت لگتا تھا۔ اس کی قوتِ گویائی بھی بتدریج ختم ہو رہی تھی۔ وہ کیا بڑبڑا رہا ہے، یہ سمجھنے کے لیے ہمیں اندازے سے کام چلانا پڑتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ موت کی تمنا کرتا ہے، لیکن مرنے میں میں بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میرے پاس زہر کی ننھی نیلی گولی ہوتی تو اس کی رہائی کے لیے میں شاید اسے ایک چٹکی کھلا دیتا۔ اپنے آخری ایام میں اس نے کسی بھی قسم کی غذا لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ موت اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال چکی ہے۔ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا تھا، شاید کوئی عدد۔ میرا خیال ہے کہ یہ چالیس کا عدد تھا۔ شاید یہ کہ پورے جسم پر قابض ہونے میں موت چالیس دن لگاتی ہے، لیکن یہاں سے وہ اسے خاصی جلدی لے گئی۔

اس کی لاش کو غسل دینے میں مجھے کافی دقت پیش آئی۔ اس کے مڑے ہوئے گھٹنوں نے اس کی پسلیوں کے پنجر میں سوراخ کر دیا تھا اور پسلیوں نے اس کے جوڑوں میں اپنی راہ ڈھونڈ لی تھی۔ اس کے بازوؤں یا ٹانگوں کو سیدھا کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس کا جسم گیند کی شکل اختیار کر چکا تھا، ہڈیالی گیند کی۔ اس کا وزن شاید نوے پونڈ سے بھی کم تھا۔ وہ ایک عجیب الخلقت چھوٹی سی شے میں تبدیل ہو چکا تھا جسے

عارضے نے اس قدر مسخ کر دیا تھا کہ اب اس میں انسانوں جیسا کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ میں ابھی اس کے جسد کو تیار کر کے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں محافظوں نے مجھے ہٹا دیا اور مجھے واپس میری کوٹھری میں بھیج دیا۔ پھر وہ لاش کو ایک ہتھ ریڑھی پر لاد کر لے گئے۔ میں گنگ تھا۔ مجھے ایک لفظ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر وہ اسے لے کر غائب ہو گئے تھے۔

4

انسان کو اناج کی مانند پیس دینے والی مصیبتوں کے دوران نہایت معمولی چیزیں بھی اس کے لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں اور انھیں پانے کی خواہش وہ دنیا کی ہر شے سے زیادہ کرتا ہے۔

میں نے بہت جلد یہ بات سمجھ لی تھی کہ اب ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں۔ ہمیں روزمرہ کے چھوٹے سے چھوٹے معمولات کو خیرباد کہنا ہوگا، بھولنا ہوگا، خود کو یہ سمجھانا ہوگا کہ ”میری زندگی ختم ہو چکی“، یا ”انھوں نے ہماری زندگی چھین لی ہے۔“ اب ہمارے لیے پچھتاووں کی کوئی گنجائش باقی نہیں، قسمت کا رونا باقی نہیں، امید باقی نہیں۔ زندگی اس کیمپ کے اطراف میں کھنچی دوہری فصیل کے باہر رہ گئی۔ زندگی کے اطوار کو چھوڑنے کی یہ ایک کامل تمہید ہے، مثلاً یہ سیکھنا ہے کہ دن اور رات ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے اور اپنی قابلِ نفریں گھٹاٹوپ تاریکی میں وہ ایک ہی جیسے ہیں۔ اس خیال سے نجات پانا ہے کہ ہم پہلے کیا تھے۔ اس سے نجات پانا ہے کہ صبح بستر سے اٹھ کر اندازے لگائیں کہ دن نکلے گا اور ہمارے لیے کون سی حیران کن چیزیں لائے گا۔ باتھ روم نہیں جانا ہے، آئینے میں صورت دیکھتے ہوئے، اپنی جلد پر عمر کی چھوڑی ہوئی کسی لکیر کو دیکھ کر مذاق اڑانے کے لیے منہ نہیں چڑھانا ہے۔ گالوں پر صابن کے جھاگ بنا کر، کاہلی سے بھٹکتے خیالات کے ساتھ، یا شاید گنگناتے ہوئے، یا پھر مدھم سروں میں سیٹی بجاتے ہوئے، شیو نہیں کرنا ہے۔ پھر شاور کے نیچے جانا اور نہانے میں اچھے خاصے پندرہ منٹ صرف کرنا، تاکہ لیونڈر کی خوشبو میں بسے صابن سے اپنے بدن کو رگڑنے کی ہلکی پھلکی مسرت کا لطف اٹھا سکیں اور اپنے شانوں پر پھسلتے ہوئے گرم پانی کو محسوس کرنا، بدن کو خشک کر کے زیریں لباس پہننا، سلیقے سے استری شدہ شرٹ پہننا، پھر اپنے لیے سوٹ، ٹائی اور جوتوں کا انتخاب کرنا۔ کافی پیتے پیتے اخبار پڑھنا... ہمیں

زندگی کی ان سب چھوٹی چھوٹی سرگرمیوں کو بہرحال چھوڑنا تھا، اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا۔ اس منظر میں ذرا تنوع لاتا ہوں: ان تمام اشیا کا پھر سے جائزہ لیتا ہوں جو ہماری زندگی میں اب کبھی نہیں آئیں گی۔ اوہ، ہم آئندہ کبھی برش نہ کرنے کے عادی کیسے ہوں گے، اپنے حلق میں فلورائڈ کا خوش کن ذائقہ کبھی محسوس نہ کر سکیں گے، سانس کے تعفن اور نظر انداز کیے گئے بدن کی بدبو کو قبول کرنا ہوگا۔۔۔ پانچ کوارٹ پانی جو وہ لوگ ہمیں دیتے تھے، میں تقریباً سارے کا سارا اپنے بدن کی صفائی میں صرف کر دیتا تھا۔ ان گھناؤنے حالات میں بدن کی صفائی میرے نزدیک لازمی ضرورت تھی۔ میرا خیال ہے کہ پانی کے بغیر میں بالکل ہی ٹوٹ جاتا۔ میں نماز کے لیے اور صاف ستھرا محسوس کرنے کے لیے وضو کرتا تھا، اپنے بدن کو کبھی کمبل سے خشک نہیں کرتا تھا، بلکہ پانی کی بوندوں کے خود بخود خشک ہونے کا انتظار کیا کرتا تھا۔

سیکھنے کا یہ عمل طویل لیکن کارآمد تھا۔ میں تصور کرتا تھا کہ میں ایسا شخص ہوں جسے عہدِ حجر میں پھینک دیا گیا ہے اور مجھے نئے سرے سے تمام چیزیں ایجاد کرنی ہیں۔ کسی بھی شے کی مدد کے بغیر۔

ابتدائی دنوں میں اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے میں یہ تصور کیا کرتا تھا کہ خدا کوئی معجزہ دکھائے گا، امریکی فلموں کے طربیہ انجام کی طرح۔ میں قابلِ یقین مفروضوں کے بارے میں سوچتا تھا: کوئی زلزلہ آئے گا؛ بجلی اُس وقت گرے گی جب سارے محافظ کسی پیڑ کے نیچے سگریٹ پینے کے لیے جمع ہوں گے اور ان کا خاتمہ کر دے گی۔ کمانڈنٹ جو کیمپ کا منتظم تھا، یہ خواب دیکھے گا کہ کوئی غیبی آواز اسے اپنے اعلیٰ افسران کی حکم عدولی کا حکم دے رہی ہے اور وہ ہمیں آزاد کر دے گا۔ یا پھر اس کی تیرہ بخت زندگی پر کوئی آسمانی عتاب نازل ہو جائے گا... لیکن مشیتِ ایزدی نے ہماری قسمت میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں کی۔ وہ رکیک قہقہوں اور خشمگیں طعنوں سے ہمارا مذاق اڑاتی رہی۔

جب میں خیال بننے میں مگن تھا تو دونوں محافظوں نے میری کوٹھری کا دروازہ کھولا، مجھ پر حملہ کیا اور مجھے ایک بورے میں ٹھونس کر دروازے کی سمت گھسیٹنے لگے۔ میں پیچ و تاب کھا رہا تھا، لاتیں چلا رہا تھا، ان کے الفاظ نے میری چیخوں کا گلا گھونٹ دیا: ''اسے زندہ دفنایا جائے گا— اس سے تم سب اوقات میں رہنا سیکھ لوگے۔''

دوسرے قیدی دہاڑنے اور اپنے اپنے دروازے پیٹنے لگے۔ میں نے بورے میں سے نکلنے

کے لیے، جو کسی نہایت کھردرے کپڑے سے بنا تھا، اپنی تمام تر قوت سے زور آزمائی شروع کردی۔ میرا دماغ اتنا حاضر ضرور تھا کہ میں نے زور زور سے قرآن کی پہلی سورت، یعنی فاتحہ پڑھنی شروع کر دی۔ میں نے اپنی ساری قوت مجتمع کر لی تھی۔ میں نے سورت اتنے چیخ چیخ کر پڑھی کہ باقی سب لوگ خاموش ہو گئے۔ کوریڈور کے آخری سرے پر محافظوں نے بورے کو گھسیٹنا چھوڑ دیا۔ میں نے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھی سے کہتے سنا کہ وہ زیادتی کر رہے ہیں۔

''نہیں، ہم نے وہی کیا جو ہم سے کہا گیا تھا۔''

''لیکن کمانڈنٹ نے تو کہا تھا کہ یہ اپنی قبر خود کھودے گا۔''

''نہیں وہ علامتاً کہا تھا۔ ہمارا کام بس ان کو ڈرانا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔''

''سنو۔ ہمیں اسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، جب تک کہ وہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔''

''ارے احمق، اسی کے لیے تو ہمیں اسے اشتعال دلانا تھا۔''

''نہیں، تم نے بات کو غلط سمجھا ہے۔''

''چلو اس مسئلے کو ہم کمانڈنٹ کے دفتر چل کر حل کریں گے...''

جس وقت یہ دونوں بحث میں الجھے ہوئے تھے، میں زور زور سے قرآن پڑھتا رہا۔ انھوں نے بورے کا منھ کھولا اور مجھے واپس کوٹھری میں پہنچا دیا۔

پھر سے تنہائی میں لوٹ کر میں ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا۔ میں خود پر قابو پانے اور پرسکون ہونے میں ناکام تھا۔ میں ہنستا رہا— ہنستا رہا اور زمین پر پیر پٹختا رہا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کرنے سے وہ مشتعل ہوں گے، اسے دھمکی سمجھیں گے۔

میرے داہنے شانے میں درد ہو رہا تھا۔ میں اپنی جدوجہد کے دوران ضرور کسی پتھر سے ٹکرا گیا ہوگا۔ انھیں، ہم پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ کون سی بات ان کو واپس لوٹنے، کسی اور کو اپنے ساتھ لے جانے، اس کو فرضی سزائے موت دینے اور گڑھے میں پھینکنے سے، یا پھر اسے بے حس و حرکت کر کے اذیت دینے سے روک سکتی تھی؟ آرمی میں سزا کا یہ ایک عام طریقہ ہے کہ ہاتھ پیر باندھ کر ملزم کو گردن تک زمین میں گاڑ دیتے ہیں، اور اسے گرمیوں کی شدید دھوپ یا سردیوں کی بارش میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

شاید ہمارے جیلروں کی ڈائری میں بدسلوکیوں کی کوئی فہرست تھی جنھیں وہ جب چاہے، ہم پر آزما سکتے تھے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہوئی کہ چند دن بعد دونوں محافظوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہنے لگے کہ انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس کے خلاف کوئی بات اپنے دل میں نہ رکھوں۔

''تم جانتے ہو کہ ہم سے غلطی ہوئی۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب کوئی بیمار پڑ جائے یا مر جائے تو ہمیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس سے چھٹکارا پاؤ۔ اس لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ بیمار کبھی نہ پڑنا۔ اگر مر جاؤ گے تو یہ تمھارے اور خدا کے بیچ کا معاملہ ہے۔ جو بھی ہو، بیمار پڑو یا نہ پڑو، یہاں سے کوئی بھی کبھی زندہ واپس نہیں نکلے گا۔ اگر صحت مند رہو گے تو تمھارے لیے بہتر ہی ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھ سے بات کر رہے تھے، لیکن فی الحقیقت ہر ایک کو سنا رہے تھے۔ ہم ابھی تک اس نئے زندان میں بھیجے جانے کے صدمے سے باہر نہیں آئے تھے۔ تب میں نے خود کو درست کیا، اور سوچنے لگا: ''میں زندان میں نہیں ہوں۔ یہاں کوئی بھی قیدی نہیں جو اپنی سزا کاٹنے آیا ہو۔ میں — ہم سب ایک ایسی زمین دوز کوٹھری میں ہیں جس میں سے کوئی بھی کبھی باہر نہیں نکلے گا۔'' مجھے ایک سزا یافتہ فرانسیسی قیدی پاپیلون کی کہانی یاد آئی جو دنیا کے سخت ترین جیل سے نکل بھاگا تھا۔ لیکن میں پاپیلون نہیں ہوں۔ اس آدمی اور اس کی کہانی کے بارے میں سوچنا فضول ہے۔ یہاں ہم سب بغاوت کے جرم میں لائے گئے ہیں — میں باغی ہوں اور باغی رہوں گا۔ ہم ایک نادیدہ دشمن کے ساتھ جنگ آزما ہیں، جو یہاں اس تاریکی میں ہر جگہ موجود ہے۔ کیا میں نے 'دشمن' کہا؟ پھر درست کرتا ہوں: یہاں میرا کوئی دشمن نہیں۔ مجھے خود کو یہ سمجھانا پڑے گا: کوئی جذبہ نہیں، نہ نفرت کا، نہ دشمنی کا۔ میں تن تنہا ہوں۔ اور تنہائی میں خود میں ہی اپنا دشمن ہو سکتا ہوں۔ بس۔ میں اب یہ سب اپنے ذہن سے مٹاتا ہوں اور اس بارے میں سوچنا ترک کرتا ہوں۔

5

یاد رکھنے کا مطلب تھا مرنا۔ مجھے یہ سمجھنے میں تھوڑا وقت لگا کہ یادیں ہی دشمن ہیں۔ ہم میں سے جو کوئی بھی ماضی کو یاد کرے گا وہ مرنے میں وقت نہیں لگائے گا۔ یہ ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی سائنائیڈ چاٹ

لے۔ ہم یہ بات کیسے جانتے کہ یہاں، اس مقام پر، گھر کو یاد کرنا سم قاتل ہے؟ ہم اپنی اپنی قبروں میں تھے، ہمیں ہمیشہ کے لیے زندگی سے اور ہر طرح کی یادوں سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ شاید دیواریں زیادہ موٹی نہیں تھیں۔ چاروں طرف اونچی فصیلوں کے باوجود یادوں کو اندر رِس آنے سے کوئی شے نہیں روک سکتی تھی۔ ماضی کے خواب دیکھنے کا خیال کس قدر ترغیب کن تھا، چلتی پھرتی تصویروں کی ایک قطار جو اکثر گلاب کے رنگ کی ہوتیں، کبھی دھندلی اور کبھی بلوری شفاف۔ زندگی کی طرف لوٹنے کا واہمہ اجاگر کرتی ہوئی یہ تصویریں بے ترتیبی سے یلغار کرتیں۔ جشن و سرور سے معطر، یا کبھی سادہ سی مسرت کی خوشبوؤں میں بسی۔ آہ! صبح کے وقت ٹوسٹ اور کافی کی خوشبو۔ آہ! چادر کی نرمی اور لباس پہن کر تیار ہوتی عورت کے بالوں کی نرمی... آہ! کھیل کے میدان میں بچوں کی چیخ پکار، شام ہونے سے پہلے کے روشن آسمان میں پرندوں کا رقص! اُف! زندگی کی معمولی چیزیں بھی کس قدر پیاری اور قیامت خیز لگنے لگتی ہیں، اگر وہ ہم سے چھین لی جائیں، ہمیشہ کے لیے ہماری رسائی سے دور کر دی جائیں! جاگتی آنکھوں کے یہ سپنے شروعاتی دنوں میں حقیقت سے دور تھے۔ میں زندگی کے سادہ سے حقائق کو بھی جان بوجھ کر دلفریب بنا کر دیکھتا تھا۔ تاریکی میں گھرے ہوئے بھی، اس تاریکی کو متحرک رنگوں میں تبدیل کر لیتا تھا۔ یہ کھیل تھا، میرے خیال میں ایک خیرہ چشم کھیل۔ بہر حال، معمولی سے اشتعال سے ہم اپنی شہادت آسان کر سکتے تھے۔ مجھے اب بھی اس قسم کی جھوٹی تسلیوں کا سہارا چاہیے تھا تاکہ اپنی اس کمزوری کو چھپا سکوں جس نے مجھے عاجز اور ضرر پذیر بنا دیا تھا۔ لیکن میں احمق بن کران کے فریب میں نہیں آیا۔ راستہ طویل تھا، سخت تھا اور پر فریب۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہی تھا کہ ہمیں بالکل ضائع ہونا ہے اور کوئی توقع نہیں رکھنی ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ اس لامختتم رات سے اپنی حفاظت کریں، جو حقیقت میں رات تو نہیں تھی لیکن اس کا ویسا ہی اثر، شباہت، رنگ اور بو باس تھی۔

یہ ہمیں ہمارے ضعف کا احساس کراتی رہتی تھی۔

ناقابلِ شکست، کامل مزاحمت۔ سارے دروازے بند۔ خود کو فولاد میں ڈھالتے ہوئے۔ بھولتے ہوئے۔ ذہن کو ماضی کی ہر یاد سے خالی کرتے ہوئے۔ صفاچٹ۔ ذہن میں کسی خیال کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا ہے۔ کچھ بھی یاد نہ رکھنے کا گُر سیکھنا ہے۔ اس مشین کو کام

کرنے سے کیسے روکیں؟ مکمل طور پر نسیان یا دیوانگی کا شکار ہوئے بغیر آپ بچپن کی اٹاری میں سے کیونکر کسی چیز کا انتخاب کر سکتے ہیں؟ بس اتنا ہی کیا جا سکتا تھا کہ 10 جولائی 1971 سے پہلے کی ہر شے پر، ہر دروازے پر تالا ڈال دیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ یہ دروازے ہمیشہ بند رکھنے ہیں بلکہ نہایت ضروری تھا کہ یہ بھی بھلا دیا جائے کہ ان دروازوں کے پیچھے کیا کیا پوشیدہ ہے۔

اب مجھے اس مہلک دن سے پہلے کی زندگی کو محسوس کرنا چھوڑ دینا تھا۔ اگر کچھ الفاظ یا تصویریں میری رات میں گھس آئیں اور چھپ کر وار کرنے لگیں تو میں انھیں مار بھگاؤں گا، واپس لوٹا دوں گا، کیونکہ اب انھیں کبھی شناخت نہیں کر سکوں گا۔ میں ان سے کہہ دوں گا: ''تم غلط پتے پر آ گئی ہو۔ مجھے ان واہموں سے اب کچھ لینا دینا نہیں۔ میرا اب ان کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اپنے وجود کو ختم کر لیا۔ ہاں، میں یہی کہہ رہا ہوں۔ بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔ میرا اب ان کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں — کم از کم تمھاری دنیا سے۔ پھر بھی میں نے اپنی قوتِ گویائی کو برقرار رکھا ہے، اور مزاحمت کی قوتِ ارادی کو، اور بھولنے کی قوت کو بھی۔ صرف ایک شے ہے جو مجھے نہیں بھولنی ہے، اور وہ ہے میرا نام۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں اس کو وصیت نامے کی طرح اپنے ساتھ رکھوں گا، اس تیرہ و تاریک قبر میں ایک راز کی طرح، جہاں میری شناخت نمبر سات کی ہے۔'' جس وقت ہمیں گرفتار کیا گیا تھا تو میں ساتواں فرد تھا۔ اس کے کچھ اور معنی نہ تھے۔

میرے خواب پلٹتے رہے۔ وہ اکثر مجھ سے ملنے چلے آتے۔ وہ رات کا ایک حصہ میرے ساتھ گزارتے، پھر غائب ہو جاتے، اور میری یادوں کی تہہ میں روزمرہ کی زندگی کا کاٹھ کباڑ چھوڑ جاتے۔ میں آزاد ہونے کے خواب نہیں دیکھتا تھا، نہ قید ہونے سے پہلے کی زندگی کے خواب۔ میں ایک مثالی وقت کے خواب دیکھتا تھا، ایسا وقت جو کسی آسمانی درخت کی شاخوں کے درمیان معلق ہو گیا ہو۔ جب ہم خوفزدہ ہوتے ہیں تو ہمارے باطن میں کوئی بچہ بیدار ہو جاتا ہے، لیکن یہاں مجھ میں ایک مردِ دانا بیدار ہوا تھا اور ایک دیوانہ — جو ایک دوسرے کے جانی دشمن کی طرح خود کو ظاہر کرتے تھے، ان میں سے ہر ایک مجھے مجھ سے دور تر لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ دو انتہاؤں کے درمیان اس جنگ کا میں سکون کے ساتھ مسکراتے ہوئے نظارہ کیا کرتا تھا۔

جب یادیں مجھ پر یلغار کرنے کی دھمکی دیتیں، تو ان کا راستہ روکنے کے لیے میں اپنی ساری قوتیں جمع کر کے انھیں صف آرا کرتا، تا کہ انھیں ختم کر سکوں۔ ان سے نجات پانے کا مجھے کوئی ہنرمندانہ طریقہ ایجاد کرنا تھا۔ ذہن تک ان کی رسائی سے پہلے جسم کو تیار کرو: پہلے شکم کی گہرائی سے اور دانستہ آہستہ آہستہ سانس لو؛ اپنے دھیان کو تنفس پر مرکوز رکھو۔ اب میں تصویروں کے سیلاب کو اندر آنے دیتا ہوں۔ ان کے ارد گرد گھومنے والی ہر شے کو بھگا کر انھیں علیحدہ کر لیتا ہوں۔ پلکیں جھپکاتا رہتا ہوں، حتیٰ کہ یہ تصویریں دھندلی پڑنے لگتی ہیں۔ تب میں ان میں سے کسی ایک تصویر پر ایک طویل عرصے کے لیے نظریں جما دیتا ہوں، حتیٰ کہ وہ اپنے مقام پر منجمد ہو جاتی ہے۔ اب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا، سوائے اس تصویر کے۔ میں گہرے گہرے سانس لیتا ہوں، اور خود سے کہتا ہوں کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ محض ایک تصویر ہے جو بہر حال غائب ہو جائے گی۔ اپنے ذہن میں میں خود کو کوئی اور شخص تصور کر لیتا ہوں۔ میں خود کو قائل کرتا ہوں کہ اس تصویر سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں خود کو بار بار یہ سمجھاتا ہوں: یہ یاد میری یاد نہیں ہے۔ یہ کوئی خطا ہے۔ میرا کوئی ماضی نہیں، اور اسی لیے میرا کوئی حافظہ بھی نہیں۔ میں 10 جولائی 1971 کو پیدا ہوا، اور مر گیا۔ اس تاریخ سے پہلے میں کوئی اور تھا۔ میں اب جو کچھ ہوں، اس کا اُس شخص سے کچھ تعلق نہیں۔ اُس کی تنہائی کے احترام میں، میں اس کی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا۔ مجھے پس منظر میں ہی رہنا چاہیے، اُس شخص سے دور جو پہلے جیا یا اب جی رہا ہے۔

میں اپنے دماغ میں اس بات کو کئی بار دہراتا ہوں، حتیٰ کہ دھیرے دھیرے اس تصویر میں، جس کو میں نے جامد کر لیا ہے، ایک اجنبی کو اپنی جگہ لیتے ہوئے دیکھنے لگتا ہوں۔ اس نوجوان عورت کے پہلو میں جو کبھی میری منگیتر تھی، یہ اجنبی میرا مقام لے لیتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ میری سابق منگیتر ہے۔ ہماری نسبت کب ٹوٹی؟ شاید اُس لمحے جب کوئی اور اس یاد میں در آیا اور اطمینان سے اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اپنی منگیتر سے رابطے کا میرے پاس کوئی راستہ نہیں۔ میں بالکل تنہا ہو چکا ہوں۔ قبر کے باہر کی دنیا سے میں صرف خیالوں میں ہی رابطہ رکھ سکتا ہوں۔ میں اپنی منگیتر سے کس طرح یہ کہوں کہ وہ اب مزید میرا انتظار نہ کرے، اپنی زندگی بنائے اور بچوں کی پرورش کرے، کیونکہ اب میرا کوئی وجود نہیں؟ پھر میں انتہائی بات سوچتا ہوں: اب میری کوئی منگیتر نہیں۔ میری کوئی منگیتر تھی ہی نہیں۔ میری یادوں میں جو عورت ہے، وہ کوئی درانداز ہے۔ وہ میری یادوں میں زبردستی گھس آئی ہے، یا کسی غلطی کے سبب

یہاں آ گئی ہے۔ میں اس سے واقف نہیں۔ اسے میری زندگی کے ساتھ کچھ بھی واسطہ نہیں۔ وہ اور یہ اجنبی جو تصویر میں گھس آیا ہے، میرے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ یہ ایسی تصویر ہے جو کسی روز میں نے کسی عوامی پارک میں چہل قدمی کرتے ہوے اتاری ہوگی۔ کون سا پارک؟ نہیں، یہ بھی نہیں۔ میں ان لوگوں کو کیوں یاد کروں جنھیں میں جانتا ہی نہیں؟

میں ان واضح حقائق پر بار بار سوچتا، حتیٰ کہ تصویر کو پارہ پارہ کر دیتا، حتیٰ کہ دھندلی پڑتے پڑتے وہ فراموشی کی دھند میں غائب ہو جاتی۔ اسی طرح جب بعض دوسری تصویریں ابھرنے کی کوشش کرتیں، میں انھیں ملیامیٹ کر دیتا، یہ تصور کر کے کہ میں نے ان کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ میں سوچتا: ''ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک غلط کا بک میں آ گئی ہیں، اور غلط آدمی کے پاس۔ سیدھی سی بات ہے: میں ان کو نہیں پہچانتا، اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔'' اگر وہ پھر بھی نہ جاتیں، اور میرے ذہن سے چپکے رہنے پر مصر ہوتیں تو میں اپنے سر سے دیوار میں ٹکریں مارتا، حتیٰ کہ مجھے تارے نظر آنے لگتے۔ خود کو زخمی کر کے میں سب کچھ بھول جاتا۔ پیشانی پر ضربوں کا فائدہ یہ تھا کہ اس سے وہ تصویریں پاش پاش ہو جاتیں جو میرا تعاقب کرتی اور ان فصیلوں سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتی تھیں — ہمارے اس خفیہ مقبرے سے باہر جانے کی ترغیب۔

اس طرح ٹکریں مارنے کے سبب میرے سر میں ورم رہنے لگا تھا، لیکن وہ سبک بھی ہو گیا تھا، کیونکہ اتنی ساری یادوں کے بوجھ سے خالی ہو چکا تھا۔

کوٹھری ہی میرا مقبرہ تھی۔ ایک ایسا گڑھا جو اس لیے تیار کیا گیا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ ہمارے جسموں کو نگل لے۔ انھوں نے ہر پہلو پر غور کیا تھا۔ میں اب سمجھا کہ شروع کے چند برسوں میں انھوں نے ہمیں قنیطرہ کے عام زندان میں کیوں رکھا تھا۔ عام — یعنی ایسا زندان جس سے ایک نہ ایک دن آپ رہا ہو جاتے ہیں، اپنی سزا کاٹنے کے بعد۔ ایسی کوٹھریاں جن میں سے آپ آسمان دیکھ سکتے ہیں، اس روزن کے سبب جو اس کی دیوار میں اونچائی پر بنا ہوتا ہے۔ ایسا زندان جس میں کسرت کرنے کے لیے صحن ہوتا ہے، جہاں قیدی آپس میں ملتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، منصوبے تک باندھتے ہیں۔ قنیطرہ کی جیل مشکلات کے لیے، اس کے محافظوں کے ہاتھوں سختیوں کے لیے بدنام ہے۔ اس جیل

میں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ لیکن جب تازمامرت سے میرا سابقہ پڑا تو قنیطرہ اپنی بدنامی کے باوجود مجھے کافی حد تک انسانی زندان لگنے لگا۔ وہاں سورج کی روشنی تھی، اور امید کی کرن بھی۔

دس سال۔ ہمیں دس سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ ہم سازش کے سرغنے نہ تھے، محض جونیئر افسر تھے جو احکام بجالائے تھے۔ لیکن جتنے عرصے تک اِن گڑھوں کو موت کے کنویں میں بدلا جا رہا تھا، جب انجینئر اور ڈاکٹر ان امکانات کا مطالعہ کر رہے تھے جن سے اذیت کو دیرپا بنایا جا سکے، اور موت کو تادیر موخر رکھا جا سکے، ہمیں قنیطرہ میں رکھا گیا — جو ایک خوفناک لیکن عام زندان تھا۔ جب ہمیں منتقل کیا جا رہا تھا، رات میں، آنکھوں پر پٹی باندھ کر، تو ہم محض یہ توقع کر رہے تھے کہ پشت کی جانب سے ہمارے سروں کو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ نہیں، ہم ایسے خوش قسمت کہاں تھے؟ موت یقینی ضرور تھی، لیکن فوری نہیں۔ ہمیں برداشت کرنا تھا — لحظہ بہ لحظہ — ہر طرح کی جسمانی ایذاؤں کو، ان تمام ذہنی اذیتوں کو جو وہ ہمیں پہنچا سکتے تھے۔ آہ! فوری موت بھی کیا خوب نجات لاتی ہے! ہارٹ اٹیک! شہ رگ کا پھٹنا! مہلک ہیمرج! گہرا کوما! میں اسی قسم کے کسی فوری خاتمے کی تمنا کیا کرتا۔ میں نے خدا کے بارے میں ازسرِنو غور کیا، اور خودکشی کے بارے میں قرآن میں جو کچھ آیا ہے، اس پر بھی: سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی زحمت سے نفرت نہ کرو جو شاید رحمت بن جائے۔ جو کوئی اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کرے گا، جہنم میں ڈالا جائے گا، اور ابد تک اسی طریقے سے مرتا رہے گا جس سے اس نے خود کو مارا تھا۔ پھانسی پر لٹکنے والا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود کو لٹکاتا رہے گا۔ جو کوئی جل کر مرنے کا فیصلہ کرے گا، وہ ابد تک شعلوں میں گھرا رہے گا۔ جو کوئی دریا میں کود کر مرے گا، وہ بار بار ڈوبتا رہے گا...

اگست 1973 کی ایک گرم رات تھی۔ مجھے نیند آنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس سے میں پریشان تھا۔ خوف کا ایک مبہم سا احساس مجھ پر حاوی تھا۔ میں نے کچھ دعائیں پڑھیں اور پاؤں پھیلا کر بائیں کروٹ سے لیٹ گیا تاکہ دل کی دھڑکنیں مزید سنائی نہ دیں۔ رات کے کوئی تین بجے کے قریب میں نے اپنی کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ تین لوگ اندر آئے۔ ایک نے مجھے ہتھکڑی لگائی، دوسرے نے میری آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹی باندھی، اور تیسرے نے میری تلاشی لی، اور گھڑی اور تھوڑی سی رقم جو میرے پاس تھی، اپنے قبضے میں لے لی۔ اس نے مجھے دھکیل کر راہداری میں پہنچا دیا، جہاں میں نے دوسرے لوگوں کی

چیخیں سنیں جن کے ساتھ یہی سلوک کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے ہمیں صحن میں جمع کر دیا تھا۔ ٹرکوں کے انجن چالو تھے۔ انھوں نے پکار کر سب کی حاضری لی۔ نام اور نمبر شمار پکارے جانے پر ہر ایک کو آگے آنا تھا۔ ایک سپاہی نے مجھے ٹرک کی پشت پر لگی چھوٹی سی سیڑھی پر دھکیل دیا۔ بعض لوگوں نے احتجاج کیا۔ خاموشی ان کا واحد جواب تھی۔ چند ہی منٹ میں ہم سب لوگ بند ٹرکوں پر سوار تھے، کسی انجان منزل کی طرف گامزن۔ شاید مرنے کے لیے۔ غالباً سب کچھ ختم ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ہتھکڑیاں پہنے، آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے۔ مختصر سماعت کے بعد سزائے موت کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ ہم سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ میرے برابر میں ایک آدمی نے دعائیں پڑھنی شروع کیں، اور موت سے پہلے پڑھا جانے والا کلمۂ ایمان تک پڑھ ڈالا: ''لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ۔'' وہ جلدی جلدی دہراتا گیا، یہاں تک کہ الفاظ سمجھ سے باہر ہو گئے — اب لفظ ادا نہیں کیے جا رہے تھے بلکہ بدبدائے جا رہے تھے۔ ہمیں سبزی کے ٹوکروں کی مانند جھٹکے لگ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ٹرک اب پکی سڑک پر نہیں چل رہا تھا۔ فوج کے سپاہی یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان کی نقل و حرکت پر دھیان دے یا ان کے ارادوں کے بارے میں اندازے لگائے۔ سفر اتنا طویل تھا کہ میں نے وقت کا حساب رکھنے کی کوشش ترک کر دی۔ ایک بار تو یہ لگنے لگا کہ ٹرک ایک بہت بڑے دائرے میں چکر کاٹے جا رہے ہیں۔ تاریکی میں تصویریں سفید سی ابھر رہی تھیں، جو ایک کے پیچھے ایک تواتر سے شعلوں جیسی تیزی سے لپکتی جا رہی تھیں۔ ہر شے میرے ذہن کے اسکرین پر پھر سے چمک اٹھی تھی: صحیفراات کی ناقابلِ برداشت گرمی، دھوپ سے خشک ہوتا ہوا خون، کمرۂ عدالت کا خاکستری رنگ، قنیطرہ کے زندان میں ہماری آمد، اور سب سے بڑھ کر میری ماں کا چہرہ جسے میں نے دو برس سے زیادہ عرصے سے نہیں دیکھا تھا، لیکن جو کبھی کبھی خواب میں نظر آ جاتا تھا۔

بے شک، دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ انجان منزل کی طرف یہ ہمارا آخری سفر ہے۔ لیکن تعجب کی بات تھی کہ میں خوفزدہ نہیں تھا۔ میں نے یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ہم کہاں ہیں۔ کیا فوج اٹھاون افراد کو ٹھکانے لگا دے گی، ان سب کو اجتماعی قبر میں دفن کر دے گی؟ کون ہمارے دفاع میں اٹھے گا اور انصاف مانگے گا؟ ہمارا معاملہ غیر معمولی تھا۔ ہر بات ممکن تھی۔ بہتر تھا کہ ہم اندازے لگانا ترک کر دیں۔ ٹرک دائروں میں گھومتے رہے۔ انجن کے شور سے اندازہ ہوا کہ ہم بلندی

پر چڑھ رہے ہیں — شاید ہم کسی پہاڑ پر تھے۔ گرمی بڑی شدید تھی۔ ہوا میں سانس لینا مشکل تھا۔ ہمارے دم گھٹے جا رہے تھے۔ ترپال بہت موٹی تھی، اور اس میں دھول کا گزر تو ہو رہا تھا لیکن ہوا کا نہیں۔ مجھے بہت پیاس لگی تھی۔ ہم سبھی کو۔ ہم پانی کے لیے بار بار چیختے رہے، اس پر ڈرائیور کی بغل میں بیٹھا ہوا این سی او دہاڑا، ''اپنے غلیظ منھ بند رکھو، ورنہ ان پر ٹیپ چپکا دوں گا!'' ہم رات ہی میں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اب ہوا ٹھنڈی ہو چکی تھی، ہوا میں وہی تازگی تھی جس کے بعد دن کی گھٹن بھری تمازت شروع ہو جاتی ہے۔ ہمیں آوازیں سنائی دے رہی تھیں، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ضرور دوسرے سپاہی ڈیوٹی پر آ رہے تھے۔ ہمیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ بلاک اے کی جیل میں کئی نان کمیشنڈ افسر تھے۔ مجھے بلاک بی کی جیل میں بھیجنا طے کیا گیا تھا۔ ہماری آنکھوں پر اب بھی پٹیاں تھیں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں جنھیں محافظوں نے دوسرے دن تک نہیں کھولا۔

افسوس کہ جب انھوں نے میری پٹی کھولی تو میں نے جہاں بھی نظر ڈالی، ہر طرف سیاہی تھی۔ مجھے لگا میں اندھا ہو گیا ہوں۔ ہم ایسے تہہ خانے کی کال کوٹھری میں تھے جس کو ابدی تاریکی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

6

عقیدہ خوف کا نام نہیں، میں نے خود کو سمجھایا۔ خودکشی کوئی حل نہیں۔ عقوبت محض ایک امتحان ہے۔ مزاحمت کرنا فرض ہے، کسی پر احسان نہیں۔ اپنے انسانی وقار کو قائم رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔ بس اتنا ہی: بس وقار ہی ہے جو میرے — ہمارے — پاس بچا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وقار کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنی ہے۔ یہی میرا مشن ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا رہوں، انسان بنا رہوں؛ کبھی ذلیل، گندا چیتھڑا، کوئی خطا بن کر نہ رہ جاؤں۔ میں ان کو کبھی ملامت نہ کروں گا جو اپنی افتاد برداشت نہیں کر سکتے، جو تشدد کے آگے ٹوٹ جاتے ہیں اور خود کو مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے سیکھ لیا ہے کہ لوگوں کا کبھی احتساب نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے کا مجھے کون سا اختیار ہے؟ میں تو

محض ایک آدمی ہوں، دوسروں کی طرح جس کے پاس محض اتنی ہی قوتِ ارادی ہے کہ اسے سرِ تسلیم خم نہیں کرنا ہے۔ بس اتنا ہی۔ ایسا ارادہ جو مستحکم ہے، بے رحم ہے، مفاہمت نہیں جانتا۔ یہ کہاں سے آیا؟ ماضی میں بہت دور سے۔ بچپن سے۔ میری ماں سے، جن کو میں نے ہم سب بہن بھائیوں کی پرورش کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے دیکھا تھا۔ جنھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ جو ایک لمحے کے لیے بھی کمزور نہیں پڑیں۔ میری ماں نے ہمارے باپ پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا تھا، جو شکم پرست تھا، غرور و انانیت کا عفریت، فیشن اور خودنمائی کا مارا ہوا ایسا شخص جو یہ تک بھول چکا تھا کہ اس کا کوئی گھر بار بھی ہے۔ وہ اپنا سارا سرمایہ درزیوں پر خرچ کرتے جو اس کے لیے ہر ہفتے سلک کا نیا جلابہ* تیار کرتے تھے۔ اپنے لیے وہ قمیصیں انگلینڈ سے، پاپوش شہرِ فاس سے، خوشبوئیں پیرس یا سعودی عرب سے منگواتا، اور الکلاوی خاندان کے محلوں میں رعونت سے اکڑ کر چلتا تھا۔ جبکہ میری ماں پسینہ بہاتی، اور ہفتے کے ساتوں دن کام کرتی تھی تاکہ ہمیں کسی چیز کی کمی نہ رہے۔ ہماری بنیادی ضرورتیں بھی بمشکل پوری ہو پاتی تھیں۔ اس کا سب سے چھوٹا لاڈلا ہی ہم سب میں ایسا تھا جس کو وہ 'میرا امیمنا' کہہ کر بلاتی تھی، جس کی ناز برداری کرتی تھی۔ اپنے ننھے شہزادے کے سامنے میری ماں کی ساری سختی پگھل جاتی۔ وہ ایک ذہین اور بے شمار خواہشیں رکھنے والا غیر معمولی بچہ تھا۔ وہ جو بھی مانگتا اسے دینے سے انکار نہ کیا جاتا، یہاں تک کہ اس کی پندرھویں سالگرہ پر اسے موپڈ تک دی گئی۔ اور پھر وہ دن آیا جب شام کے ناشتے کی میز پر قہقہوں کے درمیان اس نے یہ اقرار کیا: ''ماما، میں عورتوں سے زیادہ مردوں کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے اپنے ادب کے استاد روجر سے محبت ہے!'' اوہ، وہ ننھا شہزادہ! ہم سب اس کے دیوانے تھے، شاید اس لیے کہ ماں اس کی پرستار تھی، اور ہم اس کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتے تھے، یا اس بچے میں مسرت پانے کے اس کے رویے کو چیلنج کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کے حسن اور غیر معمولی بشاشت پر فدا تھی۔ جس دن اس نے ہمارے باپ کو گھر سے نکالا، تو ہم سب کو جمع کیا اور تنبیہ کی تھی: ''اس گھر میں کوئی حرام ہڈ کاہل نہیں رہ سکتا، اور نہ کلاس میں پچھڑا ہوا احمق۔ آج کے بعد میں ہی تمھاری ماں ہوں، اور میں ہی تمھارا باپ!''

جب ہمارے باپ نے ماں سے شادی کی تھی، وہ مراکش کے مدینے* میں جوہری تھا۔ اس نے یہ دوکان اپنے ماموں سے وراثت میں پائی تھی جس کے پاس اپنی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ اسی کو اپنا بیٹا مانتا تھا۔ میرا باپ اپنا سارا وقت عرب کے عظیم شاعروں کی تخلیقات پڑھنے اور از بر کرنے میں صرف

کرتا تھا، اور خوبصورت عورتوں کو مسحور کرنے کے لیے تبھی دم لیتا تھا جب وہ اس کی دکان کے نمائشی روزن پر سجے زیورات کو پر شوق نظروں سے دیکھنے کے لیے ٹھہرتی تھیں۔ وہ عورتوں کو پھسلانے کے شوق اور خراب بزنس سینس کے لیے مشہور تھا۔ بہر حال، اس نے طے کیا تھا کہ وہ فاس کی دانشگاہ، جامعہ القرویین میں ادب پڑھایا کرے گا۔ البتہ جب ان کے باپ کو پاشا الکلاوی کے دربار میں بلایا گیا تو اس نے دکان بند کی اور اس کے پیچھے پیچھے محل جا پہنچا جہاں وہ پاشا کے بچوں اور پوتوں کو عربی پڑھانے لگا۔

یہ سب 1950 کے عشرے کے اوائل کی باتیں ہیں۔ پاشا فرانسیسیوں کا دوست تھا جن کے ساتھ وہ اشتراک رکھتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح جس کا دعویٰ تھا کہ وہ سیاست میں کبھی دخل نہیں دیتا، میرے باپ نے بھی یہی ظاہر کیا ہوگا کہ قوم پرست حلقے میں کیا کیا باتیں ہوتی ہیں، اسے کچھ معلوم نہیں۔

میرا باپ، جس سے میں بمشکل واقف تھا، دراصل شاعر تھا اور شاعروں کا دوست۔ زیبائی اور خودنمائی کا شوقین۔ مقتدر لوگوں کی رفاقت کے لیے مرتا اور انھیں ہنسانے میں مسرت پاتا تھا۔ اسے اپنے اہل و عیال کا کوئی خیال نہ تھا اور اپنے ڈھیروں بچوں کے لیے کوئی ذمے داری محسوس نہیں کرتا تھا۔ 1960 کے عشرے کے اواخر تک اپنے غیر معمولی حافظے، شوخ طبعی، جو کبھی ان سے جدا نہ ہوتی تھی، نیز اپنی روایتی تعلیم کے سبب (وہ بن براہیم* کے ہزاروں اشعار بلا غلطی سنا سکتا تھا)، وہ سلطان کے دربار میں پہلے مسخرہ اور پھر مصاحب بن گیا۔ میں فوج میں ملازم ہو چکا تھا جب ایک دن میرے ایک بھائی نے یہ خبر دی: ''سلطان ہمارے باپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ وہ گہرے دوست بن چکے ہیں۔ اب ہم انھیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ ہمہ وقت محل میں ہی رہتے ہیں۔ جب سلطان سفر پر نکلتا ہے تو اس وقت بھی انھیں ساتھ لے جاتا ہے۔''

تو مراکش کا یہ بانکا چھیلا، ڈون جوان قسم کا عورت باز، متداول شاعری کا جیتا جاگتا حافظہ، ایسا شخص جس کی وجہ سے میری ماں کو سخت اذیتیں پہنچیں، جو صرف اپنی لذت کوشی کے بارے میں سوچتا تھا، جو مدینہ کا جوہری تھا، جو پاشا الکلاوی کے دربار پر مرتا تھا، ایسا آدمی جس کے بچے اگر راہ چلتے سڑک پر اس سے ٹکرا جائیں تو وہ اپنی اولاد کو پہچان تک نہ سکے، وہ شخص جو 'عالم' اور 'استاذ' کہلاتا تھا، فی الحقیقت

محض ایک درباری مسخرہ تھا۔ جہاں تک میری ماں کا تعلق ہے، یہ شخص اس کی نظروں میں اپنا وجود کھو چکا تھا۔ ماں نے یوں جینے کا فیصلہ کرلیا تھا جیسے وہ مر چکا ہو۔ وہ اس کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتی تھی۔ اور ہمیں بھی ہدایت تھی کہ ہم اپنے غائب باپ کا کبھی ذکر نہ کریں، اس شخص کا جسے اپنے جلابے اور پاپوش کا رنگ میچ کرنے کی فکر اپنے چھوٹے بیٹے کی اسکول میں بے قاعدہ حاضریوں سے زیادہ تھی۔

سلطان کی خدمت میں مصروف۔ اس کے قدموں میں پڑا ہوا۔ اس کی ہر آواز پر لبیک کہتا۔ اس کے سونے سے پہلے خود کبھی نہ سوتا۔ اسے قصے سناتا، جب وہ بددل ہوتا تو اسے خوش کرتا۔ موقع محل کی مناسبت سے الفاظ تلاش کیا کرتا۔ وہ اپنے لیے جینا ترک کر چکا تھا۔ ہمیشہ سلطان کے مزاج کے رحم وکرم پر رہتا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہروقت مسخرہ پن دکھایا کرتا۔

اپنی ملازمت کے مضحک پہلو کے باوجود وہ سلطان کے نزدیک رہ کر اہم کردار نبھا رہا تھا۔ شاہی مصاحبوں میں سے بعض میرے باپ کے پاس آکر اپنے دکھڑے روتے تاکہ جب آقا سننے کو آمادہ لگے تو وہ کہہ سنائے۔ لوگ شاہ کے مزاج کا احوال جاننے کے لیے میرے باپ سے ہی رجوع کرتے۔ میرا باپ کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ انھیں مژدہ سناتا: ''عالی جاہ کا مزاج مبارک آج شگفتہ ہے۔''

درباری مسخرہ ہونے پر اسے خاصا فخر بھی رہا ہوگا۔ وہ اپنے طویل کریئر کی پرشکوہ بلندی پر تھا اور ایک اور خواب تکمیل میں سرگرداں: کہ سلطان کے لیے وہ ایسا ہی ہوجائے جیسا کہ اس کا اپنا باپ پاشا الکلاوی کے لیے تھا۔ میں اپنے باپ کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ 10 جولائی 1971 کو، اس نے یہ بات یاد رکھی کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔ وہ بھی اس جشن سالگرہ کے مہمانوں میں شامل تھا جو صخیرات کے محل میں جاری تھا اور جس میں معزز لوگوں، سفارتکاروں اور سرکاری افسروں کو تہِ تیغ ہونا تھا، مشین گنوں سے ڈھیر ہونا تھا — نوجوان کیڈٹوں کے ایک پورے دستے کے ہاتھوں۔ میں نے اپنا ہتھیار نہیں چلایا تھا۔ میں اس وقت صدمے میں تھا۔ ہم سبھی پاگل ہو چکے تھے: سخت بیزار، نالاں اور شکست خوردہ، شاید مردہ، گو کہ ہم تب تک یہ جانتے نہ تھے۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میں اسی لمحہ مردے میں تبدیل ہو چکا تھا جب موسمِ گرما کے محل میں داخل ہوا تھا۔ میں مر چکا تھا اور مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ میرے اردگرد ہر شے چکرا رہی تھی: لوگ باگ، میزیں، بندوقیں، سوئمنگ پول کا خون آلود پانی، صبح کے آسمان کے ستارے،

اور سب سے بڑھ کر سورج، جو بے تکان ہمارا تعاقب کرتا ہوا چلا آرہا تھا۔

چند دن کے بعد جب میرے باپ کو پتا چلا کہ میں بھی حملہ آوروں میں شامل تھا تو اپنی شرمندگی ظاہر کرنے کے لیے اس نے ناخنوں سے اپنے گال کھرچ ڈالے، خود کو سلطان کے قدموں میں گرا دیا، اور رو رو کر اس سے لپٹ گیا۔ جب سلطان نے اٹھنے میں مدد دینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میرے باپ نے ان الفاظ کے ساتھ مجھے عاق کر دیا:

''اللہ نے مجھے ایک بیٹا دیا تھا، ستائیس سال پہلے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ آج اسے واپس لے لے۔ اسے بلا لے اور دوزخ میں جھونک دے۔ اللہ کے نام پر، جو قادرِ مطلق ہے، اپنی روح اور ضمیر کے ساتھ، اپنی تمام متانت و استقلال کے ساتھ، میں اپنے اس نامعقول بیٹے سے دست کش ہوتا ہوں، میں اسے عوامی مذمت کے لیے چھوڑتا ہوں، ابدی نابودی کے حوالے کرتا ہوں، میں اسے اپنی ولدیت سے محروم کرتا ہوں، میں اسے غلاظت کے نالے میں پھینکتا ہوں، تاکہ چوہے اور پاگل کتے اس کے دل کو، اس کی آنکھوں کو، اس کے جگر کو چاک کر ڈالیں، اس کو پھاڑ ڈالیں، اور ابدی گمنامی کے دریا میں غرق کر دیں۔ اللہ میرا گواہ ہے، اور جہاں پناہ، آپ میرے شاہد ہیں، میں آپ کے سامنے بار بار کہہ رہا ہوں: یہ لڑکا اب میرا بیٹا نہیں۔ اس کا کبھی وجود نہیں تھا۔ عالی جاہ، مجھے بھی گمنامی کے نالے میں پھنکوا دیجیے، کیونکہ اس بے حرمتی سے میں بھی آلودہ ہو چکا، اور اب آپ کا خدمتگار، آپ کا غلام ہونے کا مجاز نہیں رہا۔ مجھے نکال دیجیے، صرف ایک بار کہیے، آپ اِس چہرے کو پھر کبھی نہ دیکھیں گے جو آپ کا سامنے سر اٹھانے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ یہ چہرہ اپنا سارا رنگ اور ساری شناخت کھو چکا، اور مجسم شرمندگی بن چکا۔ میری نظروں میں یہ بے وقعت بیٹا مر چکا۔ اسے دوبارہ زندگی دی جائے تاکہ اذیتیں برداشت کرے، اپنے آخری سانس تک اس ناقابلِ بیان گناہ کا کفارہ ادا کرے جو اس نے شاہِ والا تبار کے تئیں کیا ہے، اللہ اور اس کے منکسر بندے کے تئیں کیا ہے۔ میں اسے عاق کرتا ہوں، عاق کرتا ہوں، عاق کرتا ہوں! میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں، لعنت بھیجتا ہوں، لعنت بھیجتا ہوں! یا اللہ! میں کیونکر آپ سے معافی مانگوں؟ اے عالی جاہ، میں کیونکر آپ سے مدد طلب کروں؟ اس شخص کو معاف نہ کرنے کا مطالبہ کروں جس نے اللہ کو دھوکا دیا، جس نے وطن کو مجروح کیا اور جس میں ایسی جسارت تھی۔ ناقابلِ تصور احمق پن تھا، کہ آپ کی جان لینے کی کوشش کرے، ایسے شخص کی جان جو عرش کی مانند نجیب، نیک

نہاد اور ارفع ہے! اس نے آپ پر حملہ کیا، آپ جو کہ مومنین کے کمانڈنٹ ہیں؛ آپ پر، جو آلِ پیغمبر میں سے ہیں! عالی جاہ! میں کس طرح آپ سے زندگی کی بھیک مانگوں، کیسے کہوں کہ میں کبھی اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھا سکوں گا، وہ نظریں جو میری اپنی اولاد کے گناہ سے، اس کی ذلت سے، اس کی غداری سے مجروح ہو چکیں۔ اے میرے آقا! اے بندہ پرور! جہاں پناہ! آپ کا پابند یہ غلام، خود کو آپ کے حوالے کرتا ہے۔ عالی جاہ کے دل میں جیسا آوے اس غلام کے ساتھ سلوک کریں۔ میں آپ کا ہوں۔ میرا کوئی گھر بار نہیں، میری کوئی آل اولاد نہیں۔ میں عالی جاہ کے قدموں میں پڑا ہوں!''

سلطان نے دھیمی آواز میں کوئی حکم سنایا اور غائب ہو گیا، میرے باپ کو بولایا ہوا چھوڑ کر، جو انتہائی عاجزی کی مورت بنا اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اکڑوں بیٹھا تھا۔

مجھے نہیں لگتا کہ سلطان کچھ اور سننے کی حالت میں تھا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ اس نے میرے باپ سے کہا تھا کہ اس دن کے بعد وہ رات کو بھی اس کے ساتھ رہا کرے اور نیند آنے تک اسے بن براہیم کی شاعری سنایا کرے۔ وہ عموماً علی الصباح کہیں جا کر سوتا تھا، چار اور پانچ بجے کے درمیان۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ اس کا آقا دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں جا رہا ہے، میرا باپ وہاں سے اٹھتا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا خاموشی سے خوابگاہ سے باہر آ جاتا تھا۔

مجھے یہ سب باتیں جیل سے رہائی کے چند مہینوں بعد پتا چلیں۔

آج میں خود سے وہ سوال پوچھتا ہوں جس نے اٹھارہ سال تک میرا تعاقب کیا، گو کہ میں نے اسے الفاظ میں ڈھالنے کی ہمت کبھی نہیں کی تھی، اس خوف سے کہ پاگل ہو جاؤں گا یا مہلک ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاؤں گا، جس سے ہم میں سے بعض لوگ متاثر ہوئے اور جس کی وجہ سے انھیں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ سوال مجھے اب خوفزدہ نہیں کرتا۔ بلکہ فضول لگتا ہے، البتہ غیر دلچسپ نہیں: جب میں دوسرے کیڈٹوں کے ساتھ گرما محل میں داخل ہوا تو میں کسے قتل کرنے کی سعی کر رہا تھا — سلطان کو یا اپنے باپ کو؟

7

واپس گڑھے میں۔ مکمل تاریکی۔ چھت میں کھلے روزن تک پر ڈھال لگی ہے؛ اس میں سے ہوا تو داخل ہو سکتی ہے، لیکن ہم دن کی روشنی نہیں دیکھ سکتے۔

کریم کا نمبر پندرہ تھا۔ وہ ایک پستہ قد، موٹا آدمی تھا، الحاجب کا باشندہ۔ بہت سے سپاہی، نان کمیشنڈ اور افسر بھی اسی علاقے کے تھے۔ کریم کے خاندان میں باپ سے لے کر بیٹے تک سب لوگ فوج میں تھے۔ اس کے پاس کوئی اور متبادل نہ تھا۔ اس کے سب بھائی معمولی سپاہی تھے، جبکہ وہ خود افسر بننا چاہتا تھا۔ جب وہ الحاجب کے کیمپ میں زیرِ تربیت تھا تو اہر میمو اسکول جانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

وہ کم سخن تھا، مسکراتا اور بھی کم تھا، البتہ اس پر ایک ہی دھن سوار ہو گئی: وقت کا حساب رکھنے کی دھن۔ وہ ایک منٹ کے اندر یہ بتا سکتا تھا کہ اس وقت کیا بجا ہے، دن ہے یا رات۔ چنانچہ وہ ہمارا کیلنڈر، ہماری گھڑی، اور اس زندگی کے ساتھ ہمارا رابطہ کار بننے کے لیے نہایت موزوں تھا جو ہم اپنے پیچھے — یا اپنے سروں پر چھوڑ آئے تھے۔ اسے یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ اگر اس نے ہم میں سے کسی کے ساتھ گفتگو شروع کر دی، تو وقت کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ بعض لوگ اس کا امتحان لے کر محظوظ ہوتے تھے: ''اس وقت کیا بجا ہے؟'' اور خصوصاً یہ: ''آج کس مہینے کی کون سی تاریخ ہے؟''

جیسے کوئی بٹن دبا دیا جائے، بولتی گھڑی شروع ہو جاتی تھی: ''یہ 1975 کا سال ہے، 14 مئی ہے، صبح کے نو بج کر چھتیس منٹ ہوئے ہیں۔''

میں نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اسے بلاوجہ پریشان کرنا چھوڑ دیں۔ وہ وقت کا اعلان دن میں تین مرتبہ کیا کرے، صرف اس وجہ سے کہ ہم اپنے ذہنوں کو اس بلیک ہول پر مرکوز رکھ سکیں اور وقت پر غالب ہونے کے وہم میں مبتلا رہیں۔

اس سے کریم کو ایک مستقل اور کل وقتی کام مل گیا۔ ہمارے لیے کریم ہی 'وقت' تھا، ایک ایسی اذیت کے بغیر جو کسی ایسے واہمے کے تعاقب کے سبب پیدا ہو سکتی ہے جس کو منٹوں، گھنٹوں اور دنوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو... وہ پرسکون تھا، اور متین۔ مرورِ ایام کا پاسبان ہونے کی وجہ سے چلو اسے یہ محسوس کرنے دیں کہ اس کا ہمارے گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک سادہ مزاج انسان تھا، غرور سے پاک۔

سایوں کے درمیان بھی اس نے اپنے لیے ایک مقام بنالیا تھا۔ اس کی صوابدید اور پابندیِ وقت نے ہمیں متاثر کرلیا۔ اس نے ہمارے حالات کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ خود گھڑی اور کیلنڈر بن چکا تھا، اور دنیا کی کوئی شے اسے اپنے اس عہدے سے دست کش ہونے کے لیے آمادہ نہیں کرسکتی تھی۔ بقا کا یہ اس کا اپنا طریقہ تھا: خود میں سمٹ کر، وقت کی ایک ایسی رو کی پاسبانی کا بار لے کر، جو ہم پر ممنوع ہو چکا تھا۔ کیسی ستم ظریفی تھی کہ وقت کا غلام بننے ہی نے اسے آزاد کیا۔ وہ رسائی سے دور ہو چکا تھا، کاملاً اپنے ہی حباب کے اندر بند، ہر ایسی شے کے بوجھ سے آزاد جس سے اس کی توجہ اُچٹتی اور احتسابِ وقت کے کام میں رخنہ ڈالتی۔ وہ ایک روش کا پابند ہونے پر مجبور کردیا گیا۔ یہی اس کا مشن تھا، یہی اس کا حیات بخشندہ۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ خود کو محفوظ رکھنے کی جبلی خواہش میری بقا میں میری کوئی مدد نہ کرسکے گی۔ ایسی جبلت جو جانوروں اور انسانوں میں یکساں طور پر موجود ہوتی ہے، درہم برہم ہو چکی تھی۔ کوئی اس بھٹ میں کیونکر زندہ رہ سکتا ہے؟ ایسے بدن کو روشنی میں گھسیٹ لانے کی فکر کیوں کروں جو ٹوٹ چکا، مسخ ہو چکا ہے؟ ہمیں ایسے حالات میں رکھا گیا تھا جو ہماری اس جبلت کو مستقبل کے اندازے لگانے سے روکنے کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ وقت کی معنویت صرف جانداروں اور اشیا کے تحرک میں ہی ہے، جبکہ یہاں ہمیں مادی دنیا کے عدمِ تحرک اور تسلسل تک محدود کردیا گیا تھا۔ ہم ایک ایسے زمانۂ حال میں تھے جو بے حرکت تھا۔ جو بھی بدنصیب ذی روح پیچھے مڑ کر دیکھتا، یا مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کرتا تھا، سر کے بل موت کے غار میں جا گرتا تھا۔ زمانۂ حال نے صرف اپنی ہی تہیں کھولنے کی گنجائش چھوڑی تھی۔ ہمارے لیے ضروری تھا کہ ناقابلِ تغیر لمحے تک محدود رہیں اور حال کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچیں۔ حقیقت کا یہ ایسا ادراک تھا جس نے بلاشبہ میری زندگی کو بچالیا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جھاڑو جیسی معمولی شے بھی ہمارے کام کی ثابت ہوسکتی ہے۔ محافظوں نے ہمارے بھٹوں میں داخل ہو کر صفائی کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اپنی اپنی کوٹھری کی صفائی ہم لوگ باری باری سے خود کرتے تھے۔ محافظ کسی ایک کوٹھری کا دروازہ کھولتے اور چلے جاتے۔ ان کا

کہنا تھا کہ ہمارے جراثیم سے وہ خود کو آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم گندے تھے، شیو نہیں کرتے تھے، اور ہمارے زندان اتنے غلیظ رکھے گئے تھے کہ ہر طرح کی بیماریوں کے لیے سازگار ہو گئے تھے۔ ایک بار جب نمبر بیس، الحسین، صفائی میں مصروف تھا تو اس نے ایسی چیخ ماری جو ہمیں مسرت بھری لگی۔ وہ بات کرنے کے لیے میری کوٹھری تک چلا آیا۔

''سنو، جھاڑو کے دستے میں لوہے کا پترا لگا ہوا ہے۔''

''تو کیا؟ کیا تم اسی خوشی میں چیخ رہے ہو؟''

''لیکن یہ دھات ہے! اگر میں اسے نکال لوں تو ہم اس سے چاقو بنا سکتے ہیں، پھر ریزر بھی...''

اس طرح یوں ہوا کہ اگلے دس دن تک میں اور الحسین دھات کی اس پتری پر کام کرنے میں مصروف رہے، باری باری سے۔ ہم نے اسے چپٹا کیا اور ایک سخت پتھر پر گھس گھس کر تیز کیا، حتیٰ کہ وہ باریک اور دھاردار ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے طے کیا کہ اب ہم باری باری سے اپنے بال کاٹیں گے۔ بعض نے اپنی ڈاڑھیاں بھی صاف کیں۔ اسی دوران انیس نمبر، عبداللہ نے ایک اور جھاڑو میں سے پترا کھسکا لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ''سوکھا مونڈا جانا'' محاورہ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے کوئی بڑا دھوکا ملا ہو۔ لیکن ہمارے معاملے میں یہ کوئی صنعتِ لفظی نہیں تھی۔ میں نے بغیر صابن کے، اور بہت قلیل پانی سے شیو کیا۔ میری ڈاڑھی بہت گھنی تھی جسے میں نے گچھا گچھا کر کے کاٹا۔ میرے پاس، ظاہر ہے کہ آئینہ نہیں تھا، اگر ہوتا بھی تو وہاں روشنی نہ تھی۔ میں نے اندھوں کی طرح ڈاڑھی بنائی۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ میں خود کو اور کس طرح قائل کرتا؟ میں دیکھے بغیر دیکھتا تھا۔ جتنا دیکھتا تھا، اس سے زیادہ تصور کرتا تھا۔

بلیڈ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش کرتا رہا۔ 'آپریشن ہیئر کٹ' اچھا خاصا مہینے بھر تک جاری رہا۔ الحسین نے، جس کے ہاتھ میں خاص ہنر تھا، دوسرے پترے میں سے پانچ سوئیاں بنائیں۔ پتی کو گھسنے میں وہ گھنٹوں صرف کرتا تھا حتیٰ کہ وہ خاصی باریک ہو گئی، اتنی کہ پہلے تو اس نے ریزر کی مدد سے اس میں سے باریک قاشیں تراشیں اور پھر دھاگا پرونے کے لیے ان میں ننھے ننھے سوراخ بھی کر دیے۔

ہمیں سردی لگنے لگی تھی، اور تبدیل کرنے کے لیے ہمارے پاس کپڑے نہیں تھے۔ جولائی میں

جب ہمیں گرفتار کیا گیا، ہم ہلکے پھلکے لباس میں تھے، اور ابھی تک گرمیوں کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے۔

ہم نے حاضر دماغی سے کام ضرور لیا تھا کہ مرنے والوں کی قمیصوں اور پاجاموں کو محفوظ کر لیا تھا۔ اب، سوئی کی مدد سے، ہم نے پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کی، اور اپنے سب سے کمزور ساتھیوں کے لیے دو یا تین صدریاں بھی سی لیں۔

سردی کا موسم مہلک دشمن بن کر آیا۔ اس نے اتنی شدت سے حملہ کیا کہ ہمیں بری طرح ہلا دیا، یعنی دست لگا دیے۔ آخری بات کی وضاحت مشکل ہے کیونکہ سردی سے عموماً ہیضہ نہیں ہوتا — خوف سے ہو جاتا ہے۔ جب سردی شدت سے پڑنے لگی، ہمارے ہاتھ سخت پڑنے لگے، اور ہمارے جوڑ بھی اکڑنے لگے۔ ہم ہاتھوں کو باہم رگڑ نہیں سکتے تھے، اپنے چہروں پر نہیں پھیر سکتے تھے۔ ہم یوں اکڑ گئے تھے جیسے لاشیں ہوں۔ لیکن ہم کھڑے رہنے کو مجبور تھے۔ میں اپنے قدموں پر کھڑا رہتا، اپنے سر اور کاندھے جھکائے ہوئے۔ کبڑوں کی طرح جھکے جھکے اپنی کوٹھری میں قطری زاویے پر ٹہلتا رہتا۔ ٹھنڈ نے میرے سوچنے میں بھی خلل ڈال دیا تھا۔ اس نے مجھے دوستانہ آوازیں سنانی شروع کر دی تھیں، صحرا میں گم آدمی کو نظر آنے والے سراب کی مانند۔ یخ کر دینے والی سردی نے ہر شے کو درہم برہم کر دیا تھا۔ وہ جیسے بجلی سے چلنے والا برما تھا جو جلد میں سوراخ کیے جا رہا تھا۔ اس سے خون کے فوارے نہیں چھوٹ رہے تھے، کیونکہ خون تو رگوں میں منجمد ہو چکا تھا۔ آنکھیں کھلی رکھنا، جاگتے رہنا نہایت ضروری تھا۔ جو ناتواں تھے اور نیند کی آغوش میں چلے گئے، چند گھنٹوں میں ہی چل بسے۔ خون نے رگوں میں دوڑنا بند کر دیا تھا۔ وہ برف کی طرح سرد پڑ چکا تھا۔ دل اور دماغ میں برف رکھی ہوئی تھی۔ چوکس رہ کر، اپنے پیروں کو مسلسل حرکت میں رکھ کر، کود کود کر، بول بول کر، خود سے باتیں کر کے ہم اس برما دینے والی ٹھنڈ سے برسرِ جنگ تھے۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچ کر — اس سے منکر ہو کر، اس کی تردید کر کے۔

بابا، جو صحراوی تھا اور ایک شام کو ہمارے گروپ میں شامل کیا گیا، ٹھنڈ سے منجمد ہو کر مر گیا۔ دو آدمی بعد میں لائے گئے تھے، طول قامت اور دبلے پتلے۔ دوسرے کا نام جامعہ تھا۔ اس نے کبھی بات

نہیں کی۔ وہ پہلے ہی نہایت خستہ حالت میں یہاں پہنچے تھے، شاید کافی اذیتیں اٹھانے کے بعد۔ ان کے لیے چلنا دوبھر تھا۔ ایک محافظ نے انھیں کوٹھری میں لا پھینکا۔

"کتیوں کے پلّو!" اس نے چیخ کر کہا تھا۔ "تمھارے لیے ساتھی لے کر آیا ہوں — زیادہ بڑی کتیوں کے پلّے۔ یہ تم سے بڑے غدّار ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ صحرا مراکش کا حصہ نہیں ہے!"

صحرا کے ساتھ معاملات کے بارے میں ہم نے کچھ نہیں سنا تھا۔ ہم قیدِ تنہائی میں تھے، اور ایک آدھ بار ہم تک خبریں پہنچیں بھی تو ان محافظوں کے ذریعے سے جو محاذ پر مصروف اپنے دوستوں کے متعلق کوئی بات کہنا چاہتے۔ 'آپریشن گرین مارچ*' کے دوران ہم لوگ زیرِ زمین تھے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی محافظ ہمیں دھمکاتا رہتا تھا۔

"تم لوگ کسی مصرف کے ہوسکتے تھے، اگر تمھیں محاذ پر سڑکیں صاف کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا، جن کے نیچے ان فاسد حرامزادوں نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں — ان بھاڑے کے ٹٹوؤں نے۔ صحرا کا صفایا کرنے کے لیے الجزائر انھیں تنخواہ دیتا ہے۔ ان بارودی سرنگوں سے کم از کم ہمارے بہادر سپاہی تو نہ اُڑتے، بلکہ تم لیچڑ غدّار اڑتے۔"

بابا کی موت کا علم ہونے میں کئی دن لگ گئے۔ محافظوں نے سوچا کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کی برابر والی کوٹھری والے شخص نے انھیں بتایا کہ اس کے سانس تک لینے کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ انھوں نے اپنی بندوق کی نال سے بابا کو ٹہوکے دیے، اس کو جگانے کی کوشش کی۔ کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ مر چکا تھا، یقیناً۔ مجھے یاد ہے کہ ایک محافظ نے کہا تھا، "انا للہ وانا الیہ راجعون۔" ہم بلند آواز میں قرآن کی آیتیں پڑھنے لگے۔ میت پر اس مایوس کن دعا کو ناقابلِ برداشت پا کر محافظ چلے گئے۔ آسمان گھرا ہوا تھا، بارش ہو رہی تھی۔ تدفین کا کام بہت عجلت میں انجام دیا گیا۔ اندر کے مقابلے میں باہر سردی کا احساس کم ہوا تھا۔

بابا نیلے رنگ کا لبادہ پہن کر آیا تھا۔ یہ لمبا اور بہت کشادہ تھا، صحراوی لوگوں کا ایک روایتی لباس۔ ہم نے اس کو محفوظ کر لیا — صحیح لفظوں میں کہوں تو محافظوں کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اس لباس سے الحسین نے اور میں نے تین پتلونیں، پانچ قمیصیں اور چار زیرپوش سیے۔ یہ سوچنے سے کیوں باز رہا

جائے کہ بابا کی موت پسماندگان کے لیے نعمت بنی؟ ہم نے اسے دعائیں دیں اور اس کی روح کے سکون کے لیے دیر تک دعا مانگتے رہے۔ بابا مراکش کے جنوب بعید سے ہمارے درمیان مرنے کے لیے آیا تھا۔ اس کے ساتھی جامعہ کا چہرہ سخت اور جذبات سے عاری تھا۔ جب اس نے اندازہ کرلیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کہ یہ بھٹ ہم سب کی اجتماعی قبر ہے تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگا، ایسا لگتا تھا کہ اس کا گریہ ابد تک جاری رہے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلے کے گیت گانے لگا، اور پھر گہری خاموشی میں ڈوب گیا جو کئی دن اور راتوں تک برقرار رہی۔ وہ سویا نہیں۔ اس کا لمبا قد ایک مسئلہ تھا۔ وہ بے آرامی سے جھکا رہتا، اور بیچ بیچ میں ناقابلِ فہم آواز میں کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا۔

آخر ایک بار جب کریم نے تاریخ اور وقت کا اعلان کیا تو اسے سن کر جامعہ نے سکون محسوس کیا اور اس نے ہم سے بات کی۔

''جب میں رو رہا تھا تو صرف اس لیے کہ مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ دن ہے یا رات۔ یہ بات پاگل کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں اب جانتا ہوں کہ کیا چل رہا ہے۔ میرے بھائیو، مجھے اس آہ و زاری کے لیے معاف کرو جس نے تمھارے کانوں کو اذیت پہنچائی ہوگی۔ میں مشتعل تھا۔ ہم نے اپنی حماقت سے خود کو گرفتار ہونے دیا۔ جال بچھایا گیا تھا۔ ہمیں دھوکا دیا گیا۔ بابا ایسا شخص تھا جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اور اب، جبکہ وہ مر چکا ہے، میرے لیے کسی چیز کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا۔ ہم انقلاب میں یقین رکھتے تھے۔ ہم یہ تک سوچ رہے تھے کہ ہم مراکش کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے پر آمادہ کرلیں گے۔ ہم غلطی پر تھے۔ لیکن الجزائر اور کیوباوالوں نے ہمارا استعمال کیا... میں شہر مراکش میں پیدا ہوا۔ میں تمھارے جیسا ہوں۔ جب وہ مجھے بھرتی کرنے آئے تو میں جوش میں تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا، انقلاب ہمیشہ جنوب سے طلوع ہوتا ہے۔ چنانچہ میں جنوب کی طرف چلا گیا۔ میں نے اپنا نام تبدیل کرلیا اور صحراوی فوج میں شامل ہوگیا۔''

وہ جاگتے رہنے کے لیے باتیں کر رہا تھا۔ اور ہم اس کی باتیں سن رہے تھے۔ لیکن میں کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کے نیلے لبادے کا ٹکڑا پانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہر شے دوسروں کو دے دی تھی اور خود سرد پڑتا جا رہا تھا۔ میرے فوطوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے

انھیں اپنے ہاتھوں سے حرارت پہنچانے کی کوشش کی، لیکن میرے جوڑ تقریباً منجمد ہو چکے تھے اس لیے میرے ہاتھ دیر تک ان کے گرد اپنی گرفت برقرار نہ رکھ سکتے تھے۔ پارچے کی مدد سے میں کم از کم ایک پٹی ان پر لپیٹ سکتا تھا۔ میں نے اس کی کہانی ختم ہونے کا انتظار کیا، پھر اس سے اس کے لبادے کی ایک دھجی مانگی۔ جب میں نے اس خاموش تاریکی میں کپڑا اپھاڑنے کی پیاری آواز سنی، تو میں خوشی سے اچھل پڑا جس سے میرا سر چھت سے جا ٹکرایا۔

''میں اسے گیند کی طرح لپیٹ کر تمھاری طرف پھینکوں گا۔'' اس نے مجھے اطلاع دی۔

جیسا کہ مہماتی فلموں میں ہوتا ہے، کپڑے کی یہ گیند میری کوٹھری میں نہیں گری، بلکہ میرے دروازے کے ٹھیک سامنے گری۔ اب اسے کیسے حاصل کروں؟ کس چیز کی مدد سے؟ اگر محافظوں نے یہ کپڑا دیکھ لیا تو اسے ضبط کر لیں گے۔ الحسین نے یاد دلایا کہ جھاڑو ابھی ہمارے پاس موجود ہے۔ وہ کوٹھری در کوٹھری میرے پاس پہنچا دی گئی۔ اب تلاش شروع ہوئی۔ اندھے ہاتھوں میں اندھی جھاڑو! میں پیٹ کے بل لیٹا تھا اور پارچے کو ڈھونڈنے کی کوشش میں جھاڑو کو آہستہ آہستہ باہر سرکا رہا تھا۔ اسے حاصل کرنے میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ اور اب صحراوی انداز سے چیخنے کی میری باری تھی۔ یہ ایسی ہی چیخ تھی گویا انڈین امریکی گھڑ سوار فوج پر فتح پا کر چیخ رہے ہوں۔

اس رات میں بالکل نہیں سویا۔ کپڑے کو میں نے اچھی طرح لپیٹ لیا جس نے سردی سے مجھے تھوڑا بہت بچا لیا۔ دوسرے دن میں نے اس شے پر کام کرنا شروع کیا جس کی مجھے سردی سے لڑنے کے لیے ضرورت تھی۔

8

جب قہوہ برا لگے تو باہر کی دنیا میں لوگ کہتے ہیں، ''جرابوں کا جوس ہے۔'' اپنی قید کے ابتدائی دنوں میں یہی جملہ میں بھی استعمال کرتا تھا۔ لیکن میں غلطی پر تھا۔ جراب سے نچڑے پانی کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے، ایک بو ہوتی ہے — بری ہی سہی۔ آپ اسے پی سکتے ہیں، بلکہ مزید طلب بھی کر سکتے ہیں۔ ہر صبح وہ ہمیں نیم گرم پانی دیتے تھے جس میں کسی سوختہ کلف دار شے کا پاؤڈر ملا ہوتا تھا۔ یہ طے

کرنا مشکل ہے کہ وہ کیا چیز تھی — شاید چنے کا یا راجما کا آٹا۔ نہ یہ کافی تھی، نہ چائے۔ اس سوال کا جواب پانا ممکن نہ تھا۔ یہ مادّہ شکم میں جا کر تے کی مانند ٹکراتا تھا۔ کیا یہ اینیما تھا؟ اونٹنی کا موت جس میں کمانڈنٹ کا پیشاب بھی ملا ہوا ہو؟ ہم اسے بس حلق سے اتار لیتے تھے اور اس پر حیران ہونا چھوڑ چکے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔

روٹی۔ ہاں، ہمیں چونے جیسی سفید روٹی کا حقدار سمجھا گیا تھا۔ اس کو یقینی بنایا گیا تھا کہ ہمیں اتنی ہی کیلوری ملے جس سے ہم بھوکوں نہ مر جائیں۔ میں اکثر اپنے تصور میں ڈاکٹر کو مصروف دیکھتا تھا کہ ہمارے لیے ضروری کیلوریز کا حساب لگا رہا ہے، پھر وہ اپنی رپورٹ کو چمکدار سرخ لپ اسٹک اور سر پر کلاسک جوڑے والی سیکرٹری سے ٹائپ کرا رہا ہے، اب وہ رپورٹ اس افسر کو دے رہا ہے جس نے اس کی درخواست کی تھی۔ روٹی کی ہیئت آٹو موبائل کے ٹائر جیسی ہوتی تھی۔ سخت۔ موٹی۔ بے ذائقہ۔ اگر مہارت کے ساتھ پھینکی جائے تو اس روٹی سے کسی کو قتل بھی جا سکتا تھا۔ یہ روٹی نہیں سیمنٹ تھی۔ اس کو کاٹا نہیں جا سکتا تھا، توڑنا پڑتا تھا۔ اس کو چبانا نہیں، بھنبھوڑنا پڑتا تھا۔ چونکہ ہم میں سے اکثر کے دانت خراب ہو چکے تھے، اس لیے اس کو کھانا ایک اور عذاب تھا۔ کچھ لوگ صبح کے سیال کو بچا کر رکھتے تھے تاکہ اپنے حصے کی روٹی کو اس میں بھگو سکیں۔ باقی لوگ اسے توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیتے تھے اور روزانہ ملنے والے مانڈ، یعنی نشاستے کی پلیٹ میں ڈال لیتے تھے۔

مانڈ۔ اے نشاستے پر مبنی غذاؤ! میری اداسیو، میری ساتھیو، میری ملاقاتیو، میرے لازمی مینو، میری بقا، میری نجی کراہت؛ میری فرسودہ، سوختہ، درکنار محبت؛ کیلوریز کا میرا راشن، میرا اختلال و جنون! نشاستہ جو میں کھاتا ہوں اور جو میرے شکم میں ایسے اترتے ہیں جیسے مسرت۔

صبح کو بھی یہی نشاستہ اور شام کو بھی۔ یہ ڈاکٹر کے نسخے کی مانند تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مینو میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ کوئی تنوع نہیں۔ بدن کو موت آنے تک اسی مانڈ کا عادی بنے رہنا ہوگا۔ باسی نان اور پانی میں پکا ہوا مانڈ — تیل اور مسالوں کے بغیر۔ ہفتے میں ایک بار اونٹ کی چربی میں پکا ہوا۔ اس میں سے بدبو کے بھبکے اڑتے تھے۔ میں ناک بند کر کے کھاتا۔ میں پانی میں پکے ہوے مانڈ کو ترجیح دیتا تھا — اس بھٹ میں لفظ ترجیح اگر کوئی معنی رکھتا ہو تو۔

ہم سب کو یہی غذا فراہم کی جاتی تھی۔ یہی مانڈ جو موت کے آنے تک ہمیں دیے جانے تھے۔

یوں اٹھارہ برس تک، درست لفظوں میں کہوں تو 6,663 دن تک مجھے مانڈ اور سوکھی روٹی کی غذا دی جاتی رہی۔ کبھی گوشت نہیں، مچھلی نہیں۔ 'غذا دیا جانا' صحیح لفظ نہیں، بس زندہ رکھا گیا۔ سگریٹ کو بھولنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ سگریٹ سے اذیت ناک محرومی کے سبب مجھے کسی ایسے جنون سے نہیں گزرنا پڑا جس کے سبب چار نمبر، العربی کا دماغ الٹ دیا۔ وہ چیختا چلاتا تھا، اپنی واحد قمیص کو اس نے پھاڑ ڈالا تھا، محافظوں کو پکارتا تھا اور ایک سگریٹ کے بدلے میں کچھ بھی دینے کو تیار تھا۔

''اگر تم مجھے سگریٹ نہ دو تو میرے قریب آ کر پیو۔ مجھے اس کا دھواں پینے دو، اس کی یاد مجھے اس قدر ستا رہی ہے۔ تم جو چاہو مجھ سے لے لو... ہاں، میں جانتا ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے... شاید، بس میرا پچھواڑا... وہی لے لو... اس میں ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔ لیکن ایک کش، صرف ایک کش۔ پھر چاہے مجھے برباد کر دو۔ میرے پچھواڑے کو اُڑا دو۔ میں راکٹ کی طرح اڑ جاؤں گا، چین اسموکرز کے جہنم کی طرف۔ یہاں آؤ۔ بھول جاؤ کہ ہم دشمن ہیں، اور یاد رکھو کہ ہم ایک ہی گاؤں کے ہیں۔ تم مجھے بس ایک سگریٹ دے دو، پھر میرے گھر چلے جانا۔ وہ بدلے میں تمھیں پیسا اور کپڑے دیں گے...''

بیچارہ العربی بھوک ہڑتال پر بیٹھ گیا اور خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ ہم ایک مہینے تک اس کی دھیمی دھیمی کراہیں سنتے رہے۔

''میں مرنا چاہتا ہوں۔ موت کا فرشتہ اتنا وقت کیوں لے رہا ہے؟ اسے کون روکے ہوئے ہے؟ اسے یہاں آنے، اور میری کوٹھری کے دروازے میں چپکے سے داخل ہونے سے کون روک رہا ہے؟ یہ مونچھوں والا محافظ، یہی کمینہ راستہ روکے ہوئے ہے۔ جب موت مانگو تو مرنا کس قدر مشکل ہے! اسے میری تقدیر کی کچھ پروا نہیں۔ لیکن اسے اندر آنے دو۔ خوش آمدید کہو! اس بار وہ میرے لیے آ رہا ہے۔ میری نجات کے لیے۔ سنو، تم سب! جب وہ ادھر سے گزرے تو اسے کوئی نہ پکڑے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ بالآخر اس نے میری پکار سن لی ہے۔ الوداع، میرے کیڈٹ ساتھیو! الوداع، انقلابیو! الوداع، دوستو! میں یہاں سے چلا۔ اس میں کوئی شک نہیں، میں جا رہا ہوں۔ اور وہاں جا کر میں ایسی سگریٹ پیوں گا جو کبھی ختم نہ ہو گی...''

ملک الموت نے اس کی پاسداری کی۔ لیکن اس رات کے بعد جب العربی کو لگا تھا کہ اس نے موت کو دیکھ لیا ہے، وہ اسے مزید ایک ہفتے تک لے کر نہیں گیا۔ العربی اچھا لڑکا تھا، مستقل خیالوں میں

ڈوبا رہنے والا، مہربان، اور قدرے سادہ دل۔ اہر میمو میں وہ کلاس کے سب سے پچھڑے لڑکوں میں سے تھا۔ حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش سے ٹھیک پہلے اس کا الحاجب کے لیے تبادلہ ہونا تھا، جہاں وہ شاید نان کمیشنڈ افسر بن جاتا۔ سارا معاملہ بس چند دنوں کا تھا۔ اسے وہ ٹھیک سے نہ سنبھال پایا۔ اس کی فائل بھلا دی گئی تھی اور جس دن ہم لوگ روانہ ہوئے، وہ بھی دوسروں کے ساتھ ٹرک پر سوار ہو گیا، یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ جب وہ سگریٹ پیتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے چبا رہا ہو۔ شاید یہی اس کی واحد مسرت تھی۔

اس کا وزن اتنا گھٹ چکا تھا کہ انسان جیسا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی بوٹیوں جیسی ہو گئی تھیں اور اپنے حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں۔ اس کے دہانے کے گوشوں پر جھاگ تھا۔ اس کے ہڈیالے چہرے پر تم سارے زمانے کی نفرت اور اذیت پڑھ سکتے تھے۔ اس کی تدفین کے دوران استاد الغربی نے قرآن پڑھا۔ روشنی بڑی زبردست تھی، کہنے کا مطلب کہ بڑی پر شکوہ اور شاندار تھی۔ بہار کا موسم تھا۔ میں نے وہ روشنی اپنی آنکھوں اور پھیپھڑوں میں بھر لی۔ ہر ایک نے یہی کیا۔ الغربی چند ثانیوں کے لیے رک گیا، اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، گہرا سانس لیا، اور پھر اپنا منھ اس طرح کھولا گویا ہوا کو نگل رہا ہو۔ محافظوں نے ہمیں اس تدفین کے بہانے قدرے دیر تک باہر رہنے دیا۔ ہم نے یہ کہہ کر الغربی کا شکریہ ادا کیا، ''الوداع، **خدا حافظ، جلد ملیں** گے۔ ہم پھر سے ملیں گے، خدا کی رحمت کے طلب گار ہوں گے۔ وہی ہمارا **مالک ہے، اور اسی کی طرف** لوٹ کر جائیں گے۔'' اس میں مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ سلطان میرا مالک نہیں تھا، نہ زیرِ زمین قبرستان کا کمانڈنٹ میرا مالک تھا، اور نہ ہی وہ محافظ جو پورے اسلحے سے لیس تھے۔ میں صرف اللہ ہی کے لیے ہوں۔ وہی میری روح کو بلائے گا اور میرا حساب کرے گا۔ ان سپاہیوں کی بے رحمیوں کی اب مجھے پروا نہ تھی۔ خدا پر میرا عقیدہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اللہ ہی قدرت والا ہے، رحیم ہے، کبیر ہے، کریم ہے، وہی ہے جو آسمانوں اور زمین سے واقف ہے، وہی ہے جو جانتا ہے کہ ہمارے دلوں میں کیا ہے اور روحیں کہاں جاتی ہیں۔

اپریل کے اس دن کی وہ روشنی خدا کی خوبیوں کی نشانی تھی۔ اس نے مجھے سکون پہنچایا تھا، تسلی دی تھی، اور میں اپنے بھٹ میں لوٹنے کو تیار ہو چکا تھا۔

میں اپنی رضا سے الغربی کی کوٹھری صاف کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس کی الٹیوں اور گندگی کی بدبو پر

قابو پانے کے لیے میں صرف روشنی اور موسم بہار کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے اپنا سانس بھی نہیں روکنا پڑا، میں بیک وقت وہاں تھا اور کہیں اور بھی۔ میں گنگنا رہا تھا، جیسے بہت خوش تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اداسی اور نفرت کرنا چھوڑ دوں گا، بالکل اسی طرح جیسے میں نے یادوں کو ترک کر دیا تھا۔

میں نے فرش کو رگڑ کر صاف کیا جس پر نان کے ریزے تھے اور بچے کھچے کھانے میں خمیر اٹھ گیا تھا۔ کوٹھری میں قے اور پھپھوندی کی بدبو بسی ہوئی تھی۔ بدبوؤں کا بھی کوئی رنگ ہوتا ہوگا۔ میں نے تصور کیا کہ یہ سبز رنگ ہے جس پر لال بھورے دھبے ہیں۔ شاید ہر شے سیاہ تھی اور میں اس میں رنگ شامل کر کے اپنا وقت ضائع کر رہا تھا، جہاں بھوری سیاہی اور فرسودگی کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ میرے لیے ایک عمدہ روحانی کسرت تھی۔ اپنی کوٹھری میں لوٹ کر میں نے خود کو صاف کیا اور سلامت ہونے کی راحت کو محسوس کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے غلاظت کی بدبو کو نہ سونگھنے کا نام ہی راحت ہو۔

9

جو لوگ مرے ان میں سے بیشتر بھوک سے نہیں، **بلکہ نفرت کی وجہ سے مرے۔**

نفرت کا احساس ہمیں ضعیف کر دیتا ہے۔ **یہ ہمیں اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے** اور ہماری قوتِ مدافعت پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جب نفرت ہمارے اندر بھر جاتی ہے تو بالآخر پامال کر دیتی ہے۔ اتنی سادہ سی بات کو سمجھنے کے لیے مجھے ایک آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ اہرمیمو کے اسکول کا مجھے اپنا ایک معلم یاد آیا جو ایک برا انسان تھا، کینہ توز اور منحوس۔ اس کی آنکھیں زرد تھیں۔ نفرت کے رنگ کی۔ ایک دن وہ کلاس میں نہیں آیا۔ ہمیں پتا چلا کہ ایک لمبے عرصے کے لیے اسے ہسپتال میں بھرتی ہونا پڑا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک کوہستانی عورت نے، جس کی بیٹی کی اس نے آبروریزی کی تھی، اس پر جادو کرا دیا تھا۔

ہم ان مظالم سے نفرت کیونکر محسوس نہ کرتے جن سے گزرنے پر انھوں نے ہمیں مجبور کیا تھا؟ ہم ان بے چہرہ وحشیوں کے مقابلے میں زیادہ عظیم اور شریف کیونکر ہو سکتے تھے؟ ہم انتقام اور انہدام

کی شدید خواہش سے کیسے بچ سکتے تھے؟

جب مجھے یہ احساس ہوگیا کہ ابتدائی دنوں میں مرنے والے ساتھی نفرت کے زیرِ اثر تھے تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ نفرت ہی کا پہلا شکار بنے ہیں۔ جس کے سبب میں اس صداقت کا قائل ہوا وہ رشدی تھا، نمبر تئیس۔ وہ ایک شریف، سنجیدہ، زیرک اور ذہین انسان تھا۔ میرے خیال میں اس نے غلط پیشے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ فوج میں کیا کرنے آیا تھا؟ وہ فاس کے ایک اہم خاندان سے تھا، بورژوا طبقے سے، جو فوج سے بیزار رہتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ صرف کسانوں اور کوہستانیوں کے بچوں کو ہی فوج میں بھرتی ہونا چاہیے۔ اس خاندان کے بچے بھی یونیورسٹیوں کے لیے، سول سروس کے اعلیٰ عہدوں کے لیے یا شاید بڑے تاجر بننے کے لیے جنمے تھے۔ یہ رشدی کا پس منظر تھا اور وہ اسے یاد کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے والدین سے بغاوت کرنے کو فوج میں بھرتی ہوا تھا— اپنا نسب بھولنے کے لیے، اپنی جڑوں سے رشتہ توڑنے کے لیے، اپنی قدرے اشرافی تعلیم کو خیر باد کہہ کر مختلف النوع سماجی دائروں کی تلاش میں۔ ہم دونوں میں دوستی تھی، اور ایک احساسِ شراکت بھی۔ میرا خیال ہے صرف مجھے اور رشدی کو ہی یہ شک گزرا تھا کہ کمانڈنٹ الف حکومت کا تختہ پلٹنے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ جب انھوں نے ہمیں ٹرکوں میں سوار ہونے کا حکم دیا تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہماری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ شاید آنسو تھے، یا پھر انجانے ایڈونچر کی جنونی سی پیش بینی۔ ہمیں کمانڈنٹ اور اس کے وفادار ایڈ جوٹنٹ کی نجی گفتگو یاد آ گئی۔ تمام سفر کے دوران ایک گراں خاموشی ہم پر طاری رہی۔ رشدی سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ میرا خیال ہے وہ رو رہا تھا۔

رشدی صدمے میں تھا، بری طرح اذیت میں مبتلا۔ جب ہم نے محل پر حملہ کیا تو اس نے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ وہ گر پڑا، اپنے ہتھیار کے گرد گڑمڑی بن گیا۔ اس کے شانے میں گولی لگی اور بے ہوش ہوگیا۔ قنیطرہ کی جیل میں جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اس نے مجھ سے کہا کہ یہ اس کی سمجھ سے باہر ہے کہ وہ وہاں کیوں ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا، اور یہ کہ ایک بھیانک غلطی ہے، شدید ناانصافی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش ترک کر دی۔ وہ قتل کرنے اور انتقام لینے کی بات کرتا تھا۔ وہ نفرت کی گرفت میں تھا، جیسے یہ ناقابلِ علاج بیماری ہو۔ وہ ہر شخص کو

ذبح کر ڈالنا چاہتا تھا: محافظوں کو، جج کو، وکیلوں کو، شاہی خاندان کو، اور ان سب کو جو اس کی قید کے لیے ذمے دار تھے۔ جب ہمیں تازمامرت میں منتقل کیا گیا تو اس کا دماغ الٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کیا کہتا ہے، لیکن وہ نفرت کی گرفت میں تھا۔ نفرت نے اسے ضائع کر دیا، اسے کھالیا، خود سے ہی اجنبی بنا دیا۔ اس دوران میں کوئی نہیں مرا تھا اس لیے ہماری ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اکثر اس کو آوازیں دیتا تھا۔ جواب ندارد۔ صرف گریہ، زخمی جانور کی سی چیخیں۔ وہ بھی اپنی موت میں تعجیل چاہتا تھا، لیکن موت، جس نے ہمارے جیلروں کے ساتھ سازش کر رکھی تھی، اپنا شیریں وقت لے رہی تھی۔

ایک دن میں نے محافظ سے کہا کہ ہمیں صرف ایک لمحے کے لیے اس سے ملنے دے۔ سوال کوٹھری سے باہر نکلنے کا نہیں تھا بلکہ محافظ کی فلیش لائٹ مستعار پانے اور رشدی کو دیکھنے جانے کا تھا۔ جواب مجھے تیز انکار کی صورت میں ملا، ساتھ ہی دھمکیاں اور گالیاں بھی۔ چنانچہ ہم نے ہڑتال کر دی۔ بولنا بند۔ ہم نے تہہ خانے پر مکمل خاموشی طاری کر دی۔ معمولی سی حرکت بھی نہیں۔ ہم نے اپنے سانس روک لیے۔ گہری خاموشی کے، وہم انگیز اور اذیت دہ چند لمحوں نے ہی محافظوں کو وحشت زدہ کر دیا۔ وہ چیخنے لگے اور اپنے ہتھیاروں کے دستوں سے دروازوں کو پیٹنے لگے۔ ہم مردوں کی طرح پڑے رہے۔ سکوت اور تاریکی نے جنات نظر آنے والے حالات پیدا کر دیے تھے۔ یہ نسخہ اکسیر ثابت ہوا۔

''چلو یہاں سے!'' ایک محافظ چیخا۔ ''بھاڑ میں جھونکو۔ نکل چلو! یہاں آسیب ہیں — قسم لے لو میں نے ابھی جن دیکھا ہے، انگارے جیسی آنکھوں والا... ان حرام زادوں کو چھوڑ دو جنات کے ساتھ۔ یہ سب ایک جیسے ہی غلیظ ہیں۔ چلے آؤ، جلدی کرو...''

اپنے شکموں میں خوف کو سمائے وہ چلے گئے، جبکہ ہم خوش ہو کر بے شرمی سے کھی کھی کرنے لگے، جنوں کی طرح۔

موت سے پہلے ہم رشدی کو نہ دیکھ سکے۔ محافظ جو اس کی موت کی تصدیق کرنے آیا تھا، اسے دیکھ کر پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے جیسے ہی مردے کے چہرے پر روشنی ڈالی، خوف سے چیخ مار کر پیچھے ہٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی، جسے ہم نے اپنی معروف جھاڑو

کے دستے کی مدد سے ایک کوٹھری کے نزدیک کھسکا لیا، لیکن پتا چلا کہ وہ دروازے کے نیچے سے اندر نہیں لائی جا سکتی۔ جب دوسرا محافظ نظم و نسق سنبھالنے آیا تو وہ کچھ نہیں بولا، بس مجھے اور الحسین کو تکفین کی ذمے داری دے دی۔ اس کے بعد مردے کو رات میں دفنانے کا اہتمام کیا۔ وہ ضرور نان کمیشنڈ افسر رہا ہوگا۔ اس کا نام مفاضل تھا۔ جب ہم سب میت کے گرد کھڑے تھے اس نے چند الفاظ بڑبڑائے۔

''اگلی بار اگر تم لوگوں نے ہڑتال کی تو تم پر بچھو چھوڑ دوں گا۔ پھر دیکھوں گا اصلی جن کون ہے، میں یا تم! ٹھیک! اس غلاظت کو اپنے سوراخ میں ہی بند رکھو۔''

اس کے جواب میں ہم نے بیک آواز فاتحہ پڑھنی شروع کر دی۔ محافظوں نے ہمیں دھکے دے دے کر بھٹ کے دروازے میں دھکیل دیا، اس درمیان مفاضل ایک بڑے سے پتھر پر پیشاب کرتا رہا۔

ہماری بولتی گھڑی خراب ہوگئی تھی۔ رات کی اس تدفین سے کریم شاید بہت متاثر ہوا تھا، خصوصاً این سی او کی دھمکیوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ وقت کا حساب رکھنا بھول گیا۔ ہم سنتے رہے کہ وہ اپنی کوٹھری میں زور زور سے ہفتے کے دنوں اور گھنٹوں کا حساب لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کو پرسکون رہنے کا مشورہ دیا، اور یقین دلایا کہ چیزیں پھر سے قابو میں آجائیں گی۔ وہ سونے چلا گیا، اور اگلی صبح اس نے مرغے کی بانگ دے کر ہمیں جگایا۔

''پانچ بج گئے ہیں۔ یہ فجر کی نماز کا وقت ہے۔ میرے مسلمان بھائیو، بیدار ہو جاؤ۔ نماز کسی کا انتظار نہیں کرتی۔''

ایک لمحہ خاموش رہ کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اب نہ سوؤ، اب اور نہ سوؤ، میرے بھائیو۔ دھیان سے سنو۔ گرمیوں کا موسم ہے۔ آج 3 جولائی 1978 کا دن ہے۔ صبح کے پانچ بج کر چھتیس منٹ ہوئے ہیں۔ یہ بچھوؤں کا وقت ہے۔ ذرا سنبھل کے رہو، وہ یہیں ہیں۔ میں انھیں محسوس کر سکتا ہوں، ان کی آواز سن سکتا ہوں۔ کڑکڑاتی سردیوں اور نمی کے بعد، گرمیاں آچکی ہیں، بچھوؤں والی گرمیاں۔ ہمیں منظم ہو جانا چاہیے۔ میری مشین اس لیے خراب ہوگئی تھی کیونکہ ایک اجنبی وجود کو میں نے اپنی کوٹھری میں محسوس کر لیا تھا۔ نہیں، یہ جنات نہیں ہیں۔ نہیں، یہ قاتل ہیں، موذی کیڑے جو ڈنک مارتے ہیں اور زہر چھوڑتے ہیں۔''

میں بچھوؤں کا ماہر ہو گیا۔ ان کے بارے میں پڑھے بغیر میں ان سے واقف ہو گیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ کس طرح چلتے ہیں، کیسی آوازیں نکالتے ہیں، کتنے درجۂ حرارت پر ڈنک مارتے ہیں، انھیں کہاں چھپنا پسند ہے اور اپنے دشمنوں کو کس طرح بے وقوف بناتے ہیں۔

میں نے یہ سب جبلّی طور پر سیکھ لیا تھا۔ تاریکی میں ہم انھیں دیکھ نہ سکتے تھے۔ یہ پہلی گرمیاں تھیں جن میں وہ ظاہر ہوئے تھے۔ اور فطری طور پر نہیں۔ اتفاقیہ طور پر بھی نہیں۔ این سی او انھیں اس غار میں لے کر آیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا۔ ورنہ تو ان خوفناک حشرات کے بغیر گرمی کے پانچ موسم گزرنے کے بعد ان کے اچانک حملے کی کیا توجیہہ ہو سکتی تھی؟ لیکن اس شخص نے ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ میں سچ مچ یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی لیفٹیننٹ کرنل یا جنرل ہیڈکوارٹر جا کر دوسرے افسروں سے ملاقات کرتا اور کسی نوکر کو بچھو جمع کرنے کا اور انھیں ہمارے بھٹ میں پھینکنے کا حکم دیتا۔ نہیں، یہ کسی کا ذاتی اقدام تھا۔ یہ این سی او — شاید یہ کوئی اسٹاف سارجنٹ تھا — ہم سے انتقام لے رہا تھا، شاہ کی محبت میں وہ یہ کام نہیں کر رہا تھا، بلکہ اپنے اعلیٰ افسروں سے نفرت کے سبب جنھوں نے اس کا تقرر یہاں کر دیا تھا، زندہ لاشوں کی حفاظت کے لیے، یا یہ کہوں کہ ادھ مروں کی حفاظت کے لیے جنھیں ست رو موت کی سزا دی گئی تھی۔

جیسا کہ کریم نے کہا تھا، ہمیں منظم ہونا تھا۔ مانڈ پر مشتمل شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے میٹنگ کی۔ ہم سب اپنی اپنی کوٹھری میں کھڑے ہو گئے۔ میں بیٹھا ہوا تھا کیونکہ بہت طول قامت تھا۔ اکیس نمبر وقرین نے، جو ایک معتبر ساتھی تھا، بتایا کہ جب وہ چھوٹا تھا تو تافراوت میں بچھوؤں سے کھیلتا تھا جو خصوصاً گرم اور بنجر علاقہ ہے۔ اس نے کہا کہ بچھو موذی ہوتا ہے لیکن زیادہ چالاک نہیں ہوتا۔ یہ چٹانوں سے چپک کر رہنا پسند کرتا ہے، لیکن جب گرتا ہے تو ڈنک مارتا ہے۔

اس کی بات درست تھی۔ بچھوؤں کا پتا لگانے کے لیے ہمیں خاموش رہنا تھا، بالکل خاموش۔ جب تک ہمیں ان کے چلنے کی آواز آتی رہتی، ہمیں پتا چلتا رہتا تھا کہ وہ سر کے اوپر ہیں۔ اور اگر وہ گرے تو آواز سے ہمیں پتا لگانا ہوتا تھا کہ وہ کس سمت میں گرے ہیں، اور وہاں سے دور ہٹنا پڑتا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے بیدار رہنا ضروری تھا۔ میرے دوست الحسین کو ڈنک اسی وجہ سے لگا کہ اسے نیند آ

گئی تھی۔ ہم نے محافظوں کو آوازیں دیں تو وہ اگلی صبح تک نہیں آئے۔ وہ تبھی آئے جب وہ شے لاتے تھے جو 'کافی' کہلاتی تھی۔ وقرین نے محافظوں سے التجا کی کہ وہ اسے زہر چوس کر نکال لینے دیں۔ غریب الحسین تب تک شدید بخار میں تپنے لگا تھا۔

''بخار اڑتالیس گھنٹے تک رہے گا۔'' وقرین نے اس کا زہر چوس کر تھوکتے ہوئے بتایا۔ ''ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، سونا ہرگز نہیں۔''

''ہم پاگل ہو جائیں گے،'' کسی نے روتے ہوئے کہا۔

''یہ بچھوؤں کا کھٹراگ ہم کو جلدی مارنے کے لیے پھیلایا گیا ہے،'' میرے دائیں ہاتھ والے پڑوسی نے اعلان کیا۔

''لیکن حاکم ایسا کرنا نہیں چاہیں گے،'' میں نے جواب دیا، ''کیونکہ وہ ہم کو تل تل کر کے مارنا چاہتے ہیں۔''

''حاکم کیا کہتے ہیں، بھاڑ میں جھونکو،'' استاد الغربی نے رسان سے کہا۔ ''مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ ہمیں ہر کوئی بھول چکا ہے — وہ لوگ بھی جنھوں نے ہمیں سزا دی، اور وہ بھی جنھوں نے ہمیں اس قبر میں پھینکا۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ محافظوں سے کچھ روشنی کا مطالبہ کیا جائے تا کہ ان قاتلوں کو ہم اپنی کوٹھریوں سے باہر نکال سکیں۔''

ظاہر ہے، روشنی! لیکن سارا نظام تو تاریکی کے اصول پر مبنی تھا۔ اس ناقابلِ عبور تیرگی پر، اس اندھیرے پر جس نے ان دیکھے کا خوف بڑھا دیا تھا، نامعلوم سے ہراساں کر دیا تھا۔ موت گھات میں تھی۔ قریب تھی۔ لیکن ہم یہ نہ جان سکتے تھے کہ وہ کس سمت سے حملہ کرے گی، اور کس حربے سے۔ ہمیں ان دیکھے کے رحم و کرم پر رہنا تھا۔ یہ عذاب تھا، ان کے انتقام کا انتہائے کمال۔

میں نے اس واقعے پر بار بار غور کیا تھا۔ درست کہ ہم نے اُسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے مہمانوں کے درمیان اسے تلاش کیا۔ اور بازی ہار گئے۔ ہم محض سپاہی تھے، صرف ماتحت افسر جو احکام کی تعمیل کرتے ہوئے اس جہنم کی شوریدگی میں پھنس گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں تبھی کیوں نہیں مار دیا تھا؟ فرانس جیسے ملک میں بھی، جس شخص نے جنرل ڈی گال کی کار پر گولی چلائی، اسے سزائے موت دی

گئی تھی۔ ایسا کرنا معمول کی بات تھی۔ انھوں نے ہم پر عدالت میں مقدمہ کیوں چلایا اور دس برس قید کی سزا سنائی، صرف اس لیے کہ بعد میں مرگِ طولانی میں مبتلا کریں؟ ایسا کیوں ہوا کہ ان جنرلوں کو جنھوں نے تختہ پلٹنے کی سازش کی تھی، ان کے عہدوں سے محروم کر کے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے بھیج دیا گیا، جبکہ ہم جونیئر افسروں کو، جو کیڈٹوں کے معلم تھے، رینگتی ہوئی موت کے لامتناہا عذاب میں مبتلا ہونا پڑا؟ ایک موذی، فاسد موت جو ہمارے اعصاب پر، اور جو کچھ ہمارے پاس بچا تھا یعنی ہمارے وقار پر شکنجہ بن کے کس گئی تھی۔ ہر بات کو اس قدر طول دینے سے کیا بھلا ہونا تھا؟ جن لوگوں نے خطا کی تھی، جرم کیا تھا ان کی وجہ سے ہمیں تباہ کر دیا گیا۔ ہمیں زندہ کیوں رہنے دیا گیا؟ ہمیں ایسی جیتی جاگتی لاشوں میں کیوں بدلا گیا جن کو صرف اتنی آکسیجن دی جاتی تھی کہ بس زندہ رہیں اور عقوبت جھیلتے رہیں؟

وہ دن آئے گا جب میں کوئی نفرت محسوس نہ کروں گا، جس دن بالآخر میں آزاد ہو جاؤں گا اور وہ سب ظاہر کروں گا جو میں نے برداشت کیا ہے۔ میں یہ سب لکھوں گا یا پھر کسی اور سے لکھواؤں گا۔ اور یہ سب انتقام کی غرض سے نہیں کروں گا بلکہ اندراج کے لیے، ہماری تاریخ کے دفتر میں ایک دستاویز کا اضافہ کرنے کے لیے۔ فی الحال میں باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اپنے آپ سے باتیں، خود کو نیند سے بچانے کے لیے، تاکہ بچھوؤں کے لیے تر نوالہ نہ بن جاؤں۔ میں باتیں کرتا ہوں، میں کودتا پھاندتا ہوں، میں اپنا سر آہستہ آہستہ دیوار سے ٹکراتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں جانتا ہوں کہ میرا بچھو کہاں چھپا ہوا ہے۔ میری تیز سماعت نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ اس وقت تیسرے اور چوتھے پتھر کی درمیانی دراڑ میں ہوگا جس میں سے موسلا دھار بارش میں پانی اندر آ جاتا ہے۔ میں اس کی مخالف سمت میں سمٹا ہوا بیٹھا ہوں۔ میں پُراعتماد ہوں، اپنی بصیرت پر تکیہ کیے ہوں۔ اگر مجھے ڈنک لگا تو وقرین زہر کو چوس کر نکال دے گا۔ وہ ایسا کرنے کا عادی ہے۔ مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ میں اپنا سانس روکتا ہوں۔ کہیں کوئی حرکت نہیں۔ مشکل ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا، سمٹا ہوا بیٹھا ہوں، مجھے نیند آ جاتی ہے...

پیٹھ میں چھرا گھونپنے جیسے بھیانک درد سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ بچھو کا ڈنک نہیں تھا۔ میری کمر کا درد لوٹ آیا تھا۔ گٹھیا کا درد؟ ریڑھ کی ہڈی کی چوٹ؟ پٹھوں کی اینٹھن؟ میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ کیسا

درد تھا؟ مسلسل جھکے رہنا کسی نہ کسی طرح ریڑھ کو ٹیڑھا تو کرے گا ہی۔ یہ جان کر کیا فائدہ کہ یہ درد کیوں ہوا؟ مجھے اسے برداشت کرنا ہے، اسی کے ساتھ جینا ہے، اور اس کو بھولنے کی کوشش کرنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کے جسم کا یا ذہن کا کوئی نہ کوئی حصہ مکمل طور پر خراب ہو چکا ہے۔ ہمارے سارے عارضے، ہمارے سارے مسئلے بد سے بدتر ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر میسر نہیں۔ اصول یہی تھا، یہاں ڈاکٹروں کا کوئی کام نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے، ڈاکٹر کا کام موت سے لڑنا ہے، اسے پیچھے دھکیلنا ہے، شکست دینا ہے۔ یہاں ہدف اس کا بالکل الٹ تھا۔ اگر کسی میں بیماری کے آثار ظاہر ہوئے تو اسے جڑ پکڑنے دیا گیا، بڑھنے دیا گیا، پورے جسم پر قابض ہونے دیا گیا، صحت مند اعضا کو متاثر ہونے دیا گیا، اسے اپنا کام کرنے دیا گیا، اور تکلیف کو ہر پہلو سے پورے جسم پر حاوی ہونے دیا گیا۔ کسی بھی طرح کی طبی سہولت ممنوع تھی۔ بہر حال، کوئی نہیں تھا جس سے ہم اس طرح کی بات یا شکوہ کر سکتے جیسے قنیطرہ میں کیا کرتے تھے۔

تازمامرت میں ایک افسر تھا— کوئی کمانڈنٹ۔ ہم نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔ وہ ضرور کوئی بھوت تھا، کوئی سایہ، ایسا وجود جسے وہاں موجود رہنا تھا لیکن خود کو ظاہر نہیں ہونے دینا تھا۔ شاید وہ صرف آواز تھا، مسلسل چیخ چیخ کر سخت احکامات دینے والی آواز جس کے خلاف کوئی سنوائی نہیں ہو سکتی تھی۔ رِکارڈ کی ہوئی آواز، شاید کسی ایکٹر کی۔ جب اچھے موڈ میں ہوتے تو محافظ وعدہ کرتے کہ وہ 'کمانڈنٹ' سے بات کریں گے— لیکن ہمیں اپنی التجاؤں کا کبھی جواب نہیں ملا۔ اس سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا: کمانڈنٹ کا کوئی وجود نہیں۔ وہ محض ہَوّا ہے، اور ہم ایسا ڈھونگ کرتے ہیں جیسے وہ ہمارے غار کے خفیہ داخلی دروازے سے چند درجن گز کے فاصلے پر موجود ہو۔ اتنے اہم قیدی ایک ایسے کمانڈنٹ کے حوالے کیونکر کیے جا سکتے تھے جو ایک شام مراکش یا کاسابلانکا کے کسی شراب خانے میں نشے میں دھت پایا جائے، اور نشے اور پشیمانی کی آگ میں جلتا ہوا بولنا شروع کر دے، اس چھوٹی سی بستی کا خوفناک نام اگل دے— تازمامرت کا نام جو مراکش کے نقشے میں الرشیدیہ اور الریش کے درمیان واقع ہے؟

یہ غیر مرئی کمانڈنٹ، دہشت کا ہی دوسرا نام تھا۔ محافظ اس کے بارے میں ایسے بات کرتے تھے جیسے وہ دھات کا ٹکڑا ہو، بے لچک، وحشی، بے انتہا طاقتور۔ وہ کہتے تھے، ''کمانڈا، وہ لوہے سے بنا ہے، حدید سے— اسٹیل کی طرح سخت۔''

بعد میں، بہت بعد میں، جب کمانڈنٹ سے میرا آمنا سامنا ہوا تو اندازہ ہوا کہ یہ شخص کسی خاص شے سے ڈھلا ہے، کسی طرح کے کانسے یا کسی لافانی دھات سے۔

وہ خدمتگاری کے لیے ہی پیدا ہوا تھا، سارے اسائنمنٹ نمٹانے کو معمولی کاموں سے لے کر نہایت خوفناک کاموں تک۔ کسی جذبے کے بغیر، کوئی شبہہ دل میں لائے بغیر۔ وہ احکامات لیتا اور آہنی ارادے سے ان پر عمل درآمد کرتا۔ ہمارا انچارج بننے سے پہلے وہ کئی بدبختوں کے گلے کاٹ چکا تھا، کئی کو زندہ دفن کر چکا تھا، اور حکومت کے مخالفین کو مہارت کے ساتھ اذیتوں میں مبتلا کر چکا تھا۔ کار ایکسیڈنٹ میں اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ ''خدا کی مرضی،'' اس پر اس نے کہا تھا۔ بس اتنا ہی۔

آٹھ محافظوں میں سے دو خصوصاً زیادہ برے تھے۔ ان میں ایک فنتاس تھا، دبلا پتلا، لمبے قد کا، ایک دانت سونے کا۔ وہ ہر وقت تھوکتا رہتا تھا اور سچ مچ بہت بدخو تھا۔ جب بھی منہ کھولتا، اس کے منہ سے گالیاں اور فحش الفاظ ہی خارج ہوتے۔ ہم اسے جواب نہ دیتے، اور اسے اس کی بدمزاجی پر چھوڑ دیتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایسے ساتھیوں کی شکایت بھی اوپر تک پہنچاتا تھا جو ہمارے ساتھ زیادہ کمینگی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے، اور ان کو کمزور ہونے اور ''کتوں اور غداروں'' کا ہمدرد ہونے کا مورد قرار دیتا تھا۔

ایک دن فنتاس غائب ہو گیا۔ اس کی بھدی آواز یا اس کے تھوکنے کی آواز اب ہمیں سنائی نہ دیتی تھی۔ دو مہینے بعد وہ لوٹا تو ہم اسے پہچان نہ سکے۔ وہ ہر کوٹھری کو کھولتا جاتا تھا اور معافی مانگتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ٹارچ کو اپنے چہرے کی طرف کر رکھا تھا جس کی وجہ سے میں نے اس کے خدوخال دیکھے۔ وہ رو رہا تھا اور پھر اس نے ایک عجیب سا اعتراف کیا۔

''میں شرمندہ ہوں، میں نے تمھارے ساتھ برا کیا، نہایت خوفناک سلوک کیا۔ میں نے تمھاری خوراک میں تھوکا اور اس میں ریت ڈالی۔ میں تم سے نفرت کرتا تھا کیونکہ مجھے نفرت کرنا ہی سکھایا گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ تم لوگ ایک آہستہ رو اور اذیت ناک موت مرو۔ میں نے تمھارے ساتھ جتنا برا کیا اس کی وجہ سے میں دوزخ کا حقدار ہوں۔ خدا نے مجھے سزا دی ہے! اس نے مجھ سے میرے دو جوان بچے چھین لیے، بالکل نئی کار میں ان کو مار دیا۔ یہ خدا کا انصاف ہے۔ یہاں اب میرا کوئی کام نہیں۔ مجھے بھی جلد ہی موت آ جائے گی۔ میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا۔ مجھے معاف

کر کے، رحلت میں میری مدد کرو!''

فنتاس چند مہینے بعد مر گیا، بھوک ہڑتال کر کے۔

دوسرا محافظ حمیدوش تھا، اور وہ بھی خاصا کمینہ تھا۔ وہ گر گیا تھا اور لنگڑا کر چلتا تھا۔ جب اس نے اپنے دوست فنتاس کا حال دیکھا تو وہ ڈر گیا اور وہ بھی ہم سے معافی مانگنے لگا۔ دوسرے محافظوں نے کچھ نہیں کہا، وہ ہم سے ممکن حد تک دور ہی رہتے تھے۔

جب ایسا کہنا ہی فضول ہو کہ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آج صبح سے ہی میں اچھا محسوس نہیں کر رہا ہوں، مجھ پر موسم کا اثر ہے...'' تو پھر اس پر سوچنے یا کچھ کہنے سے کوئی فائدہ؟ علالت ہماری نارمل، مستقل حالت کا نام تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ یومِ آخر تک، فنا کے دن تک ہماری صحت کو ہر روز تھوڑا تھوڑا کر کے زوال پذیر ہونا تھا۔ ہماری دو ہی ملکیتیں تھیں: ہمارے جسم اور ہمارے ذہن۔ میں نے بہت جلد یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے ذہن کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تدبیر کروں گا۔ میں اپنے شعور اور ذہن کی حفاظت کرنے لگا۔ بدن تو غیر محفوظ تھا، ایک طرح سے یہ ہمارے غاصبوں کے حوالے تھا، ان کے اختیار میں تھا۔ ہمیں چھوئے بغیر وہ ہمارے جسموں کو ایذائیں پہنچاتے تھے، ہمیں طبی مدد سے محروم کر کے وہ بڑی آسانی سے ہمارے ایک دو عضو ناکارہ کر دیتے تھے۔ لیکن مجھے اپنے افکار کو ان کی رسائی سے دور رکھنا تھا: اسی میں میری اصل بقا تھی، میری آزادی، میری امان، میری نجات۔ زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ذہن کی تربیت کروں، جمناسٹک کروں۔ میں نے ان یادوں کو دور کر دیا تھا، بلکہ مٹا ڈالا تھا جو مجھے پاتال کی جانب کھینچ سکتی تھیں۔ اسی طرح میں نے یہ طے کیا کہ ارفع خیالات سے میں اپنے ذہن کی کسرت کیا کروں گا۔ کامل اور انتہائی ارفع خیالات سے۔ سینکڑوں بار کی کوشش کے بعد ایک ہی موقع مجھے یہاں سے نکلنے کا ملا۔ شمار کرنے کو یہ کچھ زیادہ نہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کوئی معجزہ نمودار ہوا تو مجھے دوسرا جنم ملے گا، چالیس یا پچاس کی عمر میں مجھے ایک نئی زندگی ملے گی۔ لیکن میں اسی پر تکیہ نہیں کر رہا تھا۔ میں اس بھٹ سے نکلوں گا اور مکہ جا کر کعبے کے سنگِ اسود کو چھو سکوں گا۔ یہی حجر الاسود ہے — ازل کا پتھر جس پر ابراہیم کے قدموں کے نشان اب بھی موجود ہیں، وہ پتھر جس کی یادیں آفرینش کی یادوں سے وابستہ ہیں — اسی کے خیال نے مجھے بچائے رکھا، میں اس پر آج بھی

ایمان رکھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا میرے خیالات کیونکر اس علامت پر مرکوز ہوے۔ میں نے اسی کو نقطۂ حوالہ بنالیا، رات کی دوسری سمت جھانکنے کا روشندان۔ میں اس روشندان کو کھولتا اور کسی تابناک شے کا دیدار کرتا تھا۔

اپنے ذہن کو مرتکز رکھنے کے عمل نے، آہنگِ تنفس پر قدرت نے، ایک خیال اور پیکر نے، ہزاروں میل کی دوری پر واقع ایک مقدس پتھر نے، جو میری کوٹھری سے صدیوں کے فاصلے پر تھا— اپنے جسم کو بھولنے میں میری مدد کی۔ میں نے اسے محسوس کیا، اس کو چھوا، لیکن پھر بتدریج اس سے خود کو علیحدہ کر لیا۔ اپنے ذہن کو مرکوز کر کے میں خود کو دیکھتا کہ سکون سے بیٹھا ہوا ہوں، کمر جھکی ہوئی، پسلی کی ہڈیاں ابھری ہوئی، گھٹنے مڑے ہوے جو دو نکیلی کیلوں جیسے لگتے۔ میں اپنا مشاہدہ خود ہی کیا کرتا، اور محسوس کرتا کہ میں ایسی روح ہوں جو اس غار کے اوپر منڈلا رہی ہے۔ ایسا محسوس کرنے میں ہمیشہ کامیاب ہو جاؤں، ایسا نہیں تھا۔ ذہن کو مرکوز کرنے کی کوشش کا مطلب یہ نہیں تھا کہ لاتعلقی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ اس کا انحصار سردی یا گرمی پر تھا۔ میں جانتا تھا کہ طبیعی حالات خود کو اس دوزخ سے باہر دیکھنے کی میری خواہش کے ساتھ جنگ آزما ہیں۔ دوزخ کوئی تصور نہیں تھی، تیرہ بختی کو دفع کرنے کا کوئی منتر نہیں تھی۔ دوزخ تو ہمارے اندر اور ہمارے اردگرد ہر طرف موجود تھی۔ یہ ہمارے لیے مفید بھی تھی: یہ ہمیں اپنی قوت کا اندازہ لگانا، ہماری قوتِ مزاحمت کی پیائش کرنا اور عالمِ بالا کو متصور کرنا سکھاتی تھی —جو غیر مرئی ہے، جس میں ہم اس وقت پناہ لے سکتے تھے جب ہمیں پرانی جراحتوں پر ایک اور تازہ زخم دیا جاتا تھا، ان جراحتوں پر جن کا خون کبھی خشک نہیں ہو پاتا تھا۔

دن اور راتیں، یہی تھے جو اس جہنم میں ہماری ملکیت تھے۔ ہم خود ہی گرسنگی کے دن تھے اور خود ہی بے خواب راتیں۔ بیشتر اوقات ہم اس کے سوا کچھ نہ تھے۔ چنانچہ جن لوگوں نے خود کو ہلاکت میں ڈالا وہ اپنے دنوں اور اپنی راتوں کو ختم کر رہے تھے۔ وہ قابلِ رحم واہموں کا شکار نہ تھے۔ یا شاید جس نے انھیں خودکشی پر مجبور کیا وہ ان واہموں کا زہر ہی تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ امید سے کوئی واسطہ رکھنے سے انکار بھی وقار کی بات ہے۔ زندہ رہنے کے لیے امید چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ اس ایقان کا مفید پہلو یہ تھا کہ اس کا کوئی واسطہ ان لوگوں سے نہ تھا جنھوں نے ہمیں زندان میں ڈالا تھا۔ یہ ان کی حکمتِ عملی پر منحصر نہیں تھا، بلکہ صرف ہماری قوتِ ارادی پر منحصر تھا: رجائیت کے ساتھ جینے کی مجنونانہ

عادت کو ترک کرنے کی قوتِ ارادی پر۔

حقیقت کی مکمل نفی کا نام ہی امید تھا۔ ان لوگوں کو جنھیں ہر شخص چھوڑ چکا تھا، یہ یقین کس طرح دلایا جاسکتا تھا کہ یہ غار ان کی زندگیوں میں محض قوسین میں بند ہونے جیسا ہے، یہ کہ یہ آزمائش کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گی، اور یہ کہ وہ یہاں سے جب جائیں گے تو قوی تر، بہتر انسان ہوں گے؟ امید ایک ایسا دروغ تھی جس کے خواص سکون بخش تھے۔ اس پر غلبہ پانے کے لیے ہمیں ہر روز بدترین حالات سے گزرنے کی تیاری کرنی ہوگی۔ وہ لوگ جن کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، جلد ہی ایک شدید اور جان لیوا مایوسی کا شکار ہو گئے۔

10

میرا پتا کمزور ہو چکا ہے۔ اس میں حد سے زیادہ پت بنتے ہیں جس سے تلخ سیال کا سیلاب سا امڈتا رہتا ہے۔ صفرے سے شکم سیر رہتا ہوں۔ ہر طرف سے تلخ بو آتی ہے۔ میرا حلق خشک رہتا ہے اور اس پر ایک کڑوی پرت چڑھی رہتی ہے۔ میری زبان سخت پڑ چکی ہے، میرا تھوک چپچپا ہے۔ میں خود کو صفرے کی ناند میں ڈوبتا ہوا دیکھتا ہوں۔ میں اس میں غوطہ لگاتا ہوں، انجان ہاتھ مجھے اس میں ڈبو رہے ہیں۔ سبز بلغم سے میرا سر بھر چکا ہے۔ جب میرے نتھنے بھر جاتے ہیں، میں چھینکتا ہوں۔ بلغم کو نکالنے کے لیے زور لگا کر ناک سنکتا ہوں، لیکن میرے اعضا سخت پڑ چکے ہیں۔ میرے جوڑ اکڑ چکے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے انھیں کسی نے کس کر باندھ دیا ہے تاکہ ہل نہ سکیں۔ وہ بے مصرف ہو چکے ہیں۔ میرے ہاتھ ٹیڑھے میڑھے ہو گئے ہیں اور انگلیاں مچھلی پکڑنے کے کانٹے جیسی لگنے لگی ہیں۔ میں اپنے سارے بدن میں سیال کے مدو جزر اٹھتے گرتے محسوس کرسکتا ہوں۔ میری جلد تپتی رہتی ہے۔ ایک لحظے کو لگتا ہے کہ سیال جم کر ٹھوس شے میں تبدیل ہو گیا ہے اور میرے شکم کے اردگرد حرکت کر رہا ہے، اور کسی کٹیلے تار کی مانند میرے شکم کو چیر رہا ہے۔

درد سے میری فکر عجیب طرح سے واضح ہو گئی ہے۔ میں تکلیف میں ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ اس معاملے کو کیسے ختم کیا جائے۔ مجھے قے کرنی ہوگی، جو پت میرے تمام اعضا پر حملہ آور ہوئے ہیں

انھیں باہر نکالنا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے مجھے اپنے منہ میں انگلیاں ڈالنی ہوں گی، زبان کو دبانا ہوگا، اور پھر تالو پر اوپر کی طرف دباؤ ڈالنا ہوگا۔ اگر آپ صحت مند ہیں تو ایسا کرنا بچوں کا کھیل ہے، لیکن جب آپ کا جسم تکلیف سے فالج زدہ ہو چکا ہو، ذرا سی بھی حرکت کرنا سنگھرش سے کم نہیں۔ میں اپنی پیٹھ اور سر کو دیوار سے ٹکا کر بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا داہنا بازو شل ہو چکا ہے۔ یہ دیوار کے ساتھ یوں چپکا ہے جیسے گوند سے جوڑ دیا گیا ہو۔ مجھے اس کی سختی کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کرنا ہوگا اور اسے اپنے منہ تک لے جانا ہوگا۔ کہنا آسان ہے، لیکن کرنا انتہائی مشکل۔ میں ساری توجہ اپنے بازو پر مرکوز کر دیتا ہوں۔ میرا سارا جسم اسی بازو میں سما چکا ہے۔ میں ایک بازو ہوں جو فرش پر بیٹھا ہوا ہے، اور کھڑے ہونے کے لیے مجھے اپنی تمام قوت کو بروئے کار لانا ہوگا۔ بازو کو گھورتے ہوئے میں اپنے منہ کے تلخ ذائقے کو بھول سکتا ہوں، یہاں تک کہ اپنے جوڑوں کے شدید درد کو بھی دھیمی چبھن میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ مجھے درد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ میں اس کو دور جاتے محسوس کرتا ہوں، لیکن یہ غائب نہیں ہوتا۔ میں اپنا سر جھکانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ یہ میرے ہاتھ کے نزدیک آسکے۔ میں گلے میں پت کو اٹھتے ہوئے محسوس کرتا ہوں، یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں تیزی سے سیدھا ہو جاتا ہوں، جس سے میرا سر دیوار سے جا ٹکراتا ہے۔ سر کو سہار کر، میں اپنا حربہ بدلتا ہوں: اس کے برعکس، اب میرا ہاتھ منہ تک جائے گا۔ اس کام میں گھنٹوں لگیں گے۔ میں اپنا دوسرا ہاتھ سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ میں پسینے میں نہا جاتا ہوں۔ پسینے کے قطرے میرے ہاتھ پر گرتے ہیں۔ سب سے اہم کام حرکت نہ کرنا ہے، اور اپنے بازو کو اٹھانے کے سوا کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچنا ہے۔ میں تصور کرتا ہوں کہ ایک چھوٹی سی کرین چھت سے نیچے آئی، اس نے میرے ہاتھ کو جکڑا، اور بالکل درستی سے میرے منہ تک لے گئی۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا؛ کچھ نہیں ہے۔ اندھیرے میں دیکھ تو نہیں سکتا لیکن کم از کم یہ اندازہ لگا لیتا ہوں کہ کہاں کیا ہے۔

وقت اب بے معنی ہے۔ یہ کچھ زیادہ ہی سست رفتاری سے گزرتا محسوس ہوتا ہے، اور بظاہر بازو اور ہاتھوں کو مفلوج کرنا اس کا کام ہے۔ کئی گھنٹوں کی سعی کے بعد جب میں انگلیاں اپنے منہ میں ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں، تو اس چھوٹی سی فتح کا ذائقہ محسوس کرنے کے لیے ایک ثانیے کو رک جاتا ہوں۔ پھر میں اپنی زبان پر دباؤ ڈالتا ہوں۔ لیکن پت یکبارگی باہر نہیں آتے۔ جب پہلی دھار میرے

ہاتھ پاؤں اور فرش پر بہتی ہے تو میں راحت کے مارے کانپنے لگتا ہوں۔ پھر سے دباؤ ڈالتا ہوں، اور زیادہ زور کے ساتھ قے ہوتی ہے۔ لگتا ہے پت کا چشمہ ابل پڑا ہے۔ میرے گلے میں سوزش ہونے لگی ہے، میری آنکھیں اپنے حلقوں سے نکلی پڑ رہی ہیں، اور میرے گالوں پر آنسو بہہ رہے ہیں۔ مجھے اس زہر سے نجات مل چکی ہے جو میرے معدے کی نلکی کو جلا رہا تھا۔

میں خود کو ہلکا پھلکا اور بھوکا محسوس کرتا ہوں، وجد میں آنے کو تیار ہو جاتا ہوں، ایک ایسی کیفیت میں جس میں کسی وجود یا شے کی محبت کا کوئی رشتہ میرے پاؤں کی زنجیر نہیں بنے گا۔ میں ہر شے کو پیچھے چھوڑ دیتا ہوں، خود کو اور اپنے ساتھیوں کو بھی، جنھیں اس اذیت کا ذرا بھی اندازہ نہیں جس سے میں ابھی گزرا ہوں۔ میں تنہائی کے شکوہ کی رفعت پر ہوں، جہاں صرف ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہی میری تنہائی کے بام سے گزر سکتے ہیں۔ اور پھر میں خیرہ کن حیرانی سے دوچار ہوتا ہوں، جس کے بعد مجھ پر شدید تھکن حاوی ہو جاتی ہے۔ یہاں میں کسی کی دسترس میں نہیں۔ میں شادماں طائر کی مانند اڑان بھر رہا ہوں۔ جہاں میں نے اپنے جسم کو چھوڑا ہے میں وہاں سے زیادہ دور نہیں جاتا، اس خوف سے کہ وہ اسے لے جائیں گے اور دفنا دیں گے۔ جسم کافی آہستہ آہستہ سانس لے رہا ہے، یہ سچ ہے، اور پتا نہیں چلتا کہ وہ فوت ہو چکا ہے یا حالتِ غشی میں ہے۔

جس لمحے مجھے یہ احساس ہوا کہ میری کوٹھری کی بدبو عرش تک پھیلی ہوئی ہے، میں جان گیا کہ اپنے جسم میں لوٹ آیا ہوں۔ ترفع کی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر میں اپنے معمول کے مسائل سے سنگھرش کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی رسد کے پانی سے میں نے فرش دھو دیا۔ اس رات میں کھڑے کھڑے سویا۔ سردی میری ایڑیوں سے لے کر کھوپڑی تک پہنچی، اپنے حساب سے رکتی ہوئی، شکم میں خاصی دیر تک ٹھہری، جہاں وہ تھوڑا سا غرور، نفرت اور استہزا چھوڑ گئی۔ میرے تصور میں سردی کا ایک چہرہ تھا، اور اس کے ہاتھ — بلکہ ناخونی پنجے تھے۔ اس نے میرے فوطوں کو نوچا۔ میں دوہرا ہو گیا، اس کی نیش کو برداشت کرنا ہی بہتر ہے۔ سردی میرے بدن میں چہل قدمی کرتی رہی، جس سے بدن کپکپانے لگا۔ میں گیلی زمین پر لوٹنے لگا۔ میں سردی کو غالب نہیں آنے دے سکتا تھا۔ میں نے اپنی پرانی کسرتیں شروع کر دیں، دل ہی دل میں اپنے معمول کی نماز پڑھنے لگا۔

ہر اچھے مسلمان کو روزانہ پانچ مرتبہ نماز پڑھنی ہوتی ہے۔ میں پاک نہیں تھا۔ اتنا پانی بھی نہیں تھا جس سے وضو کر سکتا۔ میں خاموشی سے پڑھتا رہا، اس قادرِ مطلق کو، حاکمِ انصاف کو پکارتا رہا، اللہ اور اس کے پیغمبروں کو، سمندر اور آسمان کو، پربتوں اور سبزہ زاروں کو یاد کرتا رہا۔

"مجھے نفرت سے بچائے رکھنا، اس تخریبی جوش سے، اس زہر سے، جو دل اور جگر کو چیر دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں، دوسرے ذہنوں سے انتقام لینے کی خواہش پر مجھے قابو پانا ہوگا۔ نفرت کو بھولنا ہوگا، مسترد کرنا ہوگا، نفرت کے جواب میں مزید نفرت کرنے سے انکار کرنا ہوگا۔ مجھے اس سے اوپر اٹھنا ہوگا۔ مفلوج کرنے والے اس بندھن کو توڑنے میں میری مدد کر۔ اس جسم کو بلا ماندگی چھوڑنے میں مدد کر جو اب جسم جیسا نہیں، بلکہ مسخ ہڈیوں کا الجھا ہوا ڈھیر لگتا ہے۔ دوسرے پتھروں کی طرف میری آنکھوں کی رہنمائی کر۔ یہ تاریکی مجھے راس آتی ہے: جب میں اپنے اندر جھانکتا ہوں، تو اپنی حالت کے انتشار کے آر پار زیادہ واضح دیکھ سکتا ہوں۔ میں اب دنیا میں موجود نہیں، حالانکہ میرے پاؤں سیمنٹ کے مرطوب فرش پر اب بھی یخ ہو رہے ہیں۔ میری گردن کی پشت اس لیے ایذا پہنچاتی ہے کیونکہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ نہیں — مجھے کوئی درد محسوس نہیں ہوتا۔ یقیناً، میں درد محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ میں اب کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا۔ میری دعائیں مستجاب ہو چکیں۔ میں علیل نہیں ہوں۔ مجھے کتنی بھی تکلیف کیوں نہ ہو، میں یہاں نہیں رہوں گا۔ یا اللہ! میں نے تجھی سے سیکھا ہے کہ صحت مند جسم ہمیں دنیا کی خوبصورتی سے واقف کراتا ہے۔ یہ جسم اس افسوں کی بازگشت ہے جو حیات اور روشنی سے جنم لیتا ہے۔ یہ روشنی ہے۔ زندگی میں روشنی۔ جب یہ روشنی زندگی سے چھین لی جاتی ہے، سیاہ غار میں تنہا محبوس کر دی جاتی ہے، تو یہ کسی شے کی بازگشت نہیں بنتی، کسی شے کو منعکس نہیں کرتی۔ تیری رضا سے، میری یہ جوت کبھی بجھائی نہ جا سکے گی۔"

11

ہوا دان کے بالکل اوپر آسمان کا ایک ٹکڑا معلق ہوگا، اس ترچھے سوراخ کے اوپر جو ہوا کو تو اندر آنے دیتا ہے روشنی کو نہیں۔ میں نے آسمان کی موجودگی کو محسوس کیا اور اسے لفظوں اور تصویروں سے بھر

دیا۔ میں نے ستاروں کو اِدھر اُدھر ہٹایا، تاکہ تھوڑی سی جگہ اس روشنی کے لیے بھی بنا سکوں جو میرے سینے میں محبوس تھی۔ میں نے اس تابنا کی کو محسوس کیا۔ روشنی کو کیونکر محسوس کیا جاسکتا ہے؟ جب باطنی روشنی نے میری جلد پر ہاتھ پھیرا اور اسے حرارت بخشی تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے آئی ہے۔ میں اسے تادیر اپنے پاس روک نہ سکا۔ اس کے بجائے اب خاموشی اتر آئی۔ یہ ہماری نابینا آنکھوں پر اچانک ہی اتر آتی تھی۔ یہ ہمیں اپنے حلقے میں لے لیتی، جیسے ہمارے کاندھوں پر کسی کے سکون بخش ہاتھ آٹکے ہوں۔ اگر یہ گراں بھی ہوتی، جیسے دھول سے بھری ہوئی، تو بھی مجھ پر اچھا اثر ڈالتی تھی۔ یہ مجھ پر کبھی گراں نہیں گزری۔ کہنا چاہیے کہ یہ خاموشی کئی طرح کی تھی۔

رات کی خاموشی۔ یہ ہمارے لیے ضروری تھی۔

اس ساتھی کی خاموشی جو بہ آہستگی ہمیں چھوڑتا جاتا تھا۔

وہ خاموشی جو ہم ماتم کے لیے اختیار کرتے تھے۔

اس خون کی خاموشی جو ہماری رگوں میں سست روی سے بہتا تھا۔

وہ خاموشی جو ہمیں بتاتی تھی کہ بچھو کہاں کہاں ہیں۔

ان تصویروں کی خاموشی جو ہمارے ذہن میں متواتر چلتی رہتی تھیں۔

محافظوں کی خاموشی جو بیزاری اور معمول کی مظہر تھی۔

یادوں کی ان پرچھائیوں کی خاموشی جو جل کر خاک ہو چکی تھیں۔

ثقیل آسمان کی خاموشی جس سے چھن کر کوئی اشارہ ہم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

عدم موجودگی کی خاموشی، زندگی کی بصارت کش عدم موجودگی کی خاموشی۔

سب سے دشوار، سب سے ناقابلِ برداشت خاموشی روشنی کی خاموشی تھی۔ ایک قوی اور تہہ در تہہ دبیز خاموشی۔ ایک خاموشی رات کی تھی، ہمیشہ یکساں۔ اور پھر روشنی کی خاموشی تھی۔ ایک طویل اور بے پایاں عدم موجودگی کے سبب۔

باہر، نہ صرف ہمارے غار کے اوپر بلکہ اس سے بعید تر بھی، زندگی تھی۔ ہم اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ لیکن اس کا تصور کرنا مجھے اچھا لگتا تھا تاکہ نسیان کی وجہ سے مر نہ جاؤں۔ صرف تصور، یاد نہیں کرتا تھا۔ زندگی، حقیقی زندگی، وہ گندا چیتھڑا نہیں جو زمین پر پھڑپھڑاتا پھرے۔

زندگی اپنے نفیس ترین حسن میں، میرا مطلب ہے اپنی سادگی میں، اپنے شاندار معمولی پن میں: رونے کے بعد مسکراتا ہوا بچہ؛ نہایت تیز روشنی میں جھپکتی ہوئی آنکھیں؛ کپڑے بدل کر خود کو دیکھتی ہوئی عورت؛ گھاس پر سویا ہوا آدمی؛ میدان میں دوڑتا ہوا گھوڑا؛ رنگ برنگے پنکھ لگا کر اڑنے کی کوشش کرتا ہوا آدمی؛ پتھر پر بیٹھی عورت پر سایا کرنے کی کوشش میں جھکتا ہوا درخت؛ سرکتا ہوا سورج، اور جب دھنک تک نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی: اپنا بازو اٹھا پانے کا نام ہے، اپنی گردن کی پشت کو مسلنے، مزہ لینے کی غرض سے انگڑائی لینے کا نام ہے، اٹھ کر بے مقصد ٹہلنے کا نام ہے، لوگوں کو اپنے قریب سے جاتے، رکتے اور اخبار پڑھتے دیکھنے کا نام ہے — یا بس اپنی کھڑکی پر یوں ہی بیٹھے رہنے کا نام ہے کیونکہ کرنے کو کچھ اور نہیں، اور خالی بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔

میں نے تصور کیا کہ زندگی کی گہما گہمی تمام رنگوں کو دکھانے والی مشکال ہے، یہ کہ جب یہ درختوں کے بیچ سے گزرتی ہے تو شور کرتی ہے۔ یہ فرار زیادہ دیر کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی سی مہلت تھی جو مجھے اور زیادہ سخت مراقبے کے لیے تیار کر دیتی تھی۔

موت کے بعد بھی، یا زیادہ درست یہ ہوگا کہ گھر والوں کے مجھے مردہ تصور کر لینے کے بعد بھی، مجھے اپنے گھر کی جانب سفر کرنا تھا۔ اس کی یادوں کی تڑپ کے **بغیر۔ جذباتی** ہوئے **بغیر**۔

اپنی ماں کو کس طرح تسلی دوں، انھیں **بتاؤں کہ میں سنگھرش** کر رہا ہوں، مزاحمت کر رہا ہوں؟ انھیں کس طرح خبر ہو کہ میرا یہ عزم کہ اپنا سر اونچا رکھوں گا، اپنے وقار کو بچاؤں گا — یہ قوتِ ارادی انھی کی ودیعت ہے؟ مجھے ان کی بینش پر اعتبار تھا۔ چنانچہ دل ہی دل میں میں نے ان سے باتیں کیں، ایک خط کے ذریعے جو میں شاید کسی دن لکھ سکوں گا، کاغذ پر، پنسل سے؛ ایسا خط جو کسی ہرکارے کے ذریعے ان تک پہنچے گا، یا شاید ڈاک سے۔

''میری عزیز ترین یما، میری پیاری مومتی۔ میں آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں اور اپنا سر آپ کے کاندھے پر رکھتا ہوں۔ میری صحت اچھی ہے، آپ فکر نہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے آپ مجھ پر فخر کرتی ہوں گی۔ میں آپ کی خوش نامی ہوں۔ میں نہ صرف مزاحمت کر رہا ہوں، بلکہ ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے میں دوسروں کی مدد بھی کر رہا ہوں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ میں بھولنے کی سخت کوشش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو مشکل سے نیند آتی

ہے، کہ آپ بھی اسی پہاڑ پر چڑھتی اترتی رہتی ہیں۔ اپنے دل کا خیال رکھیے، دوائیں لینا مت بھولیے۔ پرسکون رہیے، کہ خود کو پریشان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں ایک طویل سرنگ سے گزر رہا ہوں۔ میں مسلسل چلتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ جب اس کی حد پر پہنچوں گا تو روشنی دیکھ سکوں گا۔ یہ روشنی نرم ہونی چاہیے کیونکہ حد سے زیادہ چمک مجھے اندھا کر دے گی۔ آپ وہاں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی روٹی لائیں گی، گرم گرم روٹی جو آرگان درخت کے بیجوں کے روغن میں ڈبوئی گئی ہوگی۔ بس یہی روٹی میں آئندہ کئی روز تک کھاتا رہوں گا تاکہ میرا شکم مانڈ کی غذا کے علاوہ دوسری طرح کے کھانے بھی ہضم کرنے کے قابل ہو جائے۔ آپ اونی کمبل لے کر آئیں گی جس میں آپ مجھے بچے کی مانند لپیٹ لیں گی، جیسا کہ آپ میرے بچپن میں کرتی تھیں۔ میں بہت ہلکا ہو چکا ہوں۔ آپ مجھے اپنی بانہوں میں اٹھا لیں گی، اور آپ مجھے نانی اماں کا گنتی کا گیت گا کر سنائیں گی۔

''میں جتنا دور جاتا ہوں، میرا اعتماد بڑھتا جاتا ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں، خدا سے باتیں کرتا ہوں، سنگِ اسود کے خواب دیکھتا ہوں، اور بعض اوقات اپنا قالب چھوڑ دیتا ہوں اور باہر سے اپنا مشاہدہ کرتا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس متانت کو پانا سب سے مشکل کام ہے۔ یہ بھی میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا، جب ابا آپ کو زخم دیا کرتے تھے، گھریلو اخراجات کی ساری رقم اڑا دیتے تھے، تو آپ ہم سب کو یکجا کرتی تھیں، اور اس شخص کو برا بھلا کہے بغیر، آپ ہمیں اپنے تئیں ذمے دار ہونا سکھاتی تھیں۔ ان کی غضب ناکیاں، ان کی ناانصافیاں آپ کو چھو کر بھی نہیں گزرتی تھیں۔ آپ اس سے بلند تر تھیں۔ میں آپ کا معترف تھا، کیونکہ آپ اپنا سکون اور توازن ہمیشہ برقرار رکھتی تھیں۔ اکیلا موقع جب آپ اپنے قابو میں نہ رہیں وہ تھا جب آپ کا چھوٹا بیٹا، آپ کا 'میسنا' بھاگ گیا تھا۔ آپ نے ہم سے کہا تھا، 'تم سب میرے بچے ہو، لیکن وہ میری آنکھیں ہے، میری سانس ہے۔' اور وہ بھی آپ کا پرستار تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب وہ اسکول سے گھر لوٹا، اپنا اسکول بیگ پٹخا، اور آپ کی تلاش میں باورچی خانے کی طرف چلا، جیسا کہ ہمیشہ کرتا تھا۔ ملازمہ نے اسے بتایا کہ کسی انتظامی مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ رباط گئی ہوئی ہیں۔ آپ کی غیر حاضری کو ناقابلِ برداشت پا کر اس نے خود کو کپڑوں کی اس الماری میں بند کر لیا جس میں آپ کے ملبوسات لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے

آپ کی خوشبو کو محسوس کیا، آپ کے عطر کو، جو آپ کے کپڑوں میں بسا ہوا تھا۔ اس طرح خود کو بند کر کے، روتے روتے اسے بخار چڑھ گیا۔ شام کو دیر سے جب آپ گھر لوٹیں، آپ سیدھی کپڑوں کی الماری کی طرف گئیں اور اسے بخار میں تپتے پایا۔ وہ درد کی شدت سے اینٹھ رہا تھا۔ اس پر اپینڈیسائٹس کا حملہ ہوا تھا۔ آپ نے وہ رات ایمرجنسی روم میں گزاری، اور پلک جھپکائے بغیر رات بھر جاگنے کے بعد صبح کام پر چلی گئیں۔ آپریشن کامیاب رہا اور سب کچھ پھر سے ٹھیک ہو گیا۔

''اوہ مما، میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ اسے جس طرح سے کھلاتی تھیں، مجھے وہ برداشت کرنا مشکل لگتا تھا۔ آپ گوشت چباتی تھیں، اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کا نوالہ بناتی تھیں، پھر اس کے منہ میں ڈال دیتی تھیں۔ اور وہ، چوزے کی مانند، اپنی چونچ کھولتا اور کھانے کو نگل جاتا تھا۔ وہ ہنستا تھا، ہمارا مذاق اڑاتا تھا، جبکہ آپ، اپنی خوشی میں گم، اس سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہم بھی ہنستے تھے، آپ دونوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ آپ اس بچے پر وہ تمام محبتیں نچھاور کرتی تھیں جو خود آپ کو کبھی نہیں ملیں۔ ہم بچے تھے، یہ بات نہیں سمجھ پاتے تھے۔

''ابا نے کئی بار آپ کو منانے کی کوششیں کیں۔ وہ آتے تھے، ان کے آگے آگے مخزنی ہوتے تھے، پاشا الکلاوی کے دربار کے سابق ملازمین، ہاتھوں پر تحفوں کے انبار لیے، یورپ سے درآمد شدہ طرح طرح کے شاندار ملبوسات، قند سے بھری ہوئی سینیاں اٹھائے۔ وہ یوں آتے تھے جیسے پہلی بار آپ کا ہاتھ مانگنے آئے ہوں۔ اپنے ہاتھ پشت پر باندھے وہ آگے بڑھتے اور آپ سے معافی کی التجا کرتے۔ آپ دروازہ نہیں کھولتی تھیں، اور نیم وا کھڑکی میں سے مخزنیوں کو حکم دیتیں کہ جاؤ اور یہ سب اشیا دوسری بیوی کے گھر لے جاؤ۔ انھوں نے آپ کو بتائے بغیر دوسری شادی کر لی تھی، جبکہ آپ غلام جیسی، تنہا، بے یارومددگار، اور بے سہارا رہ گئی تھیں۔

''آپ قابلِ تحسین تھیں۔ آپ نے عزم کے ساتھ اس شخص کو لوٹا دیا تھا۔ آپ کبھی کمزور نہیں پڑیں، کبھی ہار نہیں مانیں۔ آپ کے کردار کی مضبوطی ہی آپ کی آزادی تھی۔ وقار کے ساتھ جینے کے آپ کے عزم نے آپ کو مضبوط تر کیا، زیادہ حسین بنایا۔ میں سب سے بڑا لڑکا تھا، اور میں نے ہر ممکن حد تک آپ کا بار کم کرنے کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ میں فوج میں بھرتی ہو گیا، اس کی محبت میں نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس نے مجھے تنخواہ، تربیت، گھر بستر کی ضمانت دی تھی۔ میں آپ کو اپنی تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ

بھیجنے پر مصر رہا۔ میں بخوشی ایسا کرتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، جبکہ میں بہت قلیل رقم پر گزارہ کرسکتا ہوں۔

''ابا کو یہ معلوم تک نہ تھا کہ میں ملٹری اکیڈمی میں داخل ہو چکا ہوں۔ ان کا تقرر پہلے ہی محل میں ہو چکا تھا، اپنے سلطان کی زندگی کو مزید پر مسرت بنانے کے لیے۔ شاہی محل نے ان کی دوسری بیوی بچوں اور گھر بار کی دیکھ بھال کا ذمہ لے لیا تھا۔ میں اپنے باپ کو صرف ٹیلی وژن پر دیکھتا تھا، جب شاہی سرگرمیاں نشر کی جاتی تھیں۔ وہ پس منظر میں کھڑے نظر آتے، اہم اور چوکس۔ خداداد صلاحیت کا حامل یہ اسکالر، اپنی غیر معمولی یادداشت کے ساتھ، ملک کے مقتدر ترین آدمی کے دربار کا مسخرہ، شعبدہ باز، مضحک، پیشہ ور تفریح کار بن چکا تھا۔ گو کہ ہمارے باپ نے خود ہمیں کبھی نہیں ہنسایا، لیکن ان کی حسِ مزاح زبردست تھی۔ گھر کی حیثیت ان کے لیے بس عبوری تھی۔ وہ اپنی سوجھ بوجھ اور حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے۔ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ جب وہ اپنے دوستوں کو شاعری سناتے تو میں انھیں تحسین کے ساتھ دیکھتا تھا۔ وہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے۔ زروجواہر اور روایتی زیوروں کے بارے میں بھی وہ اتنا جانتے تھے جس کا جاننا ضروری تھا۔ لیکن وہ ایک برے شوہر اور مفقود باپ تھے، یا بس اپنے آپ میں از حد مگن، لڑکیوں میں دلچسپی رکھنے والا انسان — خصوصاً بیس سال سے کم عمر کی لڑکیوں میں — اور وضع دار ملبوسات میں، جشن وسرور، لذت کوشی اور خوش وقتی میں مشغول رہنے والا انسان۔ وہ ہر شے کو ہلکا سمجھتے اور تنہائی کو بالکل برداشت نہ کرسکتے تھے۔

''اوہ مما، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ اداس ہیں۔ خود کو سمجھایئے کہ میں سفر میں ہوں، ناقابلِ عبور دنیا کو دریافت کر رہا ہوں، خود کو دریافت کر رہا ہوں، ہر گزرتے دن کے ساتھ خود سے آشنا ہو رہا ہوں جسے آپ نے تراشا ہے۔ آپ کا شکریہ۔ میں آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں۔ اس ایذا کے لیے جو میں نے اس معاملے میں الجھ کر آپ کو پہنچائی ہے، دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوں۔ جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتی ہیں، اس معاملے میں کسی نے کیڈٹوں اور جونیئر افسروں سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ یقیناً ہمیں شک تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے، لیکن سعادت مند فوجیوں کی طرح ہم اپنے قائدین کا حکم بجالائے۔ صرف آپ ہیں جن سے میں کہہ سکتا ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ میرا یقین کریں گی: میں نے کسی کو نہیں مارا۔ میں نے ایک بھی گولی نہیں چلائی۔ میں بری طرح خوفزدہ تھا۔ میں نے بندوق سے بس نشانہ

سادھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ابا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے یہ کبھی پتا نہ چل سکے گا کہ میں انھیں قتل ہونے سے بچانا چاہتا تھا یا گولی مارنا چاہتا تھا۔ یہ سوال مجھے پریشان رکھتا ہے۔ مجھے اذیت پہنچاتا ہے۔ اگر میں کوئی بات بار بار کہتا ہوں، تو صرف اس لیے کہ میں دائروں میں گھومنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔

''پیاری اماں، اب آپ سے رخصت لینی چاہیے۔ میں آپ کی دردناک آہیں سن رہا ہوں...''

مصطفیٰ، کوٹھری نمبر آٹھ، چیخ چلا رہا تھا۔ کیا اس کو بچھو نے ڈنک مار دیا تھا؟ وہ سیمنٹ کے فرش سے بار بار اٹھتا اور درد کے مارے پھر گر پڑتا تھا۔ اس کا درد بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی، اس لیے ہم محافظوں کو بھی پکار نہیں سکتے تھے کہ وہ اس کی مدد کے لیے وقرین کو، جو ہمارا زہر چوس ماہر تھا، اس کی کوٹھری میں جانے دیں۔ اس کی چیخوں کی آواز سے بیدار ہو کر کریم نے وقت کا اعلان کیا: ''صبح کے تین بج کر سولہ منٹ ہوئے ہیں، جمعرات، 25 اپریل 1979 کا دن ہے۔''

روتا ہوا مصطفیٰ چیخا، ''میں مرنا چاہتا ہوں، لیکن اس طرح نہیں، بچھو کے ڈنک سے نہیں! نہیں۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے، طے کرنے کا اختیار بھی مجھی کو ہونا چاہیے! نہیں، نہیں۔ زہر بڑی خوفناک شے ہے۔ میں سانس نہیں لے سکتا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں مر رہا ہوں... اے میرے اللہ! اس وقت کیوں؟ رات کے اس سناٹے میں کیوں؟''

وقرین نے اس سے کہا کہ جب تک محافظ ناشتے کی کافی لے کر آئیں تب تک برداشت کرو۔ انھیں وقرین کو اسے بچانے کی اجازت دینی پڑے گی۔

بیچارے مصطفیٰ نے اپنی سی کوشش کی۔ لیکن بے ہوش ہو گیا۔ ہمیں لگا کہ مر گیا ہے۔ الغربی نے اس کے لیے تلاوت تک شروع کر دی۔ ہم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مصطفیٰ نے بہت زور سے چیخ ماری۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

صبح کو جب محافظ آئے، ہم نے ایک بار پھر قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ انھوں نے وقرین کو کوٹھری نمبر آٹھ میں جانے دیا۔ وہ کراہت کے مارے لڑکھڑاتا ہوا لوٹ آیا۔ غار کے سارے بچھو مصطفیٰ کے گلتے ہوئے جسم سے چپٹے ہوئے تھے۔ تالیاں بجا بجا کر اور پیر پٹخ پٹخ کر ہم نے کمانڈنٹ کو پکارا۔

ان مہلک کیڑوں کا خاتمہ ضروری تھا۔

''کمانڈنٹ، کمانڈنٹ، کمانڈنٹ...''

بے چارے خاموش مزاج مصطفیٰ کے لیے، جس کے ساتھ ہم لوگ تاش کھیلتے تھے، وقرین کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا اچھا کھلاڑی تھا، اور ہم میں سے کسی کے بھی مقابلے میں بہتر ڈھنگ سے جانتا تھا کہ صرف تخیل کی مدد سے خود کو کس طرح خوش رکھا جائے۔ بے شک، ہمارے پاس تاش نہیں تھے، لیکن تیرہ نمبر بور اس نے تخیلی تاش گڑھ رکھے تھے۔ ہم چاروں مل کر کھیلتے، اور ہم نے تاشوں کا ایک گیم ایجاد کر رکھا تھا: کہانیاں سناتے ہوئے غلاموں کے نمبر ملانے کا گیم۔

کمانڈنٹ نظر نہیں آیا، لیکن محافظوں نے پیش رفت کی، اور جب ہم مصطفیٰ کی لاش کو اس کی کوٹھری میں غسل دینے لگے تو محافظ بچھوؤں کو مارنے میں مصروف ہو گئے۔

جب ہم لاش کو باہر نکالنے لگے تو محافظ کپڑے کی کالی پٹیاں لے کر آ گئے: ''تم لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی باہر آ سکتے ہو!'' کسی نے احتجاج کیا، انھوں نے اسے اس کی کوٹھری میں بند کر دیا۔

گزشتہ تدفین کو چھ مہینے گزر چکے تھے۔ ہمارے لیے چلنا مشکل تھا۔ اس بار دن کی روشنی کالی پٹیوں میں سے چھن کر آ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں، کھوپڑی میں، اور جلد میں تکلیف ہو رہی تھی... سارے بدن میں درد تھا۔ ہم گھسٹتے ہوئے آگے بڑھے۔ موح نمبر ایک نے جھک کر کوئی شے زمین سے اٹھائی اور اسے نگل لیا۔ ایک محافظ نے دیکھ لیا اور اپنے ہتھیار سے اسے دھمکانے لگا، ''گھاس تھوکو جو تم نے ابھی کھائی ہے، ورنہ تمھیں مار ڈالوں گا!''

لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ موح ہنس پڑا۔ غضبناک محافظ نے اس کو گدی سے پکڑ لیا اور زمین پر پٹخ دیا۔ دوسرے محافظ نے مداخلت کی اور اسے گولی مارنے سے روکا۔

اس واقعے کے بعد مصطفیٰ کو دفنانے کے لیے ہمیں صرف دس منٹ دیے گئے۔ ایک محافظ بالٹی بھر چونا لے آیا اور اسے مصطفیٰ کی لاش پر بکھیر دیا، تبھی موح قبر میں کود پڑا، اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہی ہو جائے۔ ہم نے اسے قبر سے باہر نکالا۔ اس کے پیروں پر تھوڑا سا چونا لگ گیا تھا۔ ہنگامے کی آواز سن کر محافظِ اعلیٰ دوڑا چلا آیا۔ ہم اس کے قریب پہنچنے کی آوازیں سن سکتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کو اور قسمت کو کوس رہا تھا جس نے اسے اس لعنت زدہ مقام پر بھیج دیا تھا۔

''تم لوگ آخری بار باہر آئے ہو۔ اب کوئی جنازہ نہیں اٹھے گا۔ بس، بہت ہو گیا۔ سب ختم! اب تم لوگ اپنی کوٹھریوں میں سے کبھی باہر نہیں نکلو گے۔ واحد طریقہ جس سے تم باہر نکلو گے یہی ہے کہ تمھاری آنکھیں بند ہو چکی ہوں۔ پہلے پیر نکالے جائیں گے، اور پلاسٹک کے تھیلے میں بند کیے جاؤ گے۔ تمھاری وجہ سے مجھے جیل ہوتے ہوتے بچی ہے! رباط میں ہیڈکوارٹر سخت غصے میں ہے۔ تم لوگ اب کبھی باہر نہیں آؤ گے۔ کبھی نہیں۔ ابد تک نہیں۔ تمھیں ہمیشہ کے لیے تاریکی کی سزا ہو چکی۔ تمھارے لیے اب کوئی روشنی نہیں۔ احکامات بالکل واضح بھیجے گئے ہیں: تاریکی، سوکھی روٹی اور پانی۔ ٹھیک ہے، اب یہاں سے دفع ہو جاؤ! او میرے اللہ! میں نے ایسا کون سا بڑا گناہ کیا تھا کہ مجھے اس جہنم میں بھیج دیا گیا؟ اور میں اب بھی نمازیں پڑھتا ہوں، رمضان میں روزے رکھتا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں... پھر مجھے کیوں گمراہ روحوں کے اس گلّے کا چرواہا بنایا گیا؟''

اس دن کے بعد، موح دھیرے دھیرے جنون کا شکار ہوتا گیا۔ طعام کے وقت ہم اسے اپنی ماں سے باتیں کرتے ہوئے سنتے تھے۔

''ماں، یما، کھانا تیار ہے۔ آؤ کھا لیں... اوہ تم ہل نہیں سکتیں۔ میں آ رہا ہوں، تمھارے لیے ٹرے میں لے کر آ رہا ہوں۔ میں نے تمھاری پسند کا طنجیہ بنایا ہے۔ آج ہم پرہیز نہیں کریں گے۔ گوشت خاصا نرم ہے۔ میں نے اسے کوئلوں پر پکایا ہے۔ یہ سچ مچ طنجیہ مراکشی* ہے: بھیڑ کے بچے کا گوشت، زیتون کا تیل، کالی مرچ، نمک، ادرک اور خشک لیموں۔ دھیمی آنچ پر بھنا ہوا، بڑا لذیذ ہے! زیادہ چکنا نہیں۔ تم جانتی ہو، گوشت کو طنجیہ میں ڈالنے سے پہلے ساری چربی ہٹا دیتا ہوں۔ ہم بھیڑ اور بکرے کے گوشت کو ایک جیسا ہی سمجھتے ہیں — خیر، میں ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ گوشت بھیڑ کے بچے کا ہے۔ لو تھوڑی سی روٹی لو۔ آہ، روٹی نہیں چاہیے؟ اوہ، ذیابیطس ہے! ذرا سونگھ کر دیکھو کتنا اچھا بنا ہے؟ ٹھیک ہے، اب مزید سبزیاں نہیں۔ مانڈ نہیں: یہ بہت موٹا کر دیتے ہیں۔ ماں، تم فکر نہ کرو، منھ کھولو۔ میں جانتا ہوں تمھاری نظر بہت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کم بخت شکر کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے! یہ لو، میں نے بہت ہی نرم ٹکڑا تمھارے لیے اٹھایا ہے۔ کھاؤ۔ آرام آرام سے چباؤ۔ اوہ، تم کو پینے کے لیے کچھ چاہیے۔ ارے تمھیں تو ہچکیاں آنے لگیں۔ اوہ ڈیر! میری ماں کو ہچکیاں آ رہی ہیں۔ دوستو! کیا کروں؟ میری ماں کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے! میری مدد کرو... دیکھو، یہ پیو... کیسا

جھلملاتا ہوا پانی ہے! تم کو یہی تو اچھا لگتا ہے۔ بلبلے چھوڑتا ہوا پانی۔ افوہ! اب بہتر ہے۔ تم جانتی ہو مما، تمھاری ان ہچکیوں سے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ لگتا ہے جیسے موت دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ ابا مر گئے کیونکہ کھاتے وقت کوئی چیز ان کی غلط نلکی میں چلی گئی تھی۔ یہ لو، ایک نوالہ اور کھاؤ۔ ذرا آہستہ سے... اوہ لیموں میں نمک زیادہ ہے! چلو، لیموں کو اس میں سے نکال لیتا ہوں۔ اوہ بینگن کھانا چاہتی ہو؟ لیکن مما، طنجیہ میں بینگن ڈالا ہی نہیں ہے۔ کیا تم بھول گئیں؟ تم نے ہی تو سکھایا تھا کہ طنجیہ کس طرح پکاتے ہیں۔ چلو، کھالو۔ گوشت کا بس ایک اور نوالہ۔ نہیں، اپنا منھ کھولو۔ میں فورک سے کھلاتا ہوں۔ ہاں، ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ بچوں کی طرح کھانے پر شرم آ رہی ہے؟ لیکن مما، فالج کا اثر تمھارے بازو تک پہنچ گیا ہے۔ تم اپنے ہاتھ سے نہیں کھا سکتیں۔ خوش بختی سے، میں یہاں موجود ہوں۔ تمھاری مدد کرنا اور تم کو کھلانا میرا فرض ہے۔ بچے اسی لیے تو ہوتے ہیں۔ میں تمھارا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔ میں دوسروں سے زیادہ تمھارا خیال رکھتا ہوں۔ لیکن وہ جو کچھ کر سکتے ہیں، کرتے ہیں۔ میں، میرے پاس تو زمانے بھر کی فرصت ہے۔ کرنے کو کچھ بھی نہیں۔ اب میں کام نہیں کرتا۔ چھٹی پر ہوں۔ فوج کو اب ہماری ضرورت نہیں۔ ہم کچھ لوگ ہیں جو بیرکوں سے دور اپنی چھٹیاں گزار رہے ہیں۔ میرے پاس بہت وقت ہے، اسی لیے میں تمھارے لیے طنجیہ بنانے چلا آیا، جو تمھیں اس قدر مرغوب ہے۔ اب تم کو بھوک نہیں لگی ہے؟ آہا، مجھے کھلانا چاہتی ہو؟ نہیں، مجھے بھوک نہیں۔ مجھے دودھ پینا ہے۔ ہاں، ہاں یما! مجھے اپنی چھاتی دو۔ مجھے تمھارے دودھ کی بہت ضرورت ہے، مجھے سر اپنی چھاتی پر رکھنے دو، اور تم اپنی انگلیوں سے میرے بالوں کو سہلاؤ... معافی چاہتا ہوں، تمھارے ہاتھ تو حرکت نہیں کر سکتے، اور اب میرے سر پر بال بھی نہیں بچے ہیں۔ میں اب تم سے رخصت لیتا ہوں۔ شام کے لیے میں ہلکے پھلکے ناشتے کا منصوبہ بنا رہا ہوں: آرٹی چوک — جانتی ہو، وہ ننھے پودے جن میں تیز دھار والے پتے ہوتے ہیں۔ پانی میں ابال کر، ایک پیالہ دودھ اور سیب کے ساتھ۔ اگر رات کی گرانی سے بچنا ہے تو شام کو ہلکی پھلکی غذا لینی چاہیے۔ اب میں جا کر برتن دھوتا ہوں۔ کوئی شک نہیں، مراکش کا میمنا بہت چربیلا ہوتا ہے۔ بس میں یہ آخری بار طنجیہ بنا رہا ہوں۔"

بے چارہ موح کھانے کے وقت ہر روز ہمیں بے تحاشا ہنساتا تھا۔ ہم اسے بولنے دیتے تھے۔

اس کے پاس اپنے دل کو کھولنے کا بس یہی ایک راستہ تھا۔ لیکن اس سے کھانوں کے لیے ہماری رغبت شدید ہو جاتی تھی... یہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ ہم اب کھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ آخر تو ہم اس بے ذائقہ مانڈ اور خشک نان کے عادی ہو چکے تھے۔ موح جب اہر میمو میں تھا تو ظاہر ہے کہ اچھا طباخ تھا، اور اس کی باتوں سے ہمارے منہ میں پانی آ جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اسے چپ کرا دوں، لیکن ایسا کرنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا۔ وہ اپنا شعور کھوتا جا رہا تھا۔ وہ خود تو کھانا چھوڑ چکا تھا لیکن اپنی تخیلی ماں کو کھلاتا رہتا تھا۔

''مما،'' ایک دن وہ کہنے لگا، ''آج صبح بازار میں نہ تو گوشت ملا، نہ کوئی سبزی ہی۔ بازار ہی غائب ہے۔ وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ میں نے اپنی بائیک نکالی، لیکن لڑکوں نے اس کے ٹائروں کی ہوا نکال دی تھی۔ مجھے بس مانڈ والی چیزیں ہی ملیں: سفید لوبیا، چھولے، خشک باقلا۔ نان باسی اور سخت ہے۔ اسے پانی میں بھگونا پڑے گا، ورنہ یہ کھانے کے قابل نہیں۔ تم کہتی ہو تمھیں بھوک نہیں لگی۔ ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔ مجھے اب بھوک لگتی ہی نہیں۔ اب پکانے کی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ تم کہتی ہو تمھیں سارڈین مچھلی کے کباب چاہییں، پیاز اور جعفری کے ساتھ۔ بڑا اچھا خیال ہے۔ لیکن یہ روغنی ہوتی ہے، مما۔ اس سے آپ کے جلن ہونے لگے گی۔ نہیں۔ میری رائے ہے ابلی ہوئی بانگرا مچھلی آلوؤں کے ساتھ کھائیں۔ نہیں — ابلی ہوئی نہیں: طنجیہ میں ڈال کر۔ آلو، پیاز، زیرے والی چٹنی، لال مرچ، تھوڑے سے مسالے، تھوڑا سا دھنیا اور لہسن کے چند جووں کے ساتھ۔ اب اس کو دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ میں اب بندرگاہ کی طرف جا رہا ہوں تاکہ ضرورت کا سامان خرید لاؤں۔ کشتیاں لنگرگاہ میں داخل ہو رہی ہیں۔ میں عبدالسلام کے پاس دیکھتا ہوں — وہی جو ہمارے مچھوارے کا عم زاد ہے۔ اوہ، کوئی سمندری ہلسا نہیں ہے۔ زیادہ کانٹوں والی ہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ابا تو مچھلی کا کانٹا نگلنے سے ہی مرتے مرتے بچے تھے۔ آہ! سچ ہے، اسی نے انھیں مارا۔ میں بھول گیا تھا۔ معافی چاہتا ہوں، مما۔ خیر، مجھے جانا ہوگا۔ لیکن مت پوچھو کہاں جا رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ہر جمعے کو مسجد کے باہر جمع غریبوں کے لیے دلیہ لے جاتا ہوں۔ آج جمعہ ہے۔ اوہ! تم خیرات کا کھانا بنانا بھول گئیں، تم نے دلیہ تیار نہیں کیا۔ ان بے چارے غریبوں کو اچھا نہیں لگے گا جو وہاں میرا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ میں مسجد نہیں جاؤں گا۔ نماز گھر پر ہی پڑھوں گا...''

وقت گزرنے کے ساتھ اس کی آواز دھیمی سے دھیمی ہوتی گئی۔ وہ بڑبڑاتا تھا، بدبداتا تھا، دانت پیستا تھا، آہیں بھرتا تھا۔ نخوردہ کھانا اس کی کوٹھری میں جمع ہوتا اور سڑتا رہا۔ اس نے نہانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے وہ دیواریں کھرچتا رہتا۔ اب اس میں قوت نہیں بچی تھی، اور نہ ہی آواز۔ اس نے خود کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا، کیونکہ کچھ عرصے سے وہ کھانا چھوڑ چکا تھا اور اپنی ماں کو بھی نہیں کھلاتا تھا۔ اس کی موت کو آنے میں کئی ہفتے لگے۔

12

ہنسنا۔ ہم لوگ گھسے پٹے لطیفے سنا سنا کر ہنسنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ تفریح کی ہماری یہ کوششیں اکثر زبردستی کی ہوتی تھیں، ایک طرح کی اعصابی ہکلاہٹ سی۔ شدید مایوسی کی ہنسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے، ایک بو ہوتی ہے، اور ہماری یہ خوشیاں ہمیں اور زیادہ پریشانی میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ ہمیں اور زیادہ اذیتیں دیتی تھیں۔ مصطفیٰ ذومعنی باتیں کرتا اور بذلہ سنجی دکھاتا، ہمیں عرفیتیں دیتا۔ بعض اوقات ہم اس کا مزہ لیتے۔ لیکن خوبصورت، بے ساختہ، رسوا کن، اونچے قہقہوں سے دور ہی رہے۔ زندگی، مسرت، صحت، عافیت کے پُراعتماد قہقہوں سے دور۔ البتہ اگر ہم نے اپنی حالتِ زار کی عمیق تر سمجھ پیدا کرلی ہوتی تو ہم اس طرح ہنس سکتے تھے۔ لیکن ہم سب کی ضرورتیں یکساں نہیں تھیں، یا مزاحمت کا عزم یکساں نہیں تھا۔

قہقہہ، ایسا زوردار جو بس پھوٹ پڑتا ہے اور مفید ہوتا ہے — صرف کمانڈنٹ کی وجہ سے لگانے کو ملتا تھا۔ وہ کمانڈنٹ جسے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن جس کی موجودگی اپنی اس تاریکی میں خاصی محسوس کر سکتے تھے۔ محافظ اس کے احکامات اور واہموں سے ہمیں باخبر رکھتے تھے۔ ایک دن مفاضل جانوروں کی، خصوصاً کتوں کی عملداری پر بکتا جھکتا، گالیاں دیتا ہوا عمارت میں داخل ہوا:

”خدا کتوں کے مذہب کو اور کتوں سے محبت کرنے والوں کو غارت کرے، جو انھیں اپناتے ہیں اور انھیں اپنے بستروں میں سلاتے ہیں! خدا کتوں کے قبیلے کا اور ان کی آئندہ ساری نسلوں کا خاتمہ

کرے، ان کو ایک بڑے سے کڑھاؤ میں ڈالے تا کہ یہ کبھی پلٹے پیدا نہ کر سکیں یا ہمارے پیارے وطن کی اس درماندہ جیل میں ہمیں تنگ کرنے نہ آ سکیں! بھاگ، بھاگتا رہ، تیرا نصیبہ بھی انھی جیسا ہو جنھوں نے ہمارے سیدنا کو مارنے کی کوشش کی! جلدی کر، حرامزادے! تو ٹرٹرائے گا، تجھے ہائیڈروفوبیا ہوگا، اور پھر میں خود تجھے کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈالوں گا۔ ابھی تو بس کمانڈنٹ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں، تجھے دوسروں کے ساتھ قید کر رہا ہوں۔ تجھے کوٹھری میں ڈالا جائے گا، اور دن میں تجھے صرف ایک بار کھانے کو ملے گا، پانی میں ابلی ہوئی سویاں۔''

ہم حیران تھے۔ ایک کتے کو پانچ سال کی سزائے قید! یہ تو عمر قید ہوئی! اس کا مطلب تھا اس نے کسی جنرل کو کاٹ لیا تھا جو جیل کے نزدیک والی بیرکوں کے معائنے کے لیے آیا ہوگا۔

اس کے بعد ہمارے قہقہے لوٹ آئے۔

ہمارے روزمرہ کے معمولات میں تھوڑا سا فرق آ گیا۔ ہم میں سے بعض لوگ کتے کے ساتھ قید کیے جانے پر مغضوب تھے۔ دوسرے لوگ معاملے کے مثبت پہلو کو دیکھ رہے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ اس کا کوئی نام رکھ دیں گے، لیکن طے نہیں کر پا رہے تھے کہ کیا رکھیں۔

''میں، میرا کہنا ہے کہ اس کو کمانڈنٹ کہہ کر پکارا کریں۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ اس میں کمانڈنٹ سے زیادہ انسانیت ہے۔''

''تو پھر ہم اسے ٹونی کہا کریں گے!''

''لیکن ٹونی ہی کیوں؟ یہ تو آدمیوں کا نام ہے۔''

''کوئی وجہ نہیں — کیونکہ سننے میں یہ اطالوی جیسا لگتا ہے، بہت پرکشش — اور پھر یہ بونی کا ہم قافیہ ہے۔''

''نہیں، ہم اسے کیلب کہا کریں گے بس۔ کیلب یا کلیب، یعنی جس طرح فرانسیسی کہتے ہیں۔''

''اور ڈِٹو (Ditto) کیوں نہ کہیں؟''

''تمھارا مطلب ہے وہ ہم جیسا ہے؟''

''ہاں یا نا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ چلو ووٹنگ کرلیں۔''

اور اس طرح کتے کا نام ڈِٹو رکھ دیا گیا اور وہ ہمارے گروہ کا ایسا رکن بن گیا جو غیر اہم نہیں تھا۔ ہم اس کے عادی ہو گئے۔ اسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہم اس کی اپنی کوٹھری میں گھومنے اور دروازے پر دُم پٹخنے کی آہٹیں سنتے۔ بھوک اور پیاس نے اس کو خسیس بنا دیا تھا۔ وہ بھونکتا نہیں تھا، لیکن رِریاتا تھا، جیسے زخمی ہو۔ ظاہر ہے کہ پوری کوٹھری میں ہگتا پھرتا تھا۔ فضلے کے ڈھیر لگ گئے تھے اور اس کی بدبو ہمہ وقت پھیلی رہتی تھی۔ ہمیں کچھ کرنا تھا، اسے کہیں اور بھیجنا تھا، جنگل میں بندھوانا تھا، یا اس سے الگ جیل میں بھجوانا تھا۔ مفاضل راضی تھا، لیکن وہ اس سلسلے میں کمانڈنٹ سے بات نہ کرسکا۔

ایک مہینے کے بعد ڈٹو پاگل ہو گیا، شاید سگ گزیدگی کی بیماری کے سبب۔ اس کی چیخیں ناقابلِ برداشت ہوتی گئیں۔ محافظ کھانا دینے کے لیے اس کی کوٹھری کھولنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ وہ بھوک اور خستگی کے سبب مر گیا۔ اس کی لاش سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ ہم نے مذاق کرنا چھوڑ دیا، ایسا کرنے کی ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

مزاحمت کے لیے ضروری ہے کہ آپ غور و فکر کریں۔ آگاہی کے بغیر، فکر کے بغیر کوئی مزاحمت نہیں ہوسکتی۔ آخر کار ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ کمانڈنٹ کی بے رحمی پر ہنسا نہیں جاسکتا۔ ڈٹو کو ہتھ ٹھیلے پر ڈال کر باہر لے جایا گیا۔ ہمیں نجات ملی۔ اس کی کوٹھری کی صفائی اور جراثیم کش دواؤں کے چھڑکاؤ کی ضرورت تھی۔ محافظوں نے یہ کام ایک ہفتے بعد کیا۔ بظاہر اس تاخیر پر وہ خجل تھے، کیونکہ آہ کھینچ کر مفاضل نے ہمیں بتایا، ''کمانڈنٹ کا حکم تھا!''

اس اپی سوڈ کے بعد — جو مضحک کم، اور بھدا زیادہ تھا — میں پھر سے رات کی خاموشی میں عبادتوں اور مراقبوں کی طرف لوٹ گیا۔ میں نے خدا کو اس کے متعدد ناموں سے پکارا۔ میں آہستگی سے اپنی کوٹھری سے نکل گیا اور سطحِ زمین کو محسوس کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے ہر شے سے کنارہ کرلیا، یہاں تک کہ محسوس کرنے لگا کہ میرا جسم بظاہر شفاف ہو گیا ہے۔ میں عریاں تھا۔ چھپانے کو کچھ نہ تھا۔

دِکھانے کو کچھ نہ تھا۔ اس تاریکی میں صداقت اپنی خیرہ کن روشنی کے ساتھ مجھ پر عیاں ہوئی۔ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں، بس گندم کا ایک دانہ، چکی کے ایک وسیع پاٹ کے نیچے، جو ہمیں ایک ایک کر کے پیستا رہتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سورۃ النور کو یاد کیا اور خود کو یہ آیت دہراتے ہوئے سنا، ''تم دیکھتے ہو کہ اس نور کی تاریکی کس قدر گہری ہے۔ اپنا ہاتھ پھیلاؤ، اور تم اس کو دیکھ تک نہیں سکو گے۔''

میں سوچتا رہا اور سمجھ گیا کہ یکے بعد دیگرے پردے گر رہے ہیں، اور یہ کہ تاریکی ہلکی پڑ رہی ہے، کہ اس کو روشنی کی نہایت مدھم سی شعاع نے چیر ڈالا ہے۔ شاید یہ میرے ذہن کی اختراع تھی، میرا تصور تھا۔ میں نے خود کو قائل کیا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ خاموشی ایک راستہ تھی، اپنے اندر واپسی کا راستہ۔ میں خاموش تھا۔ میری سانسیں، میرے دل کی دھڑکنیں خاموش ہو گئی تھیں۔ میری باطنی عریانی صرف میرا راز تھی۔ کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اسے ظاہر کروں یا اس کا جشن اس بے کس مقام پر مناؤں جہاں پھپھوندی اور پیشاب کا تعفن ہے۔ نہایت وضوح کا کچھ وقت گزار کر میں ایک بار پھر چکی کے پاٹ کے نیچے آ پڑا، جو آہستہ آہستہ گھوم رہی تھی...

13

وہ ایڈجوٹنٹ تھا، ایک معمولی ایڈجوٹنٹ لیکن اہرمیمو کا سب سے طاقت ور نان کمیشنڈ افسر — کمانڈنٹ اے کا دایاں ہاتھ۔ طول قامت، مضبوط، دھنسی ہوئی آنکھوں اور گھورتی ہوئی، چبھتی نگاہوں والا۔ انڈوچائنا میں تعینات رہ چکا تھا۔ اس کا نام عطا تھا۔ وہ بربر تھا، میدانی علاقے کا، کوئی ایسا شخص جو کسی بے نام جگہ سے تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور غالباً اس کے بچے بھی تھے۔ لیکن اس کی کسی بات سے اس کی خانگی زندگی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا کوئی گھر بار نہیں، دوست نہیں۔ آہنی درشتی اور سخت نظم وضبط کا پابند آدمی۔ لوگ اس سے ڈرتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور کیمپ میں اس کی آواز سب سے اونچی تھی۔ اپنے منڈے ہوئے سر کی وجہ سے وہ امریکی ٹیلیویژن جاسوس کوجاک (Kojak) جیسا دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ اکیڈمی کے سارے افسروں سے زیادہ اہم ہے، اور یہ کہ اس کے اور کمانڈنٹ کے مابین کوئی عہد تھا، خفیہ رابطہ، کوئی ایسی بات جو ہمارے

لیے حیرانی اور پریشانی کا باعث تھی اور جسے سمجھنے کی ہم نے کبھی کوشش نہیں کی تھی۔

وہی تھا جو ہمیں محل تک لے کر گیا تھا۔ کمانڈنٹ ہمارے آگے آگے تھا۔ ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ عطا اس کے ساتھ ریڈیو کے ذریعے رابطے میں تھا۔ صخیرات کی خونریزی کے بعد عطا غائب ہو گیا۔ بیشتر افسران ہلاک کر دیے گئے تھے۔ وہ فرار ہو گیا تھا۔ لگتا ہے کسی نے اس کو دوڑ کر محل کے اندر جاتے دیکھا تھا۔

جب میں زندان سے رہا ہوا تب پتا چلا کہ اس وقت کیا ہوا تھا۔ عطا دراصل دوڑ کر محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا تھا، شاہ کو ڈھونڈنے نہیں بلکہ ہمارے دو ساتھیوں کے پیچھے، دو کیڈٹ جو سوئمنگ پول ایریا سے پرے اپنی مرضی سے چلے گئے تھے۔ وہ اسے ایک کمرے میں، جو شاید شاہی رہائش کا حصہ تھا، ایک عورت کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے مل گئے: ایک نے اسے فرش پر پٹخ رکھا تھا اور جبراً اس کی ٹانگیں کھولے ہوئے تھا، جب کہ دوسرا اپنی رائفل کی نال کے سرے کو اس کی شرم گاہ میں گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کیڈٹ جو اپنی بندوق سے اس کی آبروریزی کر رہا تھا، غصے سے آنکھیں انگارہ کیے ہوئے چیخ کر کہہ رہا تھا، ''جہاں وہ اپنا ذکر گھساتا ہے، وہیں میں اپنی رائفل گھسیڑوں گا۔''

عطا ان کے پیچھے آن کھڑا ہوا اور دہاڑا، ''بالقَم!'' (اٹینشن!)۔ دونوں کیڈٹ خودکار عمل میں اچھل کر اٹینشن ہو گئے۔ عطا نے ان کو محل سے باہر جانے کا حکم دیا اور اس عورت سے معذرت کی جو نیم بے ہوش تھی۔ پھر وہ باورچی خانوں کے اس راستے سے باہر نکل گیا جو ساحل کی طرف کھلتا تھا۔

دونوں کیڈٹ گولف کورس کے مدخل پر گرفتار کر لیے گئے۔ عطا کئی دن کے بعد گرفتار کیا جا سکا۔

وہ ہمارے گروہ میں شامل تھا۔ شروع کے چند مہینوں تک وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ اس کا رویہ بالکل واضح تھا: ''میں ہار گیا، مجھے قیمت ادا کرنی ہے۔''

ایک دن محافظ اسے لینے آئے۔ وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ بھٹ سے جاتے وقت اس نے ہم سے فرانسیسی میں کہا، ''آدیو!'' (الوداع)۔

''الوداع!'' ہم نے بھی پیچھے سے پکارا۔

ہم نے سوچا تھا کہ اس کا وقت آ گیا۔ یا تو فی الفور سزائے موت یا پھر عقوبت کا لاانتہا سلسلہ۔ ہمارے پاس جاننے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے، ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ کیے بعد

دیگرے ہم سب کو مار دیں گے، اور اس فہرست میں عطا کا نمبر پہلا ہے۔

بعد میں پتا چلا، کسی ایسے شخص سے جو وہاں موجود تھا، کہ اس کی کہانی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھی جتنی ہم نے سوچی تھی۔ انھوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اسے کسی گھر میں لے گئے جہاں اس کو نہانے، شیو کرنے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا۔ اس شام انھوں نے اسے بہترین کھانا فراہم کیا۔ اس نے صرف روٹی کھائی۔ اسے معلوم تھا کہ مہینوں تک صرف مانڈ والے کھانوں پر گزارا کرنے کے بعد اسے زیادہ نہیں کھانا چاہیے۔ وہاں پلنگ موجود تھا لیکن اس نے فرش پر سونے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن اس نے نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، لباس پہنا اور اعلان کیا، ''میں اپنے اللہ کے پاس جانے کو تیار ہوں۔''

اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ ایک نوجوان کیپٹن کی معیت میں دوسرے سپاہی ڈیوٹی پر آئے، وہ عطا کو صخیرات لے گئے، اس کے ہاتھوں میں پیچھے کی جانب ہتھکڑی ڈال کر اور سر پر سیاہ جوٹ کا غلاف چڑھا کر۔ اتنے نزدیک رہ کر اس کی حفاظت کی جا رہی تھی جیسے انھیں خطرہ ہو کہ اس کی جان لینے کی کوشش کی جائے گی۔ وہ اپنا سر اونچا کر کے چل رہا تھا، اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا، کوئی خدشہ ظاہر نہیں کیا کہ اسے اپنے ساتھ کیا کچھ واقع ہونے کا خدشہ ہے۔

دوسرے محافظ آئے اور اسے محل کے اس کمرے میں لے گئے جہاں اس نے ایک عورت کو آبروریزی سے بچایا تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی سجاوٹ، وہی قالین، وہی سیاہ چمڑے کا صوفہ۔ وہ وہاں سارا دن کھڑا رہا۔ انھوں نے اس کے سر سے سیاہ غلاف ہٹا لیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ رات کو وہ اس کے لیے کھانا لے آئے۔ اس نے محافظوں سے کہا کہ وہ اس کی ہتھکڑی پشت سے بدل کر سامنے کی سمت لگا دیں۔ اپنے کیپٹن سے مشورہ کر کے انھوں نے ایسا ہی کیا۔ صرف اس لیے تاکہ وہ کھانا کھا سکے۔ اس نے فقط روٹی کھائی اور پانی پیا۔ وہ قالین پر پسر گیا، اور محافظ اس کی نگرانی کرتے رہے۔ اس نے انھیں اشارہ کیا کہ اس کے ہاتھ پھر سے پشت پر باندھ دیں۔ ایک بار پھر مشورہ۔ درخواست منظور ہوئی۔

اسے نیند بالکل نہیں آئی۔ رات کے کوئی دو بجے، کیپٹن اسے بلانے آیا۔ وہ کمرے سے چلے گئے۔ مسلح محافظ اس کے نزدیک رہے۔ دوسرا حکم ملا۔ اسے کمرے میں واپس لایا گیا۔ جب کیپٹن نے

اس کی آنکھوں کی پٹی ہٹائی اور ہتھکڑی کھولی تو عطا نے خود کو سلطان کے روبرو کھڑے پایا، کوئی تیس قدم کے فاصلے پر۔ سلیوٹ کر کے وہ اٹینشن کھڑا ہو گیا، اور چونکہ سلطان نے اسے راحت سے کھڑے ہونے کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے تمام سوال وجواب کے دوران عطا اٹینشن کی حالت میں اکڑا کھڑا رہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمھیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''نہیں، عالی جاہ۔''

''کیا تمھیں یاد ہے کہ اس کمرے میں کیا ہوا تھا۔''

عطا نے سوال پر بظاہر غور کیا۔

''جی ہاں، عالی جاہ۔''

''مجھے ان دونوں جانوروں کے نام چاہییں جو تمھیں یہاں ملے تھے۔''

عطا بالکل بھی متذبذب نہیں ہوا۔ خاموش رہا۔

''عالی جاہ کے سوال کا جواب دو!'' کیپٹن نے حکم دیا۔

خاموشی۔

''اگر تم ان دونوں کے نام بتا دو گے تو آج رات تم اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ ہو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''مجھے معاف فرمائیں، عالی جاہ۔ **میں ان کے نام نہیں جانتا۔**''

''یقین سے کہہ سکتے ہو؟''

''جی ہاں، عالی جاہ۔''

''تم اپنی زندگی بچانا نہیں چاہتے۔ بہت بری بات ہے۔''

سلطان غائب ہو گیا، اس کے پیچھے اس کے معاون بھی چلے گئے۔

محافظوں نے عطا کو گھیر لیا۔ کیپٹن نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس نے کپڑے کو بہت سختی سے باندھا، جیسے غصے میں ہو۔ اس نے جوٹ کا سیاہ غلاف پھر سے اس کے سر پر چڑھا دیا اور ہتھکڑی پہنا دی۔ عطا میں ذرا سی بھی لرزش نہیں ہوئی۔ وہ سیخ کی مانند سیدھا کھڑا رہا، موت کے گھاٹ اترنے کو یا جیل میں واپس جانے کو تیار۔

کیپٹن شکا یٔبد بدایا، ’’ان دونوں خنزیروں کو کیوں بچا رہے ہو؟‘‘

عطا کچھ نہیں بولا۔

نصف شب کو اسے کہیں لے جایا گیا۔ کہا گیا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے اسے گولی ماردی گئی۔ اس کے متعلق اگر کوئی کچھ جانتا ہے تو صرف اتنا ہی کہ وہ تازمامرت واپس نہیں لوٹا، اور یہ کہ وہ مر چکا ہے۔

14

اگر الغربی کا مشن مخصوص حالات میں بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرنا تھا، اگر کریم کو وقت کا محافظ چنا گیا (ہم اسے یا تو کیلنڈر کہتے تھے یا بولتی گھڑی)، اگر وقرین بچھوؤں کا اسپیشلسٹ تھا تو میں قصہ گو تھا۔ میرے ساتھیوں نے اتفاقِ رائے سے اس عہدے پر میرا انتخاب کیا تھا، شاید اس لیے کہ ان میں سے بعض کو معلوم تھا کہ میرے والد معما گو اور داستان گو تھے، یا محض اس لیے کہ انھوں نے مجھے احمد شوقی کا، جو امیر الشعرا کہلاتا تھا، کلام پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ اس کی ’ازہار الشر‘ (گلہائے شر) اور ’امیر الصغیر‘ (ننھا شہزادہ) مجھے زبانی یاد تھیں، لیکن وہ **مجھ سے ’الف لیلہ ولیلہ‘ سننا** چاہتے تھے۔ اس کا میں نے مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن اس کی بعض کہانیوں **سے واقف تھا جو جُحا** (جسے جوحا بھی کہتے ہیں) سے منسوب ہیں۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے بار بار کہا کہ میں اس کتاب سے آشنا نہیں لیکن انھوں نے یقین نہیں کیا اور اصرار کرتے رہے کہ اسی کی کہانیاں سناؤں۔ عبدالقادر، نمبر دو، چھوٹا سا جھینپو آدمی تھا جو اکثر سرگوشیوں میں بات کرتا تھا۔

’’مجھے کوئی کہانی سناؤ‘‘ اس نے التجا کی، ’’ورنہ مر جاؤں گا...‘‘

’’لیکن قادر، کوئی بھی کہانی جو تمھیں سناؤں گا، اصل میں وہ قوت نہ دے سکے گی جو تمھیں جینے کے لیے، یا یہ ساری زیادتیاں برداشت کرنے کے لیے چاہیے جو وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، وہ قوت دے گی۔ مجھے الفاظ کی ضرورت ہے۔ میں خواب دیکھتا ہوں، انھیں سننے کے،

اپنے ذہن میں ان کا استقبال کرنے کے، انھیں تصویروں میں ڈھالنے کے، انھیں چرخ کی طرح گھما کر، ان کو پُرحرارت رکھ کر۔ اور اس فلم کو تب دیکھتا ہوں جب میں اذیت میں مبتلا ہوتا ہوں، جب مجھ پر پاگل ہونے کا خوف سوار ہوتا ہے۔ شروع ہو جاؤ، بخیل مت بنو، منھ کھولو، بات کرو، کہانی سناؤ، اگر ضرورت پڑے تو کوئی کہانی بنو، لیکن ہمیں اپنے تخیل کا تھوڑا سا حصہ دے دو۔"

مجھے سچ مچ افسوس تھا کہ میں نے الف لیلہ کی کہانیاں کیوں نہیں پڑھیں۔ یہ تو بس اتفاق کا معاملہ ہے: ہم خود سے کہتے رہتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت وقت ہے، اور کچھ کتابیں بعد میں پڑھنے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں... اور پھر ان کو پڑھنا بھول جاتے ہیں۔ میرے باپ کا کتب خانہ بہت وسیع تھا۔ اس کا ایک بڑا حصہ عربی کے ان مخطوطوں کے لیے مخصوص تھا جو اس نے جمع کیے تھے، بقیہ حصے میں فرانسیسی اور انگریزی کی کتابیں تھیں۔ اگرچہ اس نے یہ ساری کتابیں نہیں پڑھی تھیں، پھر بھی انھیں خریدنا اور شیلف میں سجانا پسند کرتا تھا۔ اس نے کتابوں کی ازسرِنو جلدیں بندھوائی تھیں اور انھیں موضوعات کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ میری ماں اس پر معترض تھی کیونکہ ان کے پاس ہماری نصابی کتابوں تک کے لیے پیسے نہیں تھے جبکہ ہمارا باپ مخطوطوں کی تلاش میں کتابوں کی دکانیں کھنگالتا، جن کے لیے وہ اکثر بھاری قیمتیں ادا کرتا۔ لیکن کتابوں سے گھرے رہنا ہماری تعلیم میں اہم موڑ ثابت ہوا۔ میرے سارے بہن بھائی کتابوں اور کتب بینی سے شغف رکھتے ہیں۔

لنچ کے بعد — بلکہ مانڈ کے ظہرانے کے بعد — مکمل خاموشی چھا گئی۔ میں نے ہر شخص کی توقع کا اندازہ کرلیا۔ میں نے کہانی شروع کی، یہ سوچے بغیر کہ میں کیا سنانے والا ہوں اور اس کا خاتمہ کس طرح ہوگا۔

"کسی زمانے میں ایک امیر آدمی تھا — اتنا امیر کہ اسے خود پتا نہ تھا کہ اس کے پاس کتنی دولت ہے۔ لیکن وہ اول درجے کا کنجوس مکھی چوس تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں لیکن دونوں میں سے کوئی بھی اسے اولاد نہ دے سکی۔"

جیل کی ایک دور افتادہ کوٹھری سے آواز آئی، "ارے! اس کی بیویوں کے بارے میں تفصیل بتاؤ۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ سنہری بالوں والی تھیں یا سیاہ بالوں والی، موٹی یا دبلی پتلی، نیک یا حرافہ..."

''جیسا دیکھنا چاہو بس ویسی ہی تھیں: حسین اور شہوانی، اطاعت گذار اور حیلہ گر، خراب اور بدکردار، دانشمند اور سادہ لوح، محبتیں لٹانے والی، لذت بخش خوشبوؤں میں بسی، اگر چھوڑ دیا جائے تو ظالم، ہمیشہ کی پراسرار۔ اب آگے سنو: اس امیر آدمی کی بیویاں تمام دلکش خوبیوں کی مالک تھیں لیکن بیک وقت بڑی رعب دار بھی تھیں۔ ان میں سے ایک سیاہ بالوں والی فربہ عورت تھی جس کے بال اتنے لمبے تھے کہ اس کے گھٹنوں تک آتے تھے۔ اس کا سینہ بھاری تھا، اتنا بھاری کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں سنبھل نہ سکے۔ جب وہ چت لیٹتی تھی تو اس کی چھاتیاں اس کے دونوں پہلوؤں میں لڑھک جاتی تھیں۔ اس کی آنکھیں پکی ہوئی چیری کی مانند سیاہ رنگ تھیں، اور اس کی نگاہ مرعوب کن تھی—لوگ کہتے تھے کہ وہ پرندوں کو آسمان سے ٹپکا سکتی تھی۔ دوسری بیوی نہایت لاغر اور سرخ بالوں والی تھی۔ تکوں سے اس کی دل کشی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس کا سینہ نہ تو بہت فراخ تھا، نہ بہت تنگ۔ اسے اپنی جلد پر روغن ملنا اچھا لگتا تھا، اور سوار ہو کر اپنے آقا کے بدن پر مالش کرنا پسند کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں روشنی اور موسم کے ساتھ رنگ بدلتی تھیں۔ کبھی وہ ہلکی بھوری لگتیں، کبھی ان میں بنفشئی اور سبز رنگ جھلکنے لگتے۔ کیا میں آگے بڑھوں؟ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس شخص کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ بے ثمر تھا۔ اس نے دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو دکھایا، لیکن کچھ بھلا نہ ہوا۔ ان سب نے ایک ہی مرض تشخیص کیا: خصی پن۔

''جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اپنے تمام تر سیم وزر کے باوجود وہ بیزار ہوتا گیا۔ وارث پانے کی سنک نے اسے جنونی اور شکی مزاج بنا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ایک بیوی نے اس پر کالا جادو کروا رکھا ہے...''

قادر نے بیچ میں روک کر درخواست کی کہ اس امیر آدمی کے محلوں کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں۔ یہ کام آسان تھا۔ میں تفصیلات کے انبار لگاتا گیا اور ایک شاندار خیالی دنیا ایجاد کر لی۔

''تمھیں معلوم بھی ہے کہ محل ایک ایسا مقام ہوتا ہے جہاں تم ہر شے سے زیادہ عافیت محسوس کرتے ہو، جہاں جسم اور روح میں تم پوری طرح ہم آہنگی محسوس کرتے ہو، جس کی اصلی دولت ذہنی سکون ہے۔ باقی سب آرائش محض ہے، ایک ایسا مقام جسے تم اپنی ذاتی پسند کے تصور کے مطابق آراستہ کر سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں راحت کا خاصا سامان ہوتا ہے، لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھو: سچا آرام باطنی سکون سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ چینی یا ایرانی قالین، یا اطالوی سنگ مرمر، یا بوہیمی بلوریں فانوس

خوبصورتی اور شادمانی نہیں لاتے۔ تمھاری خاطر چلو یہ مان لیتے ہیں کہ اس امیر آدمی نے ایک بہت عالیشان محل اپنی امارت کی نمائش کی غرض سے تعمیر کرایا تھا۔ لیکن تمام حریر اور بلور کے باوجود، باغوں اور فواروں کے باوجود، ایک آواز پر حاضر ہونے والے غلاموں کے باوجود، وہ خوش نہیں تھا۔ تم نے دیکھ لیا کہ اس کے پاس ہر شے تھی، کمی تھی تو بس اس شے کی جس کے کروڑوں مرد مالک ہیں: عورت کو حاملہ کرنے کی صلاحیت۔"

میں نے اپنی کہانی کا سرا پھر سے پکڑ لیا جس کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا اور وہ اس عبرت پر جا کر انجام پذیر ہوا:

"بخیل ایسا انسان ہوتا ہے جو ہر شے کو سختی سے پکڑ کر رکھتا ہے: دولت، وقت، جذبات۔ وہ کچھ نہیں دیتا۔ کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کو بھی وہ تخم نہیں دے سکتا تھا جو زندگی کو وجود میں لاتا ہے۔"

میں اب چونکہ قصہ گو بن چکا تھا تو انھیں کبھی قصے سناتا اور کبھی نظمیں۔ کسی دن میں کوئی ناقابلِ یقین قصہ ایجاد کرتا جس میں بے انتہا مبالغے سے کام لیتا تاکہ میرے سامعین اس زندگی سے نہ جا ٹکرائیں جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ کہانی میں تاریخی یا جغرافیائی حوالے بالکل نہ ہوں۔ ماجرا اکثر کسی اسطوری مشرق بعید کے مبہم ماضی میں شروع ہوتا جو ممکن حد تک بکھرا ہوا اور دور دراز واقع ہو۔

اگلے دن کوئی نظم سناتا۔ میں اس فن میں اپنے باپ کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا جس کے پاس فنی مظاہروں کا غیر معمولی ذخیرہ تھا، لیکن میرا حافظہ بہت عمدہ تھا۔ میری چھوٹی بہن کا حافظہ بھی عمدہ ہے — اور ہم شاعری کے مقابلے کیا کرتے تھے، کبھی فرانسیسی میں اور کبھی عربی میں۔

پال ایلوار (فرانسیسی شاعر Paul Eluard) کی 'غیر منقطع شاعری' (uninterrupted Poetry) کے ابتدائی صفحات سناتے ہوئے میں نے اس بند میں غلطی کی اور بعض لفظوں پر اٹک گیا:

آج ایک اور تنہا روشنی
آج (... زندگی ... نہیں) بچپن سارا

زندگی کو روشنی میں بدلتا ہوا

بلا ماضی، بلا مستقبل

آج رویائے شب

دن کی روشنی میں بکھر جائے گا (... ٹوٹ جائے گا... نہیں)

آج میں ساکت ہوں، اور مدام

میں نے بند کو کئی مرتبہ دہرایا، گویا روشنی کا نکتہ میرے ذہن سے چپک گیا تھا جو ہم پر اس قدر بے دردی سے حرام کردی گئی تھی۔ میں نے ہر سطر پر اس طرح چوٹ کی جیسے کوئی سٹھیایا ہوا اسکول ٹیچر اپنے کھوتے ہوئے حافظے کی کگار پر ہو۔ سب میرے ساتھ ''بلا ماضی، بلا مستقبل'' کی گردان کرنے لگے، بعضے عربی میں۔ ہمیں وجد میں لانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا، جیسے ان الفاظ نے ہم پر سحر طاری کر دیا تھا، جن پر ہم یوں اصرار کررہے تھے جیسے یہ ہمارے لیے ہی لکھے گئے ہوں۔ میں نے نظم کا ابتدائی حصہ پھر سے پڑھنا شروع کیا:

روشنی کے نظم کو، نہیں کرسکتا کوئی بھی منتشر

جہاں تنہا میں، صرف میں ہی ہوں

اور وہ جس سے مجھے محبت ہے...

''یہ غلط ہے!'' کسی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''انھوں نے روشنی کا نظم بگاڑنے اور تباہ کرنے کی جسارت کی ہے! ہمارے وطن میں یہ لوگ روشنی کا احترام نہیں کرتے، نہ دن کا، نہ رات کا، نہ بچوں کا، نہ عورتوں کا، نہ میری بوڑھی ماں کا جو اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کے گھر واپس لوٹنے کے انتظار میں مر کھپ گئی ہوگی... نہیں، انھوں نے روشنی کو پیس کر مٹی میں ملا دیا ہے!''

اس اختلال کو ختم کرنے کے لیے غربی نے نماز کے لیے اذان دینی شروع کردی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

میرا خیال ہے کہ میں اور کریم، جو وقت کا ہمارا وفادار پاسبان تھا، ہمارے گروہ کے مصروف ترین قیدی تھے۔ میں نئی نئی کہانیاں گڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان کہانیوں کو یاد کرنا کافی نہیں تھا جو میں نے بچپن میں سنی تھیں۔ مجھے تفصیلات بیان کرنی تھیں، نئے قصے گڑھنے تھے، تبدیلیاں کرنی تھیں، بیچ

بیچ میں رکنا تھا اور سوال کرنے تھے۔ یہ ایک مشکل لیکن دلکش فن تھا۔

قصوں اور نظموں کے بعد میں فلموں کی طرف آ گیا۔ میں نے ان سب فلموں کے پلاٹ از سرِ نو یاد کیے جو میں نے مراکش میں دیکھی تھیں، ان دنوں جب میں روزانہ فلم دیکھنے جاتا تھا۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا جنون سا تھا۔ میں نے فلمساز بننے تک کا منصوبہ بنا ڈالا تھا۔ میری اپنی ترجیحات تھیں، پسندیدہ فلمیں تھیں۔ چوتھی اور پانچویں دہائی کی امریکی فلموں کی طرف میرا رجحان زیادہ تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ بلیک اینڈ وائٹ سے ان فلموں کو ایک ایسی ڈرامائی تاثیر ملتی ہے جو ہمیں بے مزہ صداقت سے بہت دور لے جاتی ہے۔

''دوستو، میں آپ کی توجہ اور مکمل خاموشی چاہوں گا، کیونکہ اب میں آپ کو 1950 کی دہائی کے امریکہ میں لے جا رہا ہوں۔ منظر بلیک اینڈ وائٹ ہے۔ فلم کا نام ہے: A Streetcar Named Desire۔ یہی وہ اسٹریٹ کار ہے جس پر ایک نوجوان لڑکی بلانش دو بوا (Blanche DuBois) سوار ہو کر اپنی بہن اسٹیلا سے ملنے نیو اورلینز آتی ہے۔ اسٹیلا کی شادی مارلن برانڈو سے ہوئی ہے جس کا رول اسٹانلے نے کیا ہے، برانڈو پولش نسل کا ملازمت پیشہ آدمی ہے۔ جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں، امریکہ ساری دنیا سے آ کر بسنے والے تارکین وطن سے آباد ہے۔

''اسٹیلا کس طرح کی عورت ہے؟ وہ ایک خوش مزاج، صحت مند نوجوان عورت ہے۔ وہ اور اس کا شوہر نیو اورلینز کے ایک غریب علاقے میں سادگی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جہاں تک بلانش کا تعلق ہے، وہ اچھے حال میں نہیں ہے۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ اس کے شوہر نے کچھ عرصہ پہلے خودکشی کر لی ہے۔''

''کیوں؟'' کسی نے چلا کر پوچھا۔

''سنو، یہ بات اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ عورت اپنی بہن کے گھر آتی ہے اور اس کو تہہ و بالا کر ڈالتی ہے کیونکہ شوہر کی اچانک ہونے والی موت سے وہ ایک پھندے میں آ پھنسی ہے۔''

''اور مارلن برانڈو؟ وہ کیسا آدمی ہے؟''

''وہ نوجوان ہے، خوبصورت ہے۔ سفید ٹی شرٹ پہنتا ہے۔ اس کا موڈ اکثر خراب رہتا ہے، خصوصاً اپنی سالی کے آنے کے بعد۔ ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا: اسٹریٹ کار ڈیزائر

کے بعد بلانش ایک دوسری گاڑی میں سوار ہوتی ہے جس کا نام 'سیمیٹری' یعنی قبرستان ہے۔ اور وہ ایلیزین فیلڈز کے اسٹاپ پر اتر جاتی ہے۔''

''کیا برانڈو اپنی سالی پر ڈورے ڈالے گا؟''

''نہیں۔ بلانش ناتواں ہے۔ اس کے نفسیاتی مسئلے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ معاشی مشکلات نے اسے اپنا عائلی گھر فروخت کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ پہلے ایک بات کہتی ہے اور پھر ایک دم اس کی الٹ بات کہنے لگتی ہے۔''

''تمھارا مطلب ہے وہ اپنی بات سے پھر جاتی ہے؟''

''بالکل درست۔ جو کچھ وہ کہتی ہے اس پر اسے قابو نہیں۔ اسٹانلے کو پتا چلتا ہے کہ اس کے سوٹ کیس میں نقدی اور زیور ہیں۔ ایک معمولی اسکول ٹیچر کے پاس اتنی دولت معمول سے زیادہ ہے۔ چنانچہ وہ کسی سے یہ تحقیق کرواتا ہے کہ ان کے گھر آنے سے قبل بلانش کیا کرتی رہی تھی۔''

''وہ ضرور فاحشہ رہی ہوگی۔''

''جلدی مت مچاؤ۔ فی الحال تصور کرو کہ ایک میز پر اسٹانلے اور اس کے بعض دوست، جن میں مچ بھی شامل ہے، بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ سگریٹ نوشی کر رہے ہیں، بیئر پی رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، لطیفے سنا رہے ہیں۔ بلانش اندر آتی ہے، سفید لباس میں خوبصورت لگ رہی ہے۔ مچ اپنا سر گھماتا ہے۔ وہ پوکر کھیلنا بھول جاتا ہے۔ کیمرا اس کی نگاہ کا تعاقب کرتا ہے۔ بلانش وہاں سے ایک بار پھر، دوبارہ گزرتی ہے۔ پہلی نظر میں محبت کا معاملہ ہے۔ کیمرا مارلن برانڈو کی طرف لوٹتا ہے۔ آپ اس کے چہرے پر دیکھ سکتے ہیں کہ اسے اچھا نہیں لگا ہے۔ موسیقی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ تاش کا کھیل ختم ہوتا ہے اور سب آدمی میز سے اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اسٹانلے غصے میں ہے۔ وہ بے تحاشا پیتا ہے اور تشدد پر اتر آتا ہے۔ اس کی ٹی شرٹ پسینے سے بھیگ چکی ہے۔ جب نوجوان برانڈو بلانش کی جانب بڑھتا ہے، کیمرے کا کلوز اپ اس کی پشت پر ہے۔ اس کی بیوی مداخلت کرتی ہے۔ وہ اسے پیٹتا ہے، پھر وہ مچ سے الجھ پڑتا ہے۔ دونوں عورتیں فرار ہو کر ایک خاتون دوست کے ہاں پناہ لیتی ہیں۔ اب فلم کا ایک خوبصورت منظر آتا ہے: برانڈو سڑک پر ہے، نشے میں چور، کپڑے پھٹے ہوئے، اپنی بیوی کا نام لے لے کر فریاد کر رہا ہے۔ اسٹیلا اس کے پاس لوٹ آتی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے، اپنے بازو اس کے گرد ڈال دیتا ہے، اور اس کے دامن میں منھ چھپا کر روتا ہے۔''

''ارے، سلیم یہ درست نہیں ہو سکتا! ایک مرد، سچا مرد، خود کو اپنی بیوی کے قدموں پر نہیں گراتا! یہ تم بنا رہے ہو!''

''میں کچھ نہیں بنا رہا ہوں۔ فلم کا اسکرپٹ ٹینیسی ولیمز کے ایک ناٹک سے لیا گیا ہے۔''

''میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔ لیکن میں جہاں سے آیا ہوں وہاں اگر کوئی عورت بھاگ جاتی ہے تو اسے واپس آنے کا حق نہیں رہتا، اور اپنے شوہر کو اپنے آگے گھٹنوں کے بل بٹھانے کا تو اور بھی نہیں۔''

''بہر حال، یہ امریکہ ہے۔ ٹھیک ہے! اب جاری رکھوں؟ اسٹیلا — میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا — حمل سے ہے۔ یہ بات نارمل ہے کہ مرد اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرے، وحشیوں جیسا سلوک کرنے کے بعد تو خصوصاً!''

''اور بلانش کے بارے میں وہ تحقیق؟ وہ طوائف ہے، یہ بات ٹھیک ہے نا؟''

''انکوائری کے بعد ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس کا شوہر نوجوانی میں مر گیا تھا۔ بلانش کا ایسے مردوں سے تعلق رہا جو بستی میں مسافر تھے۔ ہو سکتا ہے کبھی کبھار پیشہ بھی کرتی ہو؛ جو بھی ہو، وہ بیمار عورت ہے۔ بیماری کی وجہ سے جھوٹ بولتی ہے۔''

''کس وجہ سے ایسی ہے؟''

''وہ مسلسل جھوٹ بولتی ہے، اور اپنے کذب کو سچ مانتی ہے۔''

''یعنی اشعر کی طرح ہے جس کا خیال ہے کہ انڈوچائنا میں اس نے پندرہ چینیوں کو قتل کیا تھا۔''

''اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اور اس کے علاوہ، انڈوچائنا کے لوگ ویتنامی ہیں۔ خیر، ہم واپس نیو اورلینز چلتے ہیں۔ اسٹانلے اپنے دوست مچ کو سچائی بتا دیتا ہے۔ اسٹیلا زچگی کے لیے ہسپتال جاتی ہے۔ اسٹانلے اور بلانش خود کو تنہا کھڑے پاتے ہیں، آمنے سامنے۔ بہت خوبصورت سین ہے۔ بیچاری بلانش کو برانڈو کھری کھوٹی سنانا چاہتا ہے۔ دونوں گالی گلوچ کرتے ہیں۔ تناؤ بڑھتا ہے۔ برانڈو اس کو دبوچتا ہے اور اس کی آبروریزی کرتا ہے۔ بلانش پر جنون طاری ہو جاتا ہے۔ وہ چیختی چلاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر اور نرس بلانش کو لینے آتے ہیں۔ اسٹیلا بچے کو جنم دیتی ہے۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ اسٹانلے سے کہتی ہے کہ اب وہ اسے کبھی نہیں چھو سکے گا۔ وہ اپنے بچے کو لے کر ایک ہمسایہ خاتون کے گھر رہنے چلی جاتی ہے۔ اسٹانلے اس کا نام لے لے کر روتا ہے۔ اس کی بیوی اپنے کمرے میں اس کی طویل، گونجدار چیخیں

سنتی ہے۔ بلانش کو پاگل خانے میں بند کر دیا گیا ہے۔ مچ اپنے واہمے سے باہر آ چکا ہے، اور اسٹریٹ کار، زخمی روحوں کو لیے ہوئے شہر میں دوڑتی رہتی ہے۔"

"بس، ختم؟"

"ہاں، ختم۔"

"لیکن برانڈو نے اپنی سالی کو ریپ کیوں کیا؟"

"کیونکہ وہ برانڈو کے لیے کشش کا باعث تھی اور اس نے اسے برافروختہ کیا تھا۔ ریپ عدم توازن کا ایک اظہار ہے، عدم مطابقت ہے۔"

وقت گزرنے کے ساتھ، اور میری ذہنی اور جسمانی صحت کے آہستہ آہستہ اور مسلسل خراب ہونے کے سبب، اب میں اپنے سامعین کو قصوں میں مگن نہیں رکھ پا رہا تھا۔ میری ہڈیاں دُکھتی تھیں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں اس لیے تکلیف رہتی تھی کہ میں اکڑوں بیٹھ کر سوتا تھا۔ حالانکہ ذہنی ارتکاز اور لاتعلقی کی مسلسل کوششوں سے میں درد پر قابو پا لیتا تھا، لیکن اس وقت یہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا تھا جب میں اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنے لگتا کیونکہ وہ عمل جو مجھے کہیں اور پہنچا دیتا تھا، منقطع ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں اب ایسا قصہ گو بن گیا جو سوراخوں سے بھرا ہوا تھا، اور اب اپنا پارٹ نبھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ اپنے قابو میں رہوں، خود کو خود سے علیحدہ کر لوں۔ حالانکہ ایک طرح سے ہم سبھی لوگ مکمل تنہا تھے، بیماری اور مایوسی کا شکار تھے۔ عبدالقادر ہر روز کہانیوں کی فرمائش کرتا تھا۔

"سلیم، میرے دوست، شاندار تخیل والی ادبی شخصیت کے مالک، مجھے کچھ پینے کے لیے دو۔ میرے لیے تمھارا ہر جملہ چشمے کے شفاف پانی کا گلاس ہے۔ میں ان کے گل بوٹوں کے بغیر کام چلا لوں گا، میں اپنے راشن کے پانی میں سے تمھارا حصہ لگاؤں گا، لیکن برائے مہربانی مجھے کوئی قصہ سناؤ، ایک طویل اور شاندار قصہ۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ نہایت ضرورت ہے۔ قصہ ہی میری امید ہے، میری آکسیجن ہے، میری آزادی ہے۔ سلیم، تم نے ہر چیز پڑھ رکھی ہے، تمھیں ساری آیتیں زبانی یاد ہیں، ان کے اوقاف بھی، ان کے زمانے بھی۔ تم جو کہ دوسری ہی دنیا تخلیق کرتے ہو، جہاں سب کچھ ممکن ہے — مجھے چھوڑ نہ جانا، مجھے بھول نہ جانا! میرے عارضے کا علاج صرف لفظوں اور تصویروں سے ہی ممکن ہے۔ تمھاری مہربانی سے چند لمحوں کے لیے میں مارلون برانڈو بنا۔ میں اپنے تصور میں اسی انداز سے چلتا

ہوں جس سے وہ فلموں میں چلتا ہے۔ میں اپنے ذہن میں عورتوں کو اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح وہ انھیں زندگی میں دیکھتا ہے۔ تم نے مجھے ایک تحفہ دیا ہے۔ جیسے ہی تمھاری کہانی ختم ہوئی، میں مارلن برانڈو نہیں رہا۔ مجھے تمھارے استعارے اچھے لگتے ہیں، میں تمھارے طنز کا معترف ہوں۔ تمھارے ہی سبب میں اپنے زخمی بدن کو بھول جاتا ہوں اور سیاحت پر نکل جاتا ہوں۔ میں اڑتا ہوں، سیر کرتا ہوں، ستاروں کو دیکھتا ہوں اور اس درد کو محسوس نہیں کرتا جو میری پشت کو توڑے ڈال رہا ہے، مجھے اندر سے کھائے جا رہا ہے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ تم سوچ رہے ہو کہ میں مبالغے سے کام لے رہا ہوں، یہ کہ میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں خود کو انٹلیکچول سمجھنے کے وہم میں مبتلا ہوں۔ میں اسکول میں بہت آگے تک نہیں گیا۔ میں تمھاری طرح ایک تخلیق کار بننا پسند کرتا، لیکن یہ ہنر میرے اندر ہے ہی نہیں۔ جب سے تم نے ہمیں الف لیلہ کے قصے سنانے شروع کیے ہیں، یہاں زندہ رہنا پہلے کے مقابلے میں زیادہ قابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قصے سننا مجھے اتنا اچھا لگنے لگے گا۔ جب ہم لوگ اہرمیمو میں تھے تو میں تمھیں دیکھا کرتا تھا، اور میں نے دیکھا تھا کہ ہر تعطیل کے بعد جب تم لوٹتے ہو تو کتابیں ساتھ لاتے ہو۔ میں تاش کے پتوں کی گڈیاں لاتا تھا جو میری ماں بناتی تھی۔ مجھے تم پر رشک آتا تھا۔ کیا تمھیں یاد ہے کہ ایک دن میں نے تم سے کتاب مستعار لی تھی؟ تم نے مجھے چند نظمیں پڑھنے کے لیے دی تھیں۔ میں نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی لیکن ہمت چھوڑ بیٹھا۔ ایک دوسرے موقعے پر تم نے ایک جاسوسی کہانی دی۔ یہ مجھے بہت پسند آئی تھی، لیکن یہ امریکہ کے پس منظر میں تھی۔ میں ایسی کہانی زیادہ پسند کرتا تھا جو ہمارے وطن میں ہی پیش آئی ہو، میرے قصبے میں، الرشیدیہ میں۔ میں یہ سب تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ نہایت ضروری ہے کہ تم اپنے قصوں میں ہمیں سیر کراتے رہو۔ یہ اب صرف وقت گزاری کا سوال نہیں، بلکہ اس لیے ضروری ہے کہ ہم مر نہ جائیں — یہاں، مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں تمھارے قصے سننا چھوڑ دوں تو میں ضائع ہو جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں بھی اب زیادہ توانائی باقی نہیں رہی، یہ کہ سردی کے مارے تمھاری آواز خرخرانے لگی ہے، یہ کہ اس ہفتے تمھارا ایک اور دانت جھڑ چکا ہے، پھر بھی میں تم سے التجا کرتا ہوں، اپنے کام پر لوٹ آؤ!"

اس کی التجاؤں سے متاثر ہو کر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ آج شام کے مانڈ کے بعد دو

خوبصورت توام بہنوں کی کہانی سناؤں گا جنھوں نے دو بونے بھائیوں سے شادی کی تھی۔ بدقسمتی سے مجھے تیز بخار نے بے حال کر دیا اور میں ایک گوشے میں ٹھنڈی دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ میں نہ تو بول سکتا تھا، نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ مجھ پر نیم بے ہوشی طاری تھی، آوازیں سن سکتا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میرے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ میں کئی دن تک اسی عالم میں بے خود پڑا رہا۔ مجھے کچھ بھی اندازہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور اس بھٹ میں کیا کر رہا ہوں۔ مجھ پر ہذیان طاری تھا، بخار کی شدت بڑھ گئی تھی، اور پھر ایک صبح، ایک ہفتے کی عدم موجودگی کے بعد، مجھے ہوش آ گیا۔ میں بالکل ہلکان تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور پہلا لفظ جو میرے منھ سے نکلا وہ عبدالقادر کا نام تھا۔ الحسین نے بتایا کہ گزشتہ روز ہی وہ اسے لینے آئے تھے۔ انھوں نے اسے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالا اور اس کا جسم گھسیٹ کر دروازے کے باہر لے گئے۔ جب وہ چلے گئے تو استاد نے قرآن کی تلاوت کی۔ عبدالقادر نے خود کو مرنے دیا۔ یہ خودکشی تھی کیونکہ اس نے خون کی الٹی کی تھی۔ اس نے ضرور کوئی دھاردار شے نگل لی تھی۔ میں کبھی نہ جان پاؤں گا۔ میں خود کو سمجھاتا ہوں کہ اگر مجھ میں اسے کہانیاں سناتے رہنے کی توانائی باقی رہتی تب بھی وہ مر جاتا۔ وہ لفظوں سے چمٹ جاتا تھا، وہی اس کی آخری امید تھے۔ وہ مجھے اکثر یقین دلاتا تھا کہ وہ میرا دوست ہے، اور اسے یقین ہے کہ ایک دن وہ یہاں سے نکلے گا تاکہ ہماری دوستی کھلی فضا میں پنپ سکے۔ وہ اس طرح کا تھا جو اپنی ہر بات ساجھی کرتے ہیں، ہر چیز دے دیتے ہیں۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا تھا، ''خدا جو کچھ بھی عطا کرتا ہے میں ہر چیز میں تمھارے ساتھ ساجھا کروں گا، یہاں تک کہ کفن میں بھی!'' ایک محافظ نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس کا لاشہ بے کفن دفنایا گیا، دفنانے کی کوئی رسم پوری نہیں کی گئی۔ بس خام مٹی میں ڈال کر اس پر چونا چھڑک دیا گیا تھا۔

15

زندگی میں پہلی بار کسی بہت پرقوت اور مستحکم شے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ماں ایسی ہے جو اپنا ذہن کبھی نہیں بدلتی۔ جب اس نے میرے باپ کو گھر سے نکالا، اس کی ساری چیزیں سڑک پر پھینک دیں تو میرے باپ نے اس کے پاس پیامبر بھیجے، گلدستے بھیجے، نفیس قسم کے ریشمیں کپڑے بھیجے — اس نے سکت بھر کوششیں کیں لیکن سب رائگاں گئیں۔ ماں کو اب اس

سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا؛ نہ اپنے گھر میں، نہ زندگی میں۔ یہی استحکام تھا جو اس نے اپنی ماں سے وراثت میں پایا تھا۔ اس کی ماں جو 'مادام جنرل' کہلاتی تھی، ایک زندہ دل، زیرک عورت تھی جو مردوں کا مقابلہ کرسکتی تھی، بچوں سے شفقت سے پیش آتی تھی، اور دنیا کے معاملے میں کسی وہم میں مبتلا نہ تھی۔ میری ماں ان کو اپنے لیے مثال مانتی تھی۔

جب میں نے یہ سوچا کہ میں زندہ رہوں گا تو انھی دونوں عورتوں کا خیال میرے دل میں آیا تھا۔ میرا ادراک مستحکم اور واضح تھا۔ ابتدا میں، ان ایام میں اور برسوں میں، مجھے مستقبل کا کوئی شعور نہ تھا۔ امید اور مستقبل بینی دونوں میرے شعور سے ہوا ہو چکے تھے۔ عبدالقادر کی موت نے مجھے بری طرح متاثر کیا تھا، شاید اس لیے کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کی مدد کرسکتا تھا، کیونکہ اس نے مجھ سے مدد مانگی تھی، اور شاید وہ کچھ مہینے اور زندہ رہ جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بیمار ہے، لیکن جب اس نے آخری سانس لی تو میں خود اس قدر بیمار تھا کہ مجھے اس کی موت کا بھی احساس نہیں ہوا۔ اس بات پر میں بہت بے تکلیف محسوس کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اپنے آخری لمحوں میں اس نے راحت کے لیے مجھے ضرور پکارا ہوگا۔ شاید وہ جانتا ہو کہ میں بے ہوش ہوں اور بخار سے لڑ رہا ہوں! مجھے کتنا اچھا لگتا اگر میں اسے ایک اور کہانی سنا سکتا، ایک شاندار پرندے کے پنکھوں پر سوار کرا دیتا جو اس کو لے کر جنت کی سمت اڑ جاتا۔

ایک بات طے تھی: میرے ساتھی جو اذیت اور اداسی کے ہاتھوں مارے گئے، کسی بھی درجے کا ایمان اور عقیدہ رکھتے ہوں، وہ جنت کے مستحق تھے۔ انھوں نے بے انتہا ظلم پر مبنی انتقام جھیلا تھا۔ اگر انھوں نے غلطیاں بھی کی ہوں، اگر انھوں نے خطائیں بھی کی ہوں، اس زمین دوز تہ خانے میں ان پر جو کچھ گزرا وہ بہت خوفناک وحشت گری تھی۔

جس لمحے میں نے خود سے اس طرح کی باتیں کرنی شروع کیں، مجھے کامل یقین ہو گیا کہ ہمارے قاتل میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ بعض اوقات میں خود کو اپنے ساتھی قیدیوں سے مختلف محسوس کرتا۔ میں خجل تھا۔ میں اپنی اور ان کی روحوں کے لیے دعائیں مانگتا تھا۔ میں خاموشی اور جمود کے اندر پناہ لیتا۔ گہرا سانس کھینچتا اور اس ارفع تر روشنی کو یاد کرتا جو میری ماں کے دل میں بسی تھی، جو نیک طینت مردوں اور عورتوں کے دل میں بستی ہے۔ پیغمبروں، صوفیوں اور شہیدوں کی روحوں میں جس کا بسیرا ہے، ان ذہنوں کی باسی ہے جنھوں نے بدبختیوں سے مقابلہ کیا اور فتح پائی — محض اس روحانی قوت سے،

اپنی باطنی دعا کی طاقت سے، جس کا کوئی ہدف نہیں ہوتا، جو انسان کو اپنے ضمیر کے مرکزِ ثقل کی جانب لے جاتی ہے۔

یہی روشنی ذہن کی رہنما قوت تھی۔ اپنا جسم میں اپنے عذاب دہندوں کے حوالے کرنے کو تیار تھا، بس وہ میری روح کو، میری سانسوں کو، میری قوتِ ارادی کو مجھ سے نہ چھینیں۔ بعض اوقات میں ان مسلمان صوفیا کے بارے میں سوچتا تھا جو گوشہ نشینی اختیار کر لیتے تھے اور خدا کے لیے بے پایاں محبت کی راہ میں ہر شے ترک کر دیتے تھے۔ اذیت کے عادی بعض مقدس لوگ اپنے درد کو رام کر لیتے اور اسے اپنا حلیف بنا لیتے ہیں: اس سے وہ خدا کے اتنا نزدیک آ جاتے ہیں کہ اسی کا حصہ بن جاتے ہیں اور اپنا شعور کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح عمیق ترین رنجوری ان کے دلوں کو کھول دیتی ہے۔ بعض اوقات یہ میرے لیے بھی بہشت میں کھڑیاں کھول دیتی تھی۔ یہ اس مرحلہ شکوہ پر نہیں پہنچی تھی جہاں صوفی اپنے جسم کو گریہ روشنی کے حوالے کر دیتے ہیں، اور پھر وصال کے لمحے کی تعجیل کے لیے ہر ممکن عمل کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد، وہ خود کو ریگزاروں کی جلاوطنی میں گم کر دیتے ہیں۔

جہاں تک میری بات ہے، میں ہوش میں رہنا چاہتا تھا، اور مجھ میں جو کچھ بچا تھا اسے قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ مجھ میں یقیناً کسی شہید کی روح نہیں تھی۔ مجھ میں یہ کہنے کی بھی کوئی خواہش نہ تھی کہ میرا خون 'روا' ہے اور معافی کے ساتھ بہایا جا سکتا ہے۔ میں زمین پر پاؤں مارتا تھا جیسے اپنے پیچھے پڑی ہوئی دیوانگی کو یاد دلا رہا ہوں کہ وہ مجھے آسانی سے شکار نہیں کر سکتی۔

گٹھیا کے درد نے میرے لیے حرکت کرنا ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور کر دیا تھا۔ ٹھنڈے سیمنٹ پر میں کم سے کم بے آرامی کے ساتھ کسی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ درد کے تئیں بے حس ہونے کی کیفیت تک پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ لگتا تھا جیسے میری جلد پگھل رہی ہو۔ میں نکل جاتا تھا، مسافرت پر نکل جاتا تھا۔ میرے خیالات واضح، سہل اور راست ہوتے گئے۔ میں حرکت بھی نہیں کرتا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ میں اپنے ذہن کو مرتکز کر دیتا، حتیٰ کہ میں خود اپنے خیالات بن جاتا۔ جب اس نقطے پر پہنچتا، ہر بات سہل لگنے لگتی۔ اسی طریقے سے ایک رات میں نے خود کو کعبے کے ویران چوک پر تنہا کھڑے پایا، سنگِ اسود کے روبرو۔ میں دھیرے دھیرے اس کے قریب گیا۔ میں نے اس کو پیار سے چھو کر دیکھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں کئی صدیوں پیچھے ماضی میں چلا گیا ہوں، اور بیک وقت

تابناک مستقبل میں بھی رواں دواں ہوں۔ میں نے وہ رات کعبے میں گزاری، صبح تک، فجر کی نماز کے وقت تک۔ لوگ وضو کر رہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے، اور میرے آر پار دیکھ رہے تھے۔ میں شفاف ہو چکا تھا۔ صرف میری روح وہاں تھی۔ ایسی آزادی کا لطف شاذونادر ہی میسر آتا ہے۔ میں اس کا غلط استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنے غار میں واپس جانا ہوگا، اپنے بدن میں، اپنے درد کے پاس۔

وہ ہوا جو میری روح کو اڑا کر مشرق کی سمت لے گئی تھی، بند ہو چکی تھی۔ اب کوئی شے حرکت میں نہ تھی۔ کوئی پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ یہ میری واپسی کی نشانی تھی۔ سفر تمام ہوا۔ میں ایک اور روانگی کی توقع میں زندہ رہوں گا، اپنے کان کو ہوا دان کی سمت لگائے رکھوں گا۔ ہوا کی حرکت کے تئیں میں کافی حساس ہو چکا تھا۔ ہوا جو ہمارے لیے حیات بخش تھی، جب گزرتی تھی تو دنیا کی خبر لاتی تھی اور ہماری خاموشی، ہماری خستگی سے گرانبار ہو جاتی تھی، آدمیوں کی اس گندھ سے بوجھل جو موت کے ان حجروں کی متعفن رطوبت میں سرایت کیے ہوئے تھی جہاں عقوبت زدہ لوگ سکون سے مر بھی نہیں سکتے تھے۔

16

ایک طویل عرصے تک میں یہ بھولا رہا کہ میرا کوئی باپ بھی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ وہ ان تصویروں میں نہیں تھا جو میرے ذہن میں ابھرتی تھیں۔ ایک دن میں نے اسے خواب میں دیکھا: یہ شخص جو اپنے لباس کی نفاست، وضع اور فاخرانہ اطوار کے لیے مشہور تھا، مجھے مراکش کے جامع الفنا چوک * پر کھڑا نظر آیا، پیوند لگا میلا کچیلا قندورہ * پہنے، ڈاڑھی بڑھائے، چہرے پر تھکن، اور آنکھوں میں بے انتہا اداسی لیے ہوئے۔ ایک سپیرے کے قریب کھڑا وہ قصہ گوئی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن سامعین تقریباً ندارد تھے۔ لوگ اُدھر سے گزرتے، اس کی طرف دیکھتے اور اپنی راہ ہو لیتے، اسے اپنی کہانی کے عین درمیان میں تنہا چھوڑ کر۔ وہ بہادر عنترت کے ہاتھوں خوبصورت عبلہ کو بچانے کا قصہ سنا رہا تھا جس نے اپنے آقا کو زہر دے دیا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی: ایک تباہ حال آدمی، ذلت رسیدہ، تقدیر کے استہزا کا شکار۔ جب میں کھڑا ہوا اس کا قصہ سن رہا تھا، اس نے میری طرف دیکھا۔

''آہا!'' اس نے تعجب سے کہا، ''تم تو بزرگ شیخ، فقیہہ کے بیٹے ہو جو شاعروں کا اور سلطان کا دوست ہے۔ لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم ابھی زندہ ہو؟ تمھارا باپ تو تمھیں دفنا چکا ہے۔ میں تمھارے جنازے میں گیا تھا۔ ایک نالائق بیٹے کا باپ ہونے پر معافی طلب کرتے ہوئے اس نے اپنے اہلِ خاندان کو، حکام کو اور اخبار کے نامہ نگاروں تک کو جمع کیا تھا، پھر تمھیں بددعائیں دی تھیں اور دفن کر دیا تھا۔ ساتھ میں تابوت بھی تھا جس میں اس نے تمھارا سامان، کتابیں اور وہ ساری تصویریں بھر دی تھیں جن میں تم نظر آ رہے تھے۔ اس نے تقریر بھی کی تھی، اور میں ہی تھا جس نے تمھارے مفروضہ باقیات پر قرآن کی تلاوت کی تھی۔ تو تم ابھی مرے نہیں ہو! یہاں آؤ، میرے قریب۔ ڈرو نہیں۔ جانتا ہوں، میرے پاس پانی نہیں کہ خود کو صاف ستھرا کر سکوں، میرا وزن بھی گھٹ گیا ہے۔ میں ان چھلیوں پر گزارہ کرتا ہوں جو کونے کے قہوہ خانے کا مالک مجھے کبھی کبھار دے دیتا ہے۔ میں قصے سنانے کی کوشش کرتا ہوں، کچھ تو وقت گزاری کے لیے اور کچھ چند درہم کمانے کے لیے، تاکہ اپنے لیے ایک پیارا سا اونی اور ریشمی جلابہ خرید سکوں۔ میں پہلے ہی اس کا آرڈر بھیج چکا ہوں۔ میں نے حساب لگا لیا ہے: دس درہم روز کے حساب سے سو دنوں کے اندر میں اسے پہن سکوں گا۔ تم دیکھنا کہ جب میں یہ پہن لوں گا تو ایک مختلف آدمی لگوں گا۔ میں پھر سے عالم فاضل ہو جاؤں گا اور حکام کا دوست بن جاؤں گا، جیسا کہ میں پچھلی زندگی میں تھا۔''

اپنے باپ کے اس تصور پر میں مسکرانے لگا جس میں ہم دونوں کے حالات باہم تبدیل ہو گئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اس لمحے جبکہ میں اسے چیتھڑوں میں دیکھ رہا ہوں، وہ سلطان کو خوش کرنے میں مشغول ہوگا! شاید اس کے ساتھ تاش کھیل رہا ہو، ذومعنی الفاظ اور احمقانہ تملق سے چپڑے ہوئے ایسے تبصرے کر رہا ہو جو شاہی ذوقِ مزاح کو گدگدا سکیں۔

جہاں تک میرے باپ کا تعلق ہے، اس کے نزدیک میں نہ صرف مر چکا تھا بلکہ میرا کبھی کوئی وجود ہی نہ تھا۔ وہ کسی ایسے شخص سے نہیں ملتا تھا جو اسے یاد دلائے کہ اس کا ایک بیٹا جیل میں ہے۔ میری ماں کو اس کی صورت دیکھنا تک گوارا نہ تھا، اور وہ محل ہی میں رہتا تھا، سلطان کے ہر اشارے پر موجود۔ اس صورتِ حال سے میرے بہن بھائیوں کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ اس نے اپنے

بیشتر بچوں کو وظیفے اور سرکاری ملازمتیں دلانے میں مدد کی تھی، اس شرط پر کہ اس کے سامنے میرا نام تک نہ لیا جائے۔ وقفے وقفے سے اس کا چہرہ مجھے نظر آتا، ایک لطیفہ گو کا دانا چہرہ جس پر جاگیردارانہ ذہنیت کے نشان اتنے گہرے تھے کہ خود اعتمادی کی متانت میں کبھی خلل نہ پڑنے دیتے تھے۔ میں اس کو ہمیشہ سفید، نفیس لباس میں دیکھتا تھا، جیسے وہ کسی دوسرے عہد سے، کسی دوسری صدی سے نکل کر آیا ہو۔ میں اس سے ناراض نہیں تھا۔ کبھی رہا بھی نہیں۔ نہ اس کا معترف تھا، جیسا کہ میرے چند بھائی تھے، اور نہ متنفر ہی تھا۔ میں اس سے لاتعلق بھی نہیں تھا، یقیناً؛ لیکن میں نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا، اسی طرح جیسے اس نے خواب میں میرے ساتھ کیا تھا۔ درحقیقت، وہی تھا جو گئے بغیر چلا گیا تھا۔ اس نے دوسری عورت سے شادی کی اور دوہری زندگی گزارتا تھا۔ وہ کبھی کبھی آتا تھا، ایسے وقت میں جب ماں کام پر گئی ہوتی۔ وہ اپنے چند نفیس جلابے اٹھا کر غائب ہو جاتا تھا۔ ماں نے اس رویے سے اپنے کچھ نتائج اخذ کیے اور اس پر ہمیشہ کے لیے دروازے بند کر دیے۔ وہ قاضی کے پاس گئی اور خلع کا مطالبہ کیا۔ میں تب دس برس کا تھا۔ میرے نزدیک یہ شخص جسے میں نے بہت کم دیکھا تھا، ہمارے خاندان کا فرد نہ تھا۔ میری ماں کی مہربانی، کہ اس شخص کے لیے میرے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا، نہ اچھائی کا نہ برائی کا۔ وہ ان کی برائی نہ کرتی تھی، صرف اتنا کہتی کہ اس کی ایک اور فیملی ہے، یہ کہ وہ اس کا برا نہیں چاہتی، یہ کہ ایک واضح قطع تعلق کر کے وہ معاملات کو صاف کر دینا چاہتی ہے۔ وہ تکلیف ضرور جھیلتی ہو گی، لیکن اپنے رویے سے اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

میں اس سب پر غور کرتا رہتا، اپنے زندان کی خاموشی میں۔

وہ کیا کر سکتا تھا؟ جو کچھ واقع ہوا اگرچہ میں نے اس کا منصوبہ نہیں بنایا تھا لیکن میں نے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ میں محل میں بلا جھجک داخل ہوا تھا، میں نے سلطان کے تئیں اور اس اعتماد کے تئیں جرم کیا تھا جو سلطان کو میرے باپ میں تھا۔ اپنے اعلیٰ افسران کے احکامات کی پابندی کرنا میرا کام تھا، لیکن میں سب کے ساتھ جانے سے انکار کر سکتا تھا — اور شاید مشین گن کی گولیوں کی باڑھ سے میرا خاتمہ کر دیا جاتا۔ میں اپنا پالا بدل سکتا تھا اور بادشاہت کا دفاع کر سکتا تھا۔ لیکن ایسا کوئی خیال میرے دل میں نہیں آیا تھا۔ شاید قتل عام کو دیکھ کر میں مفلوج ہو گیا تھا۔ منجمد ہو گیا تھا، خیرہ تھا، دنگ تھا، میرا حلق خشک تھا، تیز دھوپ میرے چہرے کو ہدف بنا رہی تھی۔ تصویروں کا ایک ناگہانی طوفان تھا جو میرے

سامنے تھا اور میں حرکت کرنے سے معذور تھا۔ دس سال کی قید ایک سخت سزا تھی، لیکن تدریجی موت کے اس محبس میں، ہم جو کچھ جھیل رہے تھے اس کے تقابل میں آسان تھی۔ کیا میرا باپ دربار چھوڑ سکتا تھا؟ نہیں۔ جب تم سلطان کے خدمت گار ہوں تو اپنے عہدے سے استعفیٰ نہیں دے سکتے۔ تم صرف گردن جھکاتے ہو، اطاعت کرتے ہو، تمھارا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ہے، ''جی، عالی جاہ!'' تم مرکزِ توجہ بننے سے گریز کرتے ہو، تم سلطان سے کبھی اپنی بات دہرانے کو نہیں کہتے، بھلے ہی تم نے اس کا حکم واضح طور پر نہ سنا ہو۔ تم بس اتنا کہتے ہو: ''نعم، سیدنا!'' اور پھر اپنا پورا ذہن یہ سمجھنے کی کوشش میں لگا دیتے ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میرا باپ اُسی دنیا میں رہتا تھا، احساسِ فخر اور مسرت کے ساتھ۔ بعد میں مجھے ایک اہم آدمی کے بیٹے کے بارے میں خبر ملی تھی جسے 'عالی جاہ کا خصوصی ترجمان' کا خطاب حاصل تھا۔ اس کے بیٹے کو، جو بائیں بازو کا انقلابی تھا، ریاستی سلامتی کے خلاف سازش کے جرم میں پندرہ سال کی سزاے قید سنائی گئی تھی۔ یہ عمومی جنونِ شک کے دن تھے۔ وہ طلبہ کو، خصوصاً زیرک طلبہ کو جیلوں میں ٹھونس رہے تھے، محض اس لیے کہ انھوں نے اپنی غلط آرا کا اظہار کیا تھا۔ یہی وہ دور بھی تھا جب وزیرِ داخلہ جنرل اوفقیر * نے حکم دیا کہ ریڈیو پر ایک انتظامی میمورنڈم کے ذریعے فلسفے کی تعلیم کو معرّب کرنے کا اعلان کیا جائے۔ اس فیصلے کا مقصد ایسے نام نہاد تخریبی متون کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا جو طلبہ کو مظاہروں پر اکسا رہے تھے۔ لگتا یہ ہے کہ شاہ نے اپنے خصوصی ترجمان کو بلوایا اور اپنے بیٹے کی تعلیم کو نظرانداز کرنے پر سخت الفاظ میں ملامت کی۔ اس معظم شخصیت کو جس کے اعلیٰ اخلاق اور سیاسی وفاداری میں کچھ کلام نہ تھا، دماغی سکتہ ہو گیا اور آئندہ کئی برس تک وہ کوما میں رہا۔

میرا باپ ایسا نہ تھا کہ کسی کے لیے کوما میں چلا جائے۔ اپنے بچوں کے لیے احساسِ ذمہ داری رکھنا اس کا شیوہ نہیں تھا۔ تو پھر اس سوال کی تکرار سے کیا فائدہ؟ جواب میں اس نے کہہ دیا ہوگا، ''میرا کوئی بیٹا نہیں!''، یا ''یہ شخص میرا بیٹا نہیں ہے۔'' لیکن میں نے یہ کبھی نہیں کہا، اور نہ کبھی کہوں گا، ''میرا کوئی باپ نہیں ہے''، یا ''یہ آدمی میرا باپ نہیں ہے''، چاہے میرے پاس اس رشتے سے انکار کرنے کا کہیں زیادہ بڑا جواز کیوں نہ ہو۔

میں جانتا تھا کہ مسئلے اتنے سادہ نہیں ہوتے۔ زندہ رہنے کے لیے جو کچھ ممکن تھا، میں کر رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم اس زندان میں ڈالے گئے تھے، میرے فاس والے دوست رشدی نے مجھ

سے پوچھا تھا، ''تم کو کیا لگتا ہے کہ تمھارے والد، جو اس قدر اہم شخصیت کے حامل ہیں، کیا ہمیں یہاں سے نکلوائیں گے؟''

''قطعی ناممکن!'' میں نے جواب دیا تھا۔ اس کو نہیں معلوم کہ کیا ہوا ہے۔ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ اس مقام کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے۔ میرے گھر والے سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ قنیطرہ کی جیل میں ہیں۔ ملاقات پر پابندی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ میرا باپ سلطان کی دل بستگی پر مامور ہے، ریاست کے مسئلوں پر گفتگو کرنے کے لیے نہیں۔ اس لیے دیکھو اس بات کو بھول جانا ہی بہتر ہے کہ میرا کوئی باپ ہے، اور خصوصاً اس بات کو کہ دربار میں وہ کسی عہدے پر ہے۔''

''جن دنوں ہم عام قیدی تھے،'' رشدی بتانے لگا، ''میرے والد ایک افسر سے ملنے گئے تھے جس سے وہ لیسے (فرانسیسی سیکنڈری اسکول) کے زمانے سے واقف تھے اور جہاں وہ ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ اس شخص نے کہا کہ انھیں کسی اعلیٰ تر عہدے دار سے التجا کرنی ہوگی — یہ مدد سے انکار کا ایک مہذب طریقہ تھا۔ لیکن، خیر تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس مسئلے سے خود ہی نمٹنا ہوگا۔ یعنی کہ ہمیں خود ہی مرنا ہوگا۔ اب ہمارا کوئی وجود نہیں۔ ہم مرے ہوئے لوگ ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ تمام سرکاری دفاتر سے ہمارا نام کاٹ دیا گیا ہوگا۔ تو پھر اپنے سروں میں جنونی امیدیں پالنے سے کیا فائدہ؟ میں بس یوں ہی کہہ رہا ہوں — بہت باتیں کرتا ہوں کیونکہ اس سے مجھے یہ احساس رہتا ہے کہ میں موجود ہوں، اور یہ بھی کہ جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن ہمیں بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ ہم بذاتِ خود فراموشی ہیں۔ بعض اوقات میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں کہ میں مر چکا ہوں، کہ ہم ماورا میں ہیں، جہنم میں ہیں۔ اس کا مجھے اتنا گہرا یقین ہے کہ رو پڑتا ہوں۔ یہ میں تمھیں بتا رہا ہوں، اور ان لوگوں کو بتاتا ہوں جو مجھے سمجھ سکتے ہیں۔ کبھی ٹوٹ جاتا ہوں اور چھوٹے بچے کی طرح رونے لگتا ہوں۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو؟ ایک امیر خاندان کا لڑکا جسے فوج نے سخت دل بنا دیا ہے، اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے ہیں۔ مجھے اس پر کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ میرے پاس یہی واحد ثبوت ہے کہ مرا نہیں ہوں۔ تم نے بہت مطالعہ کیا ہے، ذرا مجھے بتاؤ: تمھیں کیا لگتا ہے کہ اس زندان سے نکلنے کے بعد، جب ہم زندگی میں لوٹ جائیں گے، اگر بدہضمی سے یا کار سے ٹکرا کر مر گئے تو کیا تمھارے خیال میں ہم جنت میں جائیں گے؟''

”خدا ہی جانتا ہے۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن تم وہی کرو جو میں کرتا ہوں، عبادت کرو، اور کسی اجر کے بارے میں مت سوچو۔ تمھیں عبادت کرنی ہے، بدلے میں کسی بھی شے کی توقع کیے بغیر۔ ایمان کی قوت اسی میں ہے۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا، سلیم!“

”میں لامتنہی کی عبادت کرتا ہوں، خدا سے دعا مانگتا ہوں تاکہ دنیا سے کنارہ کش ہو سکوں۔ لیکن تم جانو دنیا تھوڑی کر کے اتر ہی آتی ہے۔ میں دنیا کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوں، بلکہ ان احساسات کے خلاف لڑ رہا ہوں جو ہمارے اطراف میں گھات لگائے رہتے ہیں، ہمیں نفرت کے کنویں کی جانب کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں کسی شے 'کے لیے' نہیں، بلکہ اس شے 'کے ساتھ' عبادت کرتا ہوں۔ میں کسی شے کی امید میں نمازیں نہیں پڑھتا بلکہ بقا سے بیزاری کے لیے پڑھتا ہوں۔ میں اس کسل مندی کے خلاف عبادت کرتا ہوں جو ہمارا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہے۔ اس لیے اے میرے عزیز رشدی، عبادت مکمل طور پر بلا معاوضہ ہوتی ہے۔“

کئی تصویریں میرے ذہن میں چلتی رہتی ہیں۔ وہ باہم مدغم ہوتی ہیں، ٹھوکریں کھاتی ہیں، زمین پر گر پڑتی ہیں، یا ٹمیالے افق کی جانب چلی جاتی ہیں۔ سیاہ سفید تصویریں۔ میرا ذہن رنگوں کو قبول کرنے کا منکر ہے۔ میں اپنے باپ کو چلتے پھرتے دیکھتا ہوں، اکثر جھکتے ہوئے، جیسے جھک کر کوئی قیمتی شے زمین سے اٹھا رہا ہو۔ اس کے آگے آگے سلطان، اعتماد کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا۔ بیچ بیچ میں اپنے ہاتھ سے پرسکون رہنے کا اشارہ کرنے کے لیے پلٹ کر دیکھتا ہوا۔ میرا باپ عجلت سے آگے بڑھتا ہے لیکن سلطان سے گز بھر سے زیادہ فاصلے پر ہی رہتا ہے، یقیناً آدابِ شاہی کے خیال سے۔ میرے باپ کے ذہن کو کبھی آرام نہیں کرنے دیا گیا۔ اسے ایسے لطیفے، ذومعنی جملے، مزاحیہ کلمات اختراع کرنے ہوتے تھے جو شہوانی تو ہوں لیکن فحش نہیں۔ اور یہ بات سب سے اہم تھی کہ وہ ایک دم مناسب موقعے پر یورش کریں۔ ایک درباری مسخرہ، جادوگر، دراک ماہرِ نفسیات، ذہن کو پڑھنے والا، مستبصر، سکون بخش حاضر باش: یہی میرے باپ کا کام تھا۔ اسے پیش بینی سے، پیش دستی کرتے ہوئے اپنا ردِعمل فی الفور ظاہر کرنا ہوتا تھا۔ یہ پیشے یا ملازمت سے بڑھ کر کوئی کام تھا۔

ذہن کو ہر لمحے چوکنا رکھنا۔ کوئی تساہل نہیں، آرام نہیں، تردد نہیں۔ ان کے ذہن اور حافظے کو سکون نہیں تھا۔ اسی نے اسے اپنے بیٹے کے بارے میں سوچنے کی ایک لمحے کی بھی فرصت نہ دی۔ کیا انھیں معلوم تھا کہ اس کے سرپرست نے مجھے کس جہنم میں جھونک دیا ہے؟ اگر معلوم بھی ہوتا تو اس نے کیا کہا ہوتا، یا کیا کیا ہوتا؟ کچھ بھی نہیں۔

یہ ضروری تھا کہ میں ان تصویروں سے نجات پالوں۔ جب میں انھیں اپنے ہاتھ کی پشت سے پرے کھسکا دیتا، وہ پھر سے یلغار کرتیں، اور زیادہ نزدیک آجاتیں، زیادہ واضح ہو جاتیں۔ میں نے اپنے باپ کا چہرہ اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ غیر معمولی تھا۔ اس کی جلد پر بچپن کی بیماری کے نشانات پڑے ہوئے تھے، اس لیے ان نشانوں کو وہ فاؤنڈیشن میک اپ سے چھپاتا تھا۔ عورتوں کی طرح، کسی عشوہ گر عورت کی طرح میرا باپ بھی اپنے چہرے کی دیکھ بھال نفاست سے کرتا تھا۔ دوسری تصویر، سلطان کی تصویر، جامد اور مرموز تھی۔ وہ ہمیشہ گہری نظر سے کہیں فاصلے پر دیکھتا رہتا تھا۔ شاید اس پراسرار نظر کے پیچھے کوئی خیال تھا، خیال ہمارے بارے میں۔ میرا مطلب ہے کہ میں یہ فرض کرنے کی جسارت کرتا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں سوچ رہا ہے۔ بعض دفعہ میں اس پر حیران بھی ہوتا کہ کیا وہ جانتا ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ ہم زیرِ زمین موجود ہیں؟ ایسا شخص جس کا تختہ پلٹنے کی دو بار کوشش ہو چکی ہو، باغیوں کو فراموش نہیں کر سکتا، ایسا ہونا فطری ہے۔ ٹھہرو... کیا میں نے 'باغیوں' کہا؟ میں کسی بھی ایسے مراکشی شہری سے بڑا باغی نہیں تھا جو وسیع پیمانے پر پھیلی بدعنوانیوں اور پوری قوم پر تھوپے گئے غصے سے متنفر ہو۔ لیکن میں تو ہتھیار بردار فوجی سپاہی تھا، ایک جونیئر افسر جس نے احکام پر عمل درآمد کیا۔ انھوں نے ہمیں قنیطرہ کے زندان سے کھینچ کر اس بھٹ میں کیوں لا پھینکا؟ یہ کس قسم کی منطق تھی؟ آہ، منڈے ہوئے سر پر ٹپکتی ہوئی پانی کی ایک ایک بوند! آہ، چینی عقوبت، مراکشی انداز کی، ایسے وحشیانہ پن کے ساتھ جو آہستگی سے فراموشی میں غرق ہو جاتی ہے! کوئی منطق نہیں تھی، بس نہ ختم ہونے والی سزا جو وقت سے کشید کر کے طولانی بنا دی گئی اور جس نے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

میں اس عجیب و غریب خواب میں ان الفاظ پر غور کر رہا تھا کہ تبھی سلطان کا پیکر نمودار ہوا اور اس نے مجھ سے کہا:

"اٹینشن کھڑے ہو جاؤ! میں جانتا ہوں تم کھڑے نہیں ہو سکتے۔ تمھارا سر چھت سے ٹکرا جائے

گا۔اس لیے جھک کر کھڑے رہو اور میری بات غور سے سنو۔اس پر حیران ہونا بند کردو کہ کیا میں کبھی تمھارے متعلق سوچتا ہوں۔مجرموں اور غداروں کی ٹولی کے بارے میں سوچنے سے بہتر مجھے اور بہت کام ہیں۔تم نے اپنے سلطان کے خلاف ہاتھ اٹھایا— میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنا ہتھیار استعمال نہیں کیا— اور تمھیں اس پر اب ساری زندگی پچھتانا پڑے گا۔بس تاسف کرنا سیکھ لو، اسی غار میں، یومِ حساب تک۔تمھارے باپ نے تمھاری مناسب تربیت کو نظرانداز کیا، میں نے نہیں، اور یہ سب بس اسی لیے ہوا۔اس لیے میری تصویر کو اب اور اس متعفن تہہ خانے میں نہ لاؤ۔اس لیے تمھیں حکم دیتا ہوں کہ نہ تو میرے بارے میں سوچو، نہ میری تصویر کو دوسروں کے ساتھ ملاؤ!''

میں گنگ رہ گیا۔کیا یہ سچ مچ اسی کی آواز تھی؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں یہ بھول چکا تھا کہ اس کی آواز کیسی ہے۔لیکن سلطان کسی ایسے بے بس جونیئر افسر سے بات کرنے کا الطاف نہیں کرتا جو خود سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔

17

نمبر چھ، مجید ہر وقت کریم سے وقت پوچھتا رہتا تھا۔لگتا تھا جیسے اس کا کوئی اپائنٹمنٹ ہو یا وہ ٹرین کا انتظار کر رہا ہو۔وہ کریم کے ساتھ وقت دہراتا اور پھر اپنی گفتگو جاری رکھتا۔

''بہت بڑھیا، بہت شاندار۔ہم اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔دھیان رکھو، یہ صرف اس پر منحصر نہیں ہے کہ وقت کیا ہوا ہے، بلکہ اس پر بھی ہے کہ دن کون سا ہے۔کریم، برائے مہربانی، ذرا یہ بھی بتاؤ کہ دن کون سا ہے؟''

''آج سنیچر ہے۔''

''مجھے معاف کریں، مجھے غلط دن یاد تھا۔قاعدے سے، جب وہ آیا تو وہ جمعہ کا دن رہا ہوگا، جمعے کی نماز کے فوراً بعد۔''

''لیکن تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''کیا تم نہیں جانتے؟ تم جو کہ شیطان کی سی درستی سے وقت کا حساب رکھتے ہو؟''

''خیر، ایسا ہی ہے۔ وقت کا حساب مجھے کسی اور چیز کی طرف دھیان ہی نہیں دینے دیتا۔''

''موحہ، تم جانو وہی آدمی جو ہمیشہ سچ بولتا ہے کیونکہ کھونے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ ہمیں آزاد کرانے آئے گا۔ یہ مذاق نہیں۔ میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔ اپنے خیالوں کے ذریعے میں اس کے ساتھ رابطے میں ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اکثر مجھ سے صبر کرنے کو کہتا ہے۔ میں جواب میں کہتا ہوں کہ صبر اب بازار سے نہیں خریدا جا سکتا۔ اس پر وہ ہنس پڑتا ہے۔ آہ، صبر! یہ سچ ہے — اکیلا صبر ہی ہمارے پاس بچا ہے۔ میں، میں نے کافی مقدار میں صبر حاصل کر لیا ہے، اور اس میں اسے بھی شریک کر سکتا ہوں جو میرے ساتھ آنے کو تیار ہو جائے۔ جب موحہ آئے گا تو وہ نظر نہیں آئے گا، لیکن عطرِ فردوس کی خوشبو سے وہ اپنی آمد کا اعلان کرے گا۔ اپنے نتھنے کھلے رکھنا۔ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے۔''

کوئی بھی مجید سے نہیں الجھتا تھا۔ اکادیر کا رہنے والا یہ بربر کوتاہ قد اور دبلا پتلا تھا۔ اس کی بینی آنکھوں میں جھلملاہٹ تھی۔ سگریٹ کی طلب نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔ وہ دو پیکٹ روز پیتا تھا۔ جب ملٹری اکیڈمی میں تھا تو بعض دفعہ سگریٹ پینے کے لیے آدھی رات کو جاگ جاتا تھا۔ سردیوں میں ہر سال کھانس کر اپنے پھیپھڑے کھوکھلے کر لیتا تھا۔ سگریٹ اس کی دوا تھی، اس کے وجود کا جواز تھی، اس کی لت تھی، اس کی زندگی کا مقصد تھی۔ اسے فوج سے ملنے والا تمبا کو پسند نہیں تھا۔ اس کے سارے پیسے امریکی سگریٹ کے کارٹنوں پر خرچ ہوتے تھے۔

جیل میں تقریباً دس سال گزر چکے تھے لیکن وہ ابھی تک تمبا کو کو نہیں بھولا تھا۔ اس کی کھانسی بدتر ہو چکی تھی۔ نکوٹین شاید اسے آرام دے سکتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس نے سگریٹ کے لیے التجائیں کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن اب وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کے درمیان بھٹکتا رہتا تھا۔ اس نے موحہ کو ایجاد کر لیا تھا، ایک ایسا مشیتی شخص جو اس کا ہمجولی تھا۔ موحہ زمان و مکان میں سفر کر سکتا تھا اور خود کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ مجید کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی آواز سن سکتا ہے۔ شروع میں مجھے لگا کہ وہ روحانی روشنی کی جستجو میں ہے، یہ کہ میری طرح وہ بھی اپنے قالب سے نکل جاتا ہے — اس کی حد تک، نکوٹین کی طلب سے پیدا شدہ اذیت سے نجات پانے کے لیے۔ اپنے درد کو نکالنے کا یہ اس

کا طریقہ ہوگا۔ لیکن، جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بیچارہ مجید اب ہم جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اب وہ موحہ کے نہیں بلکہ ہمارے ان تمام ساتھیوں کے متعلق باتیں کرنے لگا تھا جنھیں ہم دفنا چکے تھے۔

''وہ سب جنھیں تم لوگوں نے دفن کر دیا ہے، مرے نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ صرف میں ہی ہوں جسے یہ بات معلوم ہے۔ اس لیے میں تم کو بتائے دیتا ہوں: وہ فریب دے رہے ہیں۔ ان کے پاس جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ پہاڑی کے دوسری جانب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ سبھی وہیں ہیں: الغربی، عبدالقادر، مصطفی، ادریس، رشدی، حمید... محافظوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہ مردہ ہونے کا ناٹک کھیل رہے ہیں۔ بھگا کر لے جانے کے لیے مناسب موقعے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جو چونا ان کے جسموں پر چھڑکا گیا تھا، وہ انھیں گرم اور بیدار رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف بھاگ جاتے تھے، بلکہ بھاگتے وقت محافظوں کو بھی اپنی قبروں میں پھینک دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محافظ لنگڑانے لگے ہیں۔ وہ اہم دن جلد ہی آئے گا جب ہم یہاں سے بچ نکلیں گے۔ بالآخر آزاد ہوں گے۔ اور ہم ساری دنیا کی سگریٹیں پی جائیں گے۔''

اس کے دوست کریم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مجید اس کی بات غور سے سننے اور اس سے متفق ہونے تک کا بہانہ کرتا، اور پھر اپنی ہی بے ربط باتوں پر اتر آتا، زیادہ اصرار کے ساتھ کہتا کہ مرنے والے مرے نہیں ہیں بلکہ بچانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس کی اپنی عجیب و غریب منطق تھی۔

''سنو، کریم! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں بس ایک ہی راستہ بچا ہے: سب سے پہلے پیر نکالو۔ اس لیے جو لوگ ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں وہ جان گئے تھے کہ انھیں مرنے کا بہانہ کرنا ہوگا، خود کو جلدی سے دفن کروا دینا ہوگا، پھر وہ چونے کے گڑھے سے نکل جائیں گے اور قریب کے جنگلوں میں جا چھپیں گے، تاکہ مسلح ہو کر لوٹ آئیں اور ہمیں بچا لیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہی صحیح ہے۔ میں باتیں نہیں بنا رہا ہوں۔ قرآن میں بھی کہا گیا ہے، اور استاد الغربی اس کی تصدیق کریں گے کہ جو ناحق مر جاتے ہیں، وہ خدا کے پاس زندہ رہتے ہیں۔''

الغربی نے بات کو درست کرنے کے لیے مداخلت کی۔

''تم شہیدوں کی بابت کہہ رہے ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ شہدا کے لیے خدا نے جو تعریف طے کی ہے ہم اس پر پورے اترتے بھی ہیں یا نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی ہم نے دوسری بحث شروع کر دی جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی تھی۔ ہم کون ہیں؟ ہماری کیا حیثیت ہے؟ کیا ہم ناسپاس فوجی سپاہی ہیں؟ یا سیاسی قیدی؟ یا ناانصافی کے شکار لوگ؟ ہمیں اس وقت یہاں بھیجا گیا جب اپنی سزا کا پانچواں حصہ بھگت چکے تھے۔ ہمیں قنیطرہ کی جیل سے اغوا کر کے اس گڈھے میں پھینک دیا گیا۔ انصاف نے، ان کے انصاف نے، اس نے جس نے ہمیں پریس کے سامنے پیش کیا، اور منڈے ہوئے سروں کے ساتھ ہمیں صاف ستھرے لباس میں کھڑا کیا تھا، ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ ہم محض سپاہی تھے جنھیں ان کے اعلیٰ افسروں نے بھٹکا دیا تھا۔ انھوں نے ہمیں مسلح کیا اور صخیرات پہنچنے سے چند منٹ پہلے ہمیں اطلاع دی تھی، ''ہمارا سلطان خطرے میں ہے، ہمیں اس کو بچانا ہے۔ ہمارے دشمن مہمانوں اور گولف کھیلنے والوں کے بھیس میں آئے ہوئے ہیں۔'' ہم اس لمحے میں کیا تھے: دھوکے میں آئے ہوئے کیڈٹ، یا پھر سازش میں ملوث غدار؟ ہم کس طرح جان سکتے تھے کہ ایک جونیئر افسر کے ذہن میں اس وقت کیا کچھ چلتا ہے جب وہ اس قدر بصارت کُش روشنی سے خود کو خیرہ پاتا ہے — اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا، ہاتھ میں مشین گن لیے ہوئے — اور پھر وہ فائر کا حکم سنتا ہے؟

ایک نقطے پر گولف کورس کے سبزے نے میری نگاہ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا: کیا ہی خوبصورت تراش تھی، کس قدر ہموار، کتنا چمک دار، کتنا سبز — خالص، بالکل بے داغ سبز رنگ۔ میں اس لان پر چل رہا تھا جو پیروں کے نیچے ویسا ہی آرام دہ تھا جیسے کوئی خوبصورت قالین ہو کہ تبھی ایک آدمی نے، میرا خیال ہے کسی غیر ملکی آدمی نے، پکار کر مجھ سے کہا تھا۔

''نہیں، نہیں، اپنے جنگی جوتوں میں نہیں! تم سبزے کو خراب کر رہے ہو! نہیں، جاؤ کہیں اور جا کر ٹہلو، یا پھر اپنے بوٹ اتار لو۔''

اس درمیان گولیاں ہر سمت میں سیٹیاں بجا رہی تھیں اور بے عیب سنوارے ہوئے بالوں والے خوش لباس آدمی مکھیوں کی طرح گر رہے تھے۔ جو کچھ پیش آ رہا تھا اس کی سنگینی کا صحیح احساس کیے

بغیر میں گولف کورس سے نکل آیا۔ میں وہ خدشات اور شبہات تک بھول چکا تھا جن پر میں نے رشدی سے بات کی تھی۔

اس مخصوص لمحے کے بعد سے اب تک، میں اس المیے کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔ سلطان کا قتل! لیکن اس سے کیا فائدہ ہونا تھا؟ کیا اسے ہٹا کر فوجی حکومت آجاتی؟ سارے فوجی جنرل اور لیفٹینٹ کرنل اقتدار میں شریک ہوتے اور ملک کے اثاثوں کو آپس میں بانٹ لیتے؟ میں نے اس پر بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ خوش بختی کی بات تھی کہ ہم ناکام ہو گئے۔ نہیں، میرا مطلب ہے — یہ خوش بختی تھی کہ وہ لوگ ناکام ہو گئے۔ اف، کمانڈنٹ اے اور اس کا ایڈ جوٹنٹ عطائل کر ہمارے لیے کس قسم کی فوجی آمریت تیار کرتے! میں ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں اس صورتِ حال کو سمجھنے اور اس پر بات کرنے کے لیے قطعاً مناسب آدمی ہوں۔ لیکن کون میری بات سنے گا، اس غار میں؟

مجید مجھ سے کہنے لگا، جیسے اس نے میرے ذہن کو پڑھ لیا ہو۔

''تم درست ہو۔ موحہ تم سے متفق ہے۔ تم ان سپاہیوں سے کیا توقع کر سکتے ہو جو انصاف سے زیادہ طاقت میں اعتقاد رکھتے ہوں؟ اگر ہم انجام کار یہاں پہنچے، اس سرنگ میں، تو یہ ان کی خطا ہے۔ انھوں نے ہم سے ہماری رائے نہیں مانگی تھی۔ بہر حال، فوج میں تم یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ کیڈٹ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں یہاں سے بچ کر نکلنا ہے۔ مدد کے لیے ہمارے پاس صرف مردہ لوگوں کی چال ہی ہے۔ زندہ لوگ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم بھی تو مر چکے ہیں۔ ہمیں جہنم میں قید کر دیا گیا ہے۔ یہ غلطی ہے، عدل کی ایک بدبختانہ خطا۔ ہم زندہ ہونے کا مکر کر رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہی لوگ جن کو ہم مردہ سمجھ رہے ہیں، دراصل مردہ ہونے کا صرف ناٹک کر رہے ہیں، اور ہمارا انتظار کر رہے ہیں تاکہ ان کے ساتھ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔''

میں نے طے کیا کہ اس سے بحث نہیں کروں گا۔ کیوں پریشان کیا جائے۔ وہ اسی امید پر جی رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ موحہ کا انتظار کر رہا ہے۔ جب کریم اس کی وقت بتانے کی مسلسل التجاؤں سے پریشان ہو گیا اور اس نے کہا کہ اس کا گھنٹہ ٹوٹ گیا ہے تو مجید رو پڑا۔ مجھے کچھ کرنا تھا، کسی طرح اسے تسلی دینے کے لیے، اس کی دیوانگی کو دھوکا دینے کے لیے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ہی موحہ ہوں،

اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس شخص کے قالب میں ڈھل کر بات کرنے میں جو مجید کی شدید مایوسی کی ایجاد تھا، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں ہی موحہ تھا۔ مجھ میں اس کا وجود تھا، اس کی آواز، اور اسی کا اعتماد۔

''اے شخص ناصبور، تم کہ جس کا وقت جل رہا ہے، ساکت راتیں جس کو نگل رہی ہیں، تم جو کہ یقین کرتے ہو کہ مردے ایسے اداکار ہیں جو اس رنگ منچ پر کھیل رہے ہیں جہاں پرچھائیوں اور پریتوں کا ڈیرا ہے، تم کہ جس کی بے چینیاں اندھیروں میں بڑھ جاتی ہیں، جان لو کہ میں تو بس فاصلے کی صدا ہوں، ایک ایسا شعلہ جس نے تابندگی کا چولا پہنا ہے، ایسا لفظ ہوں جو تمھاری آنتوں سے نکلتا ہے اور کنویں میں جا گرتا ہے۔ ہوا جو ریت سے گرانبار ہے اور قدموں کے سب نشان مٹا ڈالتی ہے، پھر بھی یہ میری آواز کو اڑائے لیے پھرتی ہے۔ تم، تنہا تم ہی، خود کو اس سرنگ سے باہر لے جا سکتے ہو۔ تمھیں اس کے لیے ایک زبردست قوتِ ارادی درکار ہے، وہ ذہنی قوت جو خوابوں سے زیادہ قوی ہو، عبادت سے زیادہ روشن۔ اونچے درختوں پر میرا بسیرا نہیں۔ میں ان خیالوں کا ساکن ہوں جو جراحتیں دیتے ہیں، جو میری جلد کو تار تار کر دیتے ہیں، پھر بھی مجھے خوابیدہ بیابانوں اور کوہساروں کے اوپر سے گزار لے جاتے ہیں۔ میں دور جا رہا ہوں۔ میں بہت دور جا چکا۔ میں تمھیں، تم کو واپس لوٹا رہا ہوں، تمھاری عزلت کو، اور تمھاری عقل سلیم کو۔''

ان الفاظ کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی، جسے کریم کے اعلان وقت نے توڑا۔ مجید نے کچھ نہیں کہا۔ چند دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنی کوٹھری میں وہ بہت مضطرب رہنے لگا ہے۔ میں نے اسے آواز دی؛ اس نے جواب نہیں دیا۔ شام کے کھانے کے بعد ہم نے سنگھرش کرتے ہوئے بدن کی آوازیں سنیں۔

مجید واحد شخص تھا جو اس جیل میں خود کو پھانسی لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے کپڑوں کو آپس میں گوندھ کر رسی بنائی، اسے اپنی گردن کے گرد لپیٹا، اپنی پوری قوت سے اسے کس لیا، اپنی شرٹ کا ایک سرا ہوادان کی سلاخ سے باندھا، اور زمین پر لیٹ کر اپنے پیر دروازے سے ٹکا کر زور لگاتا رہا، حتیٰ کہ خود ہی اپنا گلا گھونٹ ڈالا۔

وہ مادر زاد ننگا تھا۔ اس کے بدن پر ضربوں کے نشان تھے۔ لگتا تھا جیسے اس کی جلد کو سگریٹوں

سے داغا گیا ہو۔ وہ بے حد سبک ہو گیا تھا اور اس کی خون جیسی سرخ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

اس کی موت کسی ناٹک کا منظر نہیں تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر کوئی ماسک نہیں چڑھا رکھا تھا۔

افسوس! وہ مکر نہیں کر رہا تھا۔

18

وہ آسمانوں سے گرا، کسی پیغام یا خطا کی طرح۔ کبوتر — فاختہ ہو، شاید؟ — مرکزی ہوادان سے پھسلا اور ہماری گہری تاریکی کی خاموشی میں آگرا۔ استاد الغربی نے قطعیت سے کہا۔

''یہ فاختہ ہے۔ جانتا ہوں کہ میں کس کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔''

کسی نے اس کی بات رد نہیں کی۔ ہمارے نزدیک یہ آسمان سے نازل عجوبے کی مانند تھا۔ کسی کی تدفین یا بیماری کے حملے سے الگ کوئی شے۔ بالکل غیر متوقع طور پر یہ پرندہ ہمارے پاس چلا آیا تھا۔

فاختہ ہر طرف اڑتی پھری، دیواروں سے ٹکراتی رہی۔ استاد نے کبوتروں کی طرح گٹک کر اس کو صدائیں دیں۔ وہ آواز کی طرف آئی لیکن اسے باہر جانے کا راستہ نہیں ملا۔ اس لیے وہ کسی گوشے میں دبک گئی اور شاید سو گئی۔ محافظوں نے جیسے ہی پہلی کوٹھری کا دروازہ کھولا، وہ تیزی سے اس میں داخل ہو گئی، اور یوں محمد کی مہمان بنی۔ محافظوں کو کچھ بھی پتا نہ چلا۔ حسبِ معمول، وہ راشن بانٹ کر جانے کی جلدی میں تھے۔

محمد کسی بچے کی مانند خوش تھا۔ وہ فاختہ سے باتیں کرتا رہا۔ ہم سے کہنے لگا کہ قدرت کی طرف سے نشانی ہے، یہ کہ ہمیں اس کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اسے اپنا پیغام رساں بنانا ہے۔

''ہم اسے اپنائیں گے، اس کا نام رکھیں گے۔ یہ ہماری ساتھی بنے گی، اور ہم اس کی تربیت کریں گے کہ ہمارا پیغام باہر کی دنیا میں لے جا سکے — ہمارے گھر والوں کے پاس، شاید حقوقِ انسانی کے کارکنوں کے پاس بھی...''

''تم اس کو میرے حوالے کر دو،'' استاد الغربی فوراً بول پڑا۔ ''میں اس کو اللہ کا نام لینا

سکھاؤں گا۔ ساری فاختائیں اللہ کو جانتی ہیں۔''

تیرہ نمبر، بوراس، جو فطرتاً خاموش مزاج آدمی تھا، اس ملاقاتی کو لے کر خاصا جوش میں آ گیا۔

''ہم اس کو حریت کہا کریں گے: آزادی۔''

''حریت!'' فاختہ کو کھلاتے ہوئے محمد نے کہا۔ ''ہماری حریت، تو ہمارے پاس پیغام لے کر آئی ہے۔ مجھے یقین ہے تو یہاں محض اتفاقاً نہیں آئی ہے۔ تجھے کس نے بھیجا ہوگا؟ تیرے پنجوں میں کوئی چھلا نہیں، کوئی چٹھی بھی نہیں۔ تو خدا نے تجھے اس غار میں بھیجا ہے۔''

اس کا پڑوسی فلاح، نمبر چودہ، شاعرانہ موڈ میں آ گیا۔

''او میری فاختہ، امن اور سرور کی علامت! آج اگر تو یہاں آئی ہے تو خدا نے ہم پر بڑا رحم کیا ہے، اور ہمارے حق میں سلطان کی طرف سے معافی کا اعلان ہوا ہے۔ جو کچھ دوسروں نے کیا ہے، بہرحال ہم اس کے ذمے دار نہیں۔''

ہماری بولتی گھڑی نے بلا جھجک کہا:

''یہ بات محل کے قواعد میں سے نہیں کہ فاختہ بھیج کر ہمیں ہوشیار کریں۔ اگر کسی دن انھوں نے ہمیں معاف بھی کیا تو اس کا اشارہ وہ ہمیں بہتر غذا اور ہماری جانچ کے لیے ڈاکٹر بھیج کر دیں گے۔ اگر ہمیں رہا کریں گے تو لازم ہے کہ ہم صحت مند ہوں۔ کہتے ہو کہ یہ فاختہ خدا کا انعام ہے۔ ہمارے حالات میں یہ ایک چھوٹا سا موڑ ہے۔''

محمد نے اختلاف کیا۔

''ایک موڑ؟ نہیں، یہ ایک واقعہ ہے۔ کوئی ہم سے رابطہ کر رہا ہے۔ فی الوقت یہ فاختہ میرے ساتھ رہے گی۔ میری مصاحب ہوگی۔''

دوسروں نے احتجاج کیا۔

''نہیں، وہ مشترکہ طور پر ہم سب کی ہے!'' بوراس بولا۔

''چلو جمہوری طریقہ اپنائیں۔'' فلاح نے تجویز رکھی۔ ''ہم سب یکساں طور پر اس کے حقدار ہیں۔ ایک دن اور ایک رات وہ ہر ایک کے ساتھ رہے گی۔''

اور اس طرح جب محافظ کھانا لے کر آتے، حریت حجرہ بہ حجرہ جگہ بدلتی رہی۔ وہ ہم پر ہنستے تھے۔

"فاختہ کو زندہ مت کھا جانا۔ پیٹ میں مروڑ ہو جائے گی،" ایک نے کہا۔

"یہ فاختہ شاید دھوکے کا جال ہے،" دوسرے نے اضافہ کیا۔ "ہو سکتا ہے اسے کوئی چھوت کا روگ ہو۔ تمھیں اس کا نام بدل دینا چاہیے۔ تم لوگ اس کو 'الموت' کہا کرو!"

چند ثانیوں کے لیے میں نے اس پر یقین کر لیا۔ لیکن ہمیں تکلیف پہنچانے کی ان کی فاسد منطق آخری مفروضے کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھی۔ میں نے بچھوؤں والے واقعے پر غور کیا اور ایک مرتبہ پھر یہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی محافظوں نے زہر سے ہماری ہلاکت کے لیے انھیں اندر چھوڑا تھا۔ فاختہ از خود اندر آئی تھی۔ وہ اتفاق کی دین تھی۔ اس نے ہمیں تقریباً مہینے بھر مشغول رکھا۔ وہ ہمارے ساتھ سوتی تھی، ہماری مانند والی غذا کھاتی تھی۔ وہ ہماری تقدیر کی شریک تھی اور جانے کی کوئی بیتابی یا خواہش ظاہر نہ کرتی تھی۔ ایک دن لیکن ہم نے طے کیا کہ اس کو رہا کر دیں گے۔ محمد ہی نے پہلی بار اس کا ذکر کیا تھا۔

"اس مخلوق کو یہاں جیل میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس پرندے کو جانے دیں۔"

"لیکن ہمیں اس کی یاد ستائے گی،" بورا س نے کہا۔

"یہ سچ ہے،" کریم نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم اسے اپنے آس پاس دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔"

میں اس کی ٹانگ سے کوئی پیغام باندھنا چاہتا تھا، مدد کی ایک پکار، بس اتنا ہی کہ لوگ جان لیں ہم لوگ مرے نہیں ہیں۔ لیکن میرے پاس نہ کاغذ تھا، نہ پنسل، نہ دھاگا۔

چنانچہ میں نے اس سے باتیں کیں، جیسے خواب میں بڑبڑا رہا تھا:

"حریت! جب تجھے اپنی آزادی واپس مل جائے گی، جب تو روشنی میں پہنچ جائے گی اور آسمان کی جانب پرواز کرے گی تو ایک لمحے کو کسی مکان کی چھت پر رُکیو، میرے گھر کی چھت پر، وہیں جہاں میں پیدا ہوا تھا، جہاں میری ماں رہتی ہیں۔ وہ مراکش میں ہے، شہر کے اندر۔ تو چھت کو پہچان لے گی۔ وہ تنہا چھت ہے جس کا رنگ نیلا ہے، جبکہ دوسری ساری چھتیں سرخ ہیں۔ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ تو وہاں اترنا اور صحن میں چلی جانا۔ وہاں بیچوں بیچ لیموں کا درخت ہے اور کنواں بھی۔ میری ماں کو وہیں ستانا اچھا لگتا ہے۔ تو ان کے پاس جانا اور ان کے شانے پر اترنا۔ بس ان کی طرف دیکھتی رہنا، اور وہ

تیری آنکھوں میں میرا پیغام پڑھ لیں گی: پیاری مما، میں زندہ ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، میرے بارے میں پریشان نہ رہا کیجیے۔ اللہ کے کرم سے، ایمان کی برکت سے میں سختیوں سے نکل آؤں گا۔ میں اکثر آپ کے متعلق سوچتا ہوں۔ میں خود سے ناراض ہوں کہ میں نے اپنے عمل سے آپ کو ایذا پہنچائی۔ اپنا خیال رکھیے، یہ بہت ضروری ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کو بتائیے کہ میں اس کو بہت یاد کرتا ہوں۔ ماہی کو بتائیے کہ میں نے تاش کھیلنا سیکھ لیا ہے، اور جب میں باہر آؤں گا، اس کو دکھادوں گا کہ میں چمپین ہوں۔ میری بہنوں کو بتائیے کہ وہ میرے خیالوں میں بسی ہیں۔ میں جلد ہی آپ سے ملنے آؤں گا۔ ہم سب کے لیے اللہ آپ کو سلامت رکھے، آپ ہمارے سروں کا تاج ہیں، جو ہم پر عزّ و نور کا سایہ کیے رہتا ہے۔''

ہر کوئی یہی کرنا چاہتا تھا، اس پر پیغاموں کے انبار لگا دینا چاہتا تھا، تا کہ وہ ہماری مصیبتوں کی گواہ رہے۔ جب کوٹھریوں سے پیغاموں کی جھڑی لگی ہوئی تھی، اس وقت فاختہ کو میں نے نرمی سے اپنی گود میں پکڑ رکھا تھا۔

''میرے والدالحاجب میں رہتے ہیں۔ ان کو بتا دینا کہ عبدالسلام زندہ ہے!''

''میری منگیتر زبیدہ سے کہنا کہ میرا انتظار کرے۔ میں جلد ہی باہر آؤں گا!''

''صخیرات جانا اور گولف کورس پر گندگی پھیلا دینا۔''

''میری بہن فاطمہ سے کہنا کہ ہمارے عم زاد سے شادی کرلے۔ میں ان کی شادی میں نہیں آ سکتا...''

''ایمنسٹی انٹرنیشنل کو پتا چلنا چاہیے کہ ہم کن حالات میں بسر کرتے ہیں!''

''جا، آزاد اُڑان بھر... اپنی رہائی کا لطف اٹھا۔''

''مسجد جانا نہ بھولنا، اور ان سے کہنا کہ غائبانہ نمازِ جنازہ کئی بار پڑھیں، ہم میں سے ان سب کے لیے جو مر چکے ہیں...''

''اگر مراکش میں جامع الفنا کی طرف جاؤ تو کبوتروں کے استاد کے پاس رکنا، وہی جو کھیلوں کے لیے کبوتروں کی تربیت کرتے ہیں۔ وہ جیسے ہی تجھے دیکھیں گے، جان لیں گے تو کہاں سے آرہی ہے اور کیا پیغام لائی ہے۔''

''میں، میں اپنے لیے تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگ رہا ہوں۔ بھیجنے کے لیے میرے پاس کوئی پیغام نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرا کوئی نہیں ہے جسے پیغام بھیجوں۔ اس لیے جہاں چاہے چلی جا، جب دل چاہے لوٹ آنا۔ اور دوسرے کبوتروں کو بتا دینا ہم ان کا انتظار کر رہے ہیں۔''

قید خانہ ایسا لگ رہا تھا جیسے نیلامی کے دن کوئی سوق*۔ ہر کوئی غریب فاختہ سے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ ہر پیغام کو پہنچا ہی دے گی۔ میں اپنے ساتھیوں کی سرزنش بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں نے ہی تو یہ سب شروع کیا تھا۔ اب سارے زندان میں پاگل پن کا دورہ سا پڑا ہوا تھا۔ دیوانگی، بے ربط شور، نا قابلِ فہم الفاظ، مضحکہ خیز تصورات۔ پرندہ جیسے پرندہ نہ ہو، ایسا شخص ہو جو ہر طرف سے پیغام سمیٹنے آیا ہے۔

اگلی صبح کو، جیسے ہی دروازہ کھلا، میں نے اسے آزاد کر دیا۔ دہشت میں اس نے چکر کاٹنے شروع کر دیے، حتیٰ کہ ایک محافظ نے اسے پکڑ کر بیرونی دروازے کی جانب اچھال دیا۔

وہ ہمیں یاد آتی تھی۔ ہم مسکراتے ہوئے اس کے بارے میں سوچتے، اس احساس کے ساتھ کہ ہم کس قدر بے بس ہیں۔

19

قبض کے سبب موت۔ ہم میں سے کسی نے ایسا نہ سوچا تھا۔ لوگ عشق میں جان دینے، یا بھوک اور پیاس سے مرنے کی بات کرتے ہیں۔ بوراس اس لیے مر گیا کہ وہ اپنے فضلے کو خارج نہ کر سکا۔ وہ اسے روکے ہوئے تھا، یا شاید ایک اندرونی طاقت اسے باہر آنے سے روکے ہوئے تھی۔ یہ دن بدن اندر جمع ہوتا رہا اور کنکریٹ کی طرح سخت ہوتا گیا۔ بے چارے بوراس نے کسی سے اس کا ذکر کرنے کی جرأت نہ کی۔ اس نے کھانا بند کر دیا، اس امید میں کہ جتنا اس کے اندر جمع ہو گیا ہے، اس طرح اس سے نجات پا لے گا۔ جب اور برداشت نہ کر سکا تو کراہتا تھا اور دیوار پر لاتیں مارتا تھا۔ اور پھر ایک دن اس نے اتنی بلند اور اتنی طویل چیخ ماری کہ محافظ وجہ جاننے کے لیے چلے آئے۔ انھوں نے کچھ

نہیں کیا، بس صورتِ حال کو پرکھا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ وہ جتنا ہنستے تھے، بور اس سے زیادہ واویلا مچاتا تھا۔

''میں اس فضلے کی گھٹن سے مرجاؤں گا! اب اور برداشت نہیں کرسکتا۔ کوئی دوا دے دو، میں تم سے بھیک مانگتا ہوں، کوئی ایسی چیز جس سے سیمنٹ کی یہ اینٹ گھل جائے...''

کوئی جواب نہ ملا۔ انھوں نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔ ان کے کھی کھی کرنے اور مذاق اڑانے کی آوازیں اندر آرہی تھیں۔

''ہمیں ستا رہا ہے کہ ہگ نہیں سکتا!''

''اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی مدد کریں! کیا تصور کرسکتے ہو کہ تم چھوٹے چمچ کی مدد سے اس کے مقعد سے فضلہ کھود رہے ہو؟ چھی چھی!!''

''بس کرو۔ تمھاری باتوں سے مجھے الٹی ہو جائے گی...''

''اگر اس نے خود کو ہلاک کرلیا، کیا تم کمانڈنٹ کی تصویر کھینچ سکتے ہو جو ہیڈ کوارٹر کو یہ بتانے کے لیے رپورٹ لکھ رہا ہو گا کہ نمبر تیرہ مرگیا کیونکہ وہ ہگ نہیں سکتا تھا؟''

''کیا ہی فضلے کے ڈھیر جیسی بکواس ہے!''

''تمھی نے کہا ہے— **فضلے کا ڈھیر!**''

الحسین نے جھاڑو سے، جو اس کے پاس رکھی ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا چمچ بنا دیا۔

''لو، تمھاری طرف لکڑی کا یہ ٹکڑا پھینک رہا ہوں۔ نرمی سے کوشش کرنا۔ زور مت ڈالنا، یا خود کو زخمی نہ کرلینا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پہلے پرسکون ہو جاؤ۔''

نحش سناٹے میں، ہم سب منتظر رہے کہ آگے کیا ہوتا ہے، اس متورم آدمی کا تصور کرتے رہے۔ ایسے میں جب آپ جانتے ہوں کہ کوئی جلاب یا ارنڈی کا تھوڑا سا تیل اس کی رفع حاجت کے لیے کافی ہوتا... لیکن ہم عالمِ حیات میں نہیں تھے۔ ہم موت کے گڑھے میں تھے۔ ہر ایک اپنی بدبختی کے ہمراہ تھا۔ کس نے سوچا ہو گا کہ یہ توانا شخص، یہ تنومند پہاڑی لڑکا ایک دن غبارے کی طرح پیٹ پھولنے کے سبب مرجائے گا۔

میں اس کی آوازیں سن رہا تھا، اسے تصور میں دیکھ رہا تھا، اور خوفزدہ تھا۔ ایسا ہم میں سے کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا تھا۔ ہم کسرت نہیں کرتے تھے، ہمیشہ ایک ہی طرح کا بے ذائقہ مانڈ والا، بغیر مسالوں کا کھانا کھاتے تھے۔ میں نے عزم کیا کہ آئندہ زیادہ پابندی کے ساتھ جمناسٹک کیا کروں گا، جس حد تک بھی ممکن ہو سکے۔ میرے پاس جگہ تنگ تھی، لیکن جھکے جھکے یا بیٹھ کر بھی میں اپنے ہاتھ پاؤں حرکت میں رکھنے، کودنے اور ہلکی پھلکی سودمند کسرتیں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں پشت کے بل لیٹ جاتا، پیر دیوار سے لگا لیتا اور پھر گھٹنوں کو اپنے سینے تک سکیڑ لاتا۔ پھر میں اکڑوں بیٹھ کر آگے کی جانب اور پھر الٹے قدموں ڈک واک کرتا۔ ضروری تھا کہ میرے اعضا محنت کے عادی رہیں۔

بوراس نے لکڑی کے ٹکڑے کو زیادہ زور سے گھسایا جس سے اس کا مقعد زخمی ہو گیا۔ آنتوں سے فضلے کے بجائے صرف خون خارج ہوتا رہا۔ ایک لمحہ ایسا آیا کہ اس پر شدید مایوسی کا ایک اور دورہ پڑ گیا۔ اس نے آخری بار، بہت زور سے چیخ ماری اور ڈھیر ہو گیا۔ اتنی شدید جدوجہد کرنے کے بعد اس کا فضلہ ضرور خارج ہوا ہوگا۔ دوسرے دن وہ چل بسا۔ موت نے اس کے عضلۂ عاصر کو ڈھیلا کر دیا، اور اس کے بدن نے ہر شے باہر نکال دی۔ خون اور فضلے کی بدبو نے ہمارے سانس روک دیے۔ محافظوں نے جب آ کر دیکھا تو اس بار انھیں ہنسی نہیں آئی۔

''ہم اس کو بچا سکتے تھے،'' انھوں نے اپنے منھ اور ناک پر ہاتھ رکھے رکھے ذرا خجالت سے کہا۔ ''ہمیں لگا کہ وہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم جانتے ہو، بوراس ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیلہ بازی کرتا رہتا تھا... کون یقین کرے گا کہ قبض سے بھی آدمی مر جاتا ہے۔ خیر، اب یہاں کی صفائی کرنی ہوگی، البتہ اگر کمانڈنٹ طے کرے کہ تم لوگ اس فضلے کے حقدار ہو، تو دوسری بات ہے۔''

اس کے پیچھے کوئی خود غرضانہ مقصد تھا یا رحم کا جذبہ؟ ایک اور محافظ نے ہمیں بتایا کہ اس دن کے بعد سے ہماری غذا میں کوئی جلاب ملایا جانے لگا تھا۔ اس کے بعد قبض کے سبب کوئی المیہ واقعہ نہیں ہوا۔

مخصوص حالات کے بھدے پہلوؤں نے ہمیں دل شکستگی محسوس کرنے سے بچا رکھا تھا۔ بنیادی طور پر اداس ہونے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ہم نہ تو خوش تھے، نہ اداس۔ غم و اندوہ ہم سے دور جا چکا تھا۔ جب بھی ہم میں سے کوئی خود کو اداسی کے دام میں پھنسنے دیتا، ضائع ہو جاتا تھا۔ افسردہ آدمی خوش قسمت ہوتا

ہے: وہ ایک نارمل زندگی بسر کرتا ہے — کیونکہ افسردگی اس کی زندگی میں ایک گزرتا لمحہ ہے، کوئی مستقل حالت نہیں۔ سنگین ترین بدبختی کے ساتھ بھی ایسا وقت آتا ہے جہاں فراموشی شروع ہوتی ہے اور جہاں پست ہمتی ماند پڑنے لگتی ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی اختیار نہ تھا۔ کیونکہ ہمارے معاملے میں افسردگی کی حیثیت بس ہلکی سی سوزش جیسی تھی، ایک معمولی زخم جیسی، جسے الکحل کے پھاہے سے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ اپنے تہہ خانے میں ہمیں رونے کا کوئی حق نہ تھا۔ کوئی نہیں تھا جو ہمارے آنسو پونچھتا۔ جو رونے لگتے تھے وہ جانتے تھے کہ اب وہ اس دنیا میں زیادہ دن کے لیے نہیں ہیں۔ آنسو اس چہرے کو دھونے کے لیے بہتے تھے جس کو عنقریب موت چومنے والی ہوتی تھی۔

اس رات میرا ذہن مرکز سے ہٹ گیا۔ کیا میں بیدار تھا؟ یا پھر کوئی بے معنی خواب تھا جس میں ساری چیزیں باہم الجھی ہوئی تھیں؟ سفید لباس میں موت جس پر تتلیاں — زندہ تتلیاں — چپکی ہوئی تھیں؟ کوئی بات تو تھی جو گڑبڑ تھی... دوسری تصویریں میرے دکھتے ہوئے سر سے باہر نکل گئیں۔

چکی۔ گھر۔ سر نیچے کی جانب۔ میں اپنے ہاتھوں کے بل چل رہا ہوں۔ میرا بدن سڑ رہا ہے۔ ایک بھٹ کے اندر، یہ اضافہ کردوں۔ سر دور جا پڑا ہے۔ زمین ایک طرف کو جھک رہی ہے۔ چکی چلنا شروع ہوگئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں، یہ میرا سر ہے جو صحن کے بیچوں بیچ اچھال دیا گیا ہے۔ زیتون کے قدیم درخت کے سوکھے ہوئے تنے کے قریب۔ میں دوڑ کر گھر میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میری ماں مجھے پکار رہی ہے۔ حلق میں میری آواز پر تالے پڑ چکے ہیں۔ چھٹی کا دن ہے۔ میں غائب ہوں۔ میں ان سب کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میں کھارے پانی میں تیر رہا ہوں۔ میں اس کے منبعے کو ڈھونڈتا ہوں۔ میں سمندر کو تلاش کرتا ہوں۔ وہ دیکھو، مکڑی۔ اس نے سورج کو ڈھانپ لیا ہے۔ میں روشنی کو چھونے کے لیے آگے بڑھتا ہوں، اس کی بصارت کش چمک میں کھونے کے لیے۔ مجھے بالکل تھکن نہیں۔ میری ماں عود جلا رہی ہیں۔ میری بہنیں میز پر چڑھتی ہیں اور ناچنے لگتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے، ''مجھے عین موقعے پر پکڑ لیا گیا۔'' میں اپنا داہنا ہاتھ دانتوں سے کاٹتا ہوں۔ بالکل اچانک میرے تین دانت گر پڑتے ہیں۔ میں اپنے بالوں کے گھنے گچھے کو کھینچتا ہوں۔ ایک لٹ بھی نہیں اکھڑتی۔ چیونٹیاں میری ڈاڑھی میں رہتی ہیں۔ نہیں جوئیں نہیں، میں نے چیونٹیاں کہا ہے۔ وہ آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ میں اپنی ڈاڑھی کو ہلاتا ہوں۔ وہ پوری قوت سے چمٹ جاتی ہیں، موت قریب سے گزرتی ہے۔ لگتا ہے کہ

عجلت میں ہے۔ سنگِ اسود ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا ہوا ہے۔ میں دوسرے میں انگوٹھی رکھ دیتا ہوں۔ چکی کا پاٹ گھومتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور ہر شے کو پیستا چلا جاتا ہے۔

20

ایک زمانہ تھا جب میں مراقبے کے لیے روحانیت کے راستے پر اکثر ٹھہر جاتا تھا، معمولی لیکن اہم باتیں سیکھتا تھا۔

کسرتیں کر کے میں ذہن کو زیادہ مرکوز کرنے میں ماہر ہوتا جا رہا تھا۔ رات میں ایک عورت کو دیکھتا تھا جو ہمیشہ میری جانب پشت کیے کھڑی رہتی تھی، اور جب وہ بولتی تھی، میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کیے بغیر سنتا تھا۔ آہستگی سے آگے بڑھتے ہوئے وہ مجھے مراکش میں سات صوفیوں کی زیارت کے لیے اپنے پیچھے آنے کو کہتی تھی، جو بچ جانے والوں، غریبوں اور مرنے والوں کے روحانی رہنما تھے۔

سات آدمی۔ سات مقامات۔ سات دعائیں۔ چہرے ابد کی جانب کیے ہوئے، کنارہ کشی کا سبق، عزلت نشینی کی تربیت، اور روحانی ترفع۔ میں ان سات صوفیوں سے واقف تھا۔ جب چھوٹا تھا تو میری ماں مجھے اپنے ساتھ ان کی زیارت کے لیے لے جاتی تھی، ایک ایک کر کے۔ وہ ان سے اس طرح باتیں کرتی تھی جیسے وہ سن رہے ہوں، جیسے وہ طلائی تار سے کڑھی قرآنی آیتوں والے سبز یا سیاہ حریر سے ڈھکے مقبروں میں زندہ ہوں۔ وہ انھیں اپنی زندگی، اپنی مشکلات اور اپنے دکھوں کے متعلق بتاتی۔ وہ ان سے مدد مانگتی، چلتے رہنے کی طاقت کی خواستگار ہوتی۔ ماں کی باتوں میں مداخلت کی خواہش کے بغیر میں باتیں سنتا رہتا۔ زیارتوں کے لیے چکر کاٹنے والی وہ تنہا عورت نہیں تھی۔ بے شمار عورتیں، ناخوش بیویاں، گریہ کناں مائیں، کنواری لڑکیاں اور بانجھ عورتیں! ہماری ایک پڑوسن کا شوہر لاپتا ہو گیا تھا۔ دو آدمی اسے بلا کر لے گئے تھے، فروخت کے لیے گھر دکھانے کو — وہ املاک کی خرید فروخت کے کاروبار میں ایجنٹ تھا — اور وہ کبھی نہیں لوٹا۔ اس کے بچے پولیس کے پاس گئے، جہاں سے ہر بار انھیں ایک ہی جواب ملتا تھا: ”ہماری تفتیش جاری ہے۔ جیسے ہی ہمیں کوئی سراغ ملے گا، ہم تم سے رابطہ کریں گے۔“ لیکن ہر شخص جانتا تھا کہ اسے اغوا کر کے کسی کھائی میں ڈال دیا گیا ہے۔ شاید اس

کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک ایسے وِلا سے متعلق مشکوک کاروبار میں ملوث تھا جو اخلاقی جرم کے لیے ملک بدر ہونے والے ایک غیر ملکی کا تھا اور اسے ایک طاقتور پولیس افسر نے ضبط کر لیا تھا۔ وِلا کے مالک نے اسے فروخت کرنے کی ہدایت دی تھی جس پر املاک کے ایجنٹ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اس جائیداد کو بھول جائے۔ یہ برائے فروخت نہیں اور اب وہ فرانسیسی اس کا مالک نہیں ہے۔ اس نے اس مشورے کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور اسی لیے غائب کر دیا گیا تھا۔

اس کی بیوی جو ہماری ہمسائی تھی، ہر جمعے کو سات صوفیوں سے بات کرنے جاتی تھی۔

"مجھے انصاف ملے! میرا شوہر میرے پاس لوٹ آئے! اگر وہ مر چکا ہے، اگر انھوں نے اسے قتل کر دیا ہے، تو مجھے یہی خبر مل جائے۔ اب مجھے نیند نہیں آتی۔ میں نے اس کا کفن تیار کر دیا ہے اور منتظر ہوں۔ میں نے حجلۂ عروسی بھی تیار کر رکھا ہے۔ جب وہ لوٹے گا، ہم پھر سے عقد کریں گے، جیسا کہ ہم نے پہلی ملاقات کے دن کیا تھا۔ ہم بچے پیدا نہیں کریں گے، بلکہ بے انتہا پیار کریں گے۔ رسول سے میری شفاعت کیجیے، منبعِ صداقت کے حضور میں، اس نور سے جو آپ کے مقبرے سے نکلتا ہے، میری شفاعت کیجیے کہ مجھے اپنے شوہر کا پتا ملے! یہاں میری کوئی نہیں سنتا، مجھے کوئی جواب نہیں دیتا۔ یہاں بزدل لوگ بستے ہیں..." اس نے مقبرے کی ایک کھڑکی کی سلاخ پر قفل لٹکایا، اس کو بند کیا اور چابی نالے میں پھینک دی۔ وہ ہر جمعرات کو یہ دیکھنے کے لیے لوٹتی تھی کہ تالا کھلا یا نہیں، جو اس بات کی علامت تھا کہ تقدیر اس کے شوہر کو اس کے پاس بھیج دے گی۔

اپنی رات میں میں اس پرچھائیں کے پیچھے ہو لیا۔ وہ میری ماں نہیں تھی۔ شاید ماں نے اسے میرے پاس بھیجا تھا۔ کیا ماں بیمار تھی؟ ضرور اس کا یہی پیغام ہے۔ اپنے اس احساس کی تائید کے لیے مجھے اور شدت سے کشف کرنا تھا۔ میری ماں اور اپنے شوہر کی متلاشی اس عورت نے، میری ماں اور اس پرچھائیں نے، میں جس کے پیچھے گیا تھا، میری گہری خاموشی میں مجھ سے باتیں کیں۔ مجھے پورا یقین ہو گیا۔ شک کی اب کوئی گنجائش نہیں تھی: میری ماں بیمار تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں اپنے دکھتے بدن میں واپس آ گرا۔ میں نے اس کا زرد چہرہ، بخار زدہ آنکھیں دیکھ لی تھیں۔ وہ اذیت میں تھی۔ یہ کوئی عارضی بیماری نہیں تھی۔ نہیں، میری ماں سنگین خطرے میں تھی۔ مجھے اسی تصویر کے ساتھ جینا تھا، اور اس

نے مجھے مزاحمت کی اور بھی زیادہ قوت اور ہمت دی۔

روحانیت کی راہ میں اس مرحلے پر، میں خاصے فطری انداز میں 'شفاف خانۂ تنہائی' میں داخل ہو گیا جہاں نالہ وزاری بے سود تھی، لیکن جہاں ہر پتھر، خاموشی کا ہر لمحہ، ایسا آئینہ تھا جس میں روح منعکس ہوتی ہے — کبھی سبک اور پُراعتماد، کبھی زخمی اور مکدّر۔ یہ گھر میری نصرت کا گھر تھا، خالص میرا ہی راز، ایک ایسا باغ جس میں میں پناہ لیتا تھا۔ میں پنجوں کے بل اپنی کوٹھری سے باہر نکل جاتا تھا۔ اپنے بدن کا ڈھانچہ وہیں چھوڑ کر، اڑ کر میں اس کشادہ کوٹھی کی دھوپ بھری چھت پر پہنچ جاتا تھا۔ یہ کافی خستہ حال تھی، پھر بھی میرا خیر مقدم کرتی۔ رات کے خاتمے پر، چلتے رہنے کی خواہش پھر سے جگا کر مجھے راحت پہنچاتی۔

یہاں مجھے سنگِ اسود اور اس زیارت کے متعلق سوچنے کی فرصت تھی جس کا میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ کعبہ، مکہ اور مدینہ کا ہی انتخاب کیوں؟ یہ مقدس مقامات اس مذہب کے تھے جس میں میری پرورش ہوئی تھی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ مذہب کو ایک نجی شے ہی رہنا چاہیے۔ لیکن کتنی بار مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اسلام ہمارا فرقہ ہے، ہماری شناخت ہے، یہ کہ ہم سب سے مل کر ملت بنی ہے، خدا کی بہترین اور خوبصورت ترین مخلوق۔ میں جب اہرمیمو میں تھا، میں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی تھی۔ خدا پر میرا عقیدہ تو تھا، لیکن شکوک وشبہات بھی کبھی کبھی سر ابھارتے تھے۔ جسم کے ضیاع کے ساتھ ایک آہستہ رو موت کی سزا جب سے ملی تھی، میں نے خدا کو متواتر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ موت کی قربت، وقار کے زیاں اور میرے اطراف میں پھیلے ہوئے ظلم وجبر نے مجھے ایک شفاف عزلت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

میرا باغ حقیر سا ہے۔ چند سنگتروں کے پیڑ، ایک دو لیموں کے درخت، مرکز میں ٹھنڈے پانی کا کنواں، سبز گھاس اور ایک کمرہ سردی اور برسات میں سونے کے لیے۔ اس کمرے میں کچھ بھی نہیں ہے، صرف ایک چٹائی، ایک تکیہ اور ایک کمبل۔ دیواریں نیلے رنگ کی، چونے سے پتی ہوئی۔ جب دن کی روشنی بجھ جاتی ہے، میں دو شمعیں جلاتا ہوں اور مطالعہ کرتا ہوں۔ شام کو، اپنے باغ کی سبزیاں کھاتا ہوں۔ ایک بوڑھی دہقان عورت، جو اسی علاقے میں رہتی ہے، ہر روز اسی وقت میرے لیے روٹی لے کر آتی ہے۔ یہی میرا راز ہے، میرے خوابوں کی زندگی، ایسا مقام جہاں مجھے غور وفکر کرنے کے لیے

جانا اچھا لگتا ہے۔ دعا کے لیے اور اُن لوگوں کو یاد کرنے کے لیے جواب موجود نہیں۔ مجھے کسی اور شے کی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ملکیت ہونی بھی نہیں چاہیے، کچھ حاصل کرنا بھی نہیں چاہیے۔ سبک رہو، خوش مزاج رہو، جانے کے لیے کمر بستہ رہو اور ہر شے تیاگ دو، تن کو ڈھاپنے کے لیے بس ایک معمولی جلابہ ہو۔ موت کی طرف سے اپنے ذہن کو دور رکھنے کے لیے مکمل کنارہ کشی سے بہتر کچھ نہیں۔ حالانکہ میری ذات اب میرے حواس پر حاوی نہ ہوتی تھی، لیکن میرے ساتھیوں کی موت مجھے اب بھی مضطرب کرتی تھی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہم سب کنارہ کشی کے اس حال تک مل کر پہنچتے اور موت پر فتح پا لیتے۔ لیکن بیماری، آہستہ رو فرسودگی، تکلیف — یہی چہرہ تھا موت کا۔ منھ کھلا شگاف۔ بعض لوگوں نے اپنی کوٹھری کو چھوڑے بغیر تاریکی میں قدم بڑھایا، اور ایک چور شگاف میں گر پڑے جس نے انھیں مرطوب پاتال میں پہنچا دیا۔

جب میں باغ میں جاتا تو خوش ہو جاتا۔ میں محسوس کرتا کہ میں وقت، حافظے، ناانصافی اور ان تمام مظالم کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں جو ہم پر روا رکھے گئے تھے۔ باغ میں جانے کو میرا دل چاہتا تھا، صرف اتنی بات اس میں داخل ہونے کے لیے کافی نہیں تھی۔ اپنے خول سے خود کو نکالنے میں، دوسری دنیا میں داخل ہونے میں مجھے وقت لگتا تھا۔ یہ آسان نہ تھا۔ کامیاب ذہنی ارتکاز خصوصی حالات کا متقاضی تھا — صرف خاموشی کافی نہیں تھی۔ مجھے کامل سیری کبھی نہ ملتی تھی کیونکہ میں اکثر اپنی تکلیفوں کو بھول نہیں پاتا تھا، خصوصاً ان دنوں جب میرے دانت گرتے جا رہے تھے۔ دانت کا درد نہ صرف شدید تکلیف دیتا تھا بلکہ پسپا کر دیتا اور مثالی روحانیت کی طرف میرے سفر کی راہ گم کر دیتا تھا۔ سوچ بچار، غور و فکر، مزاحمت کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ یہ ایسی عقوبت تھی جس کے تجربے سے ہم سبھی گزرے تھے۔ ایک سے زائد بار میں نے ڈاڑھ اکھاڑنے کی کوشش کی، بس اتنا ہی کر پایا کہ زندہ گوشت کے لوتھڑے پر یہ آدھی لٹک گئی جس سے میرے درد کی شدت دگنی ہو گئی۔ شدت کی ٹھنڈ میں، دم گھونٹ گرمی میں، اور گٹھیا کے درد کے حملوں کے دوران میں نے اپنے بدن کو اپنے قابو میں کرنا سیکھ لیا تھا، لیکن دانت کے دردوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ایک ایک کر کے ہمارے جسموں کے اعضا گلتے جا رہے تھے۔ میری واحد ملکیت میرا ذہن تھا،

اور میرا شعور۔ اپنے ہاتھ اور پیر میں نے ظالموں کے حوالے کر دیے تھے، اس امید میں کہ وہ میری روح پر، میری آزادی پر، صاف ہوا میں میرے سانس لینے پر اور تاریکی میں میری روشنی کی کرن پر قابو نہ پا سکیں گے۔ ان کے منصوبوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر لی تھیں۔ میں نے اپنے بدن کو ترک کرنا سیکھ لیا تھا۔ بدن وہ ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اسے دیکھ سکتے تھے، اسے چھو سکتے تھے، تپتی ہوئی سرخ تیغ سے اسے کاٹ سکتے تھے، اس کو اذیتیں دے سکتے تھے، اسے بھوکا مار سکتے تھے، اسے بچھوؤں اور تند سردی کے حوالے کر سکتے تھے، لیکن میرا سارا سنگھرش اپنے ذہن کو ان کی رسائی سے دور رکھنے کا تھا۔ یہی میری واحد قوت تھی۔ اپنے اسیر کنندوں کے مظالم کا مقابلہ میں اپنی عزلت سے، اپنی لاتعلقی سے، اپنی بے حسی سے کرتا تھا۔ میں در حقیقت لاتعلق تو نہ تھا، نہ ہی بے حس، بلکہ جو کچھ وہ ہمارے ساتھ کرتے تھے اس سے خود کو کنارہ کش کرنے کی تربیت دے رہا تھا۔ تم لاتعلق ہو بھی کیسے سکتے ہو؟ تمھیں چوٹ لگتی ہے، تمھارے بدن کو زنگ آلود دھات سے چھیدا جاتا ہے، خون بہتا ہے، تمھارے آنسو بھی بہتے ہیں، تم کچھ اور سوچتے رہتے ہو، تم اپنی پوری قوت سے بچنے کی کوشش کرتے ہو، کسی اور زیادہ بڑی اذیت کو بلاتے ہو۔ سرخ کوکنار یا سفید ڈیزی کے چمن کے محض تصور سے تم وہاں سے نہیں فرار نہیں ہو سکتے۔ نہیں، اس طرح کا فرار مختصر ہوتا ہے، زیادہ پراسرار بھی نہیں ہوتا۔ یہ از حد آسان ہوتا ہے۔ میں شروع میں اسی طرح کے چمن زار میں پہنچ جاتا تھا لیکن اذیت مجھے جلد ہی اسی تہہ خانے میں لا پٹختی تھی۔ اس کے بعد ہی میں یہ سمجھ سکا کہ ایک درد کو اس سے زیادہ مہیب درد کا تصور کر کے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔

میری خوش بختی تھی کہ میرے تخیل کو کوئی زک نہیں پہنچی تھی۔ اسے کسی بھی چیز سے جلا مل جاتی تھی۔ اپنے ساتھیوں کے اتفاقاً ادا کیے ہوئے کسی لفظ سے میں اس کے اردگرد پوری کہانی بُن سکتا تھا۔ مجھے لفظوں کی تاریخ کے اندازے لگانے میں مزہ آتا تھا۔ مثلاً لفظ ''کافی''۔ میں گھنٹوں اس تصور میں گزار دیتا تھا کہ کافی کی پھلیاں کہاں سے آتی ہیں، کس نے انھیں دریافت کیا ہوگا، کسی کو یہ خیال کیونکر آیا ہوگا کہ انھیں بس اتنا بھونا جائے کہ پیسا جا سکے، اور کس نے اس گہرے کتھئی پاؤڈر کو ابالنے کی کوشش کی ہوگی، اس سے بننے والے سیال کو فلٹر کیا ہوگا، اس کو چینی یا چینی کے بغیر پیا ہوگا، اس میں دارچینی یا کوئی دوسرے مسالے ڈالے ہوں گے۔ کس طرح کافی سے ساری دنیا واقف ہوئی ہوگی، کچھ لوگوں کے لیے

یہ دوا ہی ہوگی، بقیہ کے لیے عادت۔ میں نے دھوپ بھری پہاڑی تلہٹیوں میں سبز کافی کے کھیتوں کا تصور کیا۔ میں نے اس وقت کا حساب لگایا جو کافی کا پودا لگانے سے لے کر اس دن تک درکار ہوتا ہے جب میں کسی کیفے میں جا کر کہہ سکتا ہوں — اس کے بارے میں سوچے بغیر، اپنے اطراف سے غافل ہو کر — ''کافی پلیز، بلیک اینڈ اسٹرانگ...''۔ میں نے اس کے سفر کا، اور مراحل کا تصور کیا، بچولیوں کا، فروخت کرنے والوں اور خریداروں کی کڑی کا، ان فیکٹریوں کا جہاں کافی کو کئی سطحوں پر پروسس کیا جاتا ہے، میں نے تصور کیا کہ وہ 'عربکا' کافی کو کس طرح 'روبستا' کافی میں ملاتے ہوں گے، وہ بہترین قسم کی فصل کا تعین کیسے کرتے ہوں گے اور اسے ان امیر لوگوں کے لیے محفوظ کرتے ہوں گے جو صبح کو بہترین کافی پینا چاہتے ہیں۔ میں نے ایسے محل کا تصور کیا جس میں بادشاہ یا شہزادہ اس وقت تک بستر سے نہیں اٹھتے جب تک وہ کوستاریکا سے منگائی ہوئی تند عربکا کافی کی دو پیالیاں نہ پی لیں جسے اطالویوں نے برشتہ کیا ہو اور نیپالٹن شیف نے تیار کیا ہو... میں نے اس پر بھی سوچا کہ جنھیں کافی نہیں ملتی وہ کس طرح وحشت زدہ رہتے ہیں — یا پھر حد سے زیادہ پیتے ہیں۔ عرصہ ہوا کہ میں وحشت زدہ ہونا چھوڑ چکا تھا۔ لگتا ہے وہ ہمارے صبح کے سیال میں برومائڈ یا کوئی دوسری تسکین بخش دوا ملاتے تھے تاکہ ہمارے تناسلی اعضا کام کرنا بند کر دیں۔ اہرمیمو میں مجھے ایک باورچی نے ایسا بتایا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ کافی کے بڑے برتن میں کوئی سفید سفوف ڈالتے تھے، لیکن ہماری چھٹیوں سے قبل کبھی نہیں۔ مجھے معلوم تھا۔ فوج ہر جگہ اپنی ناک گھساتی ہے۔ کوئی بات اس کی نظروں میں آنے سے نہیں بچ سکتی۔ جب تم باہر ہوتے ہو، اپنی فیملی میں یا کسی چکلے میں، فوج کی نظر تب بھی تم پر ہوتی ہے۔ امن کے دنوں میں بھی تم اسی کی ملکیت ہوتے ہو، جس طرح جنگ کے دنوں میں۔ اب ہم جہاں تھے، یہاں بھی ہمارے بدن ٹکڑے ہو کر ختم ہونے کے لیے تھے۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ سب سے پہلے میرا ذکر بیکار ہوا۔ میں اسے بالکل بھول چکا تھا اور اس کے وجود کو اور بعد میں اس کی حالت کو نظر انداز کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے میں جنسیت پر عموماً، اور ہم لوگوں کی جنسیت پر — مراکش میں — خصوصاً تفصیل سے غور کر سکا۔ میں نہ تو ماہرِ نفسیات تھا، نہ ماہر جنسیات، لیکن جب ہم ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹ تھے تو میں نے اپنے ساتھیوں کا ایک مخصوص رویہ دیکھا تھا۔ میں بھی انھی جیسا تھا: میری جنسیت کمزور تھی، بے صبر اور تقریباً حیوانی۔ ہم لوگوں کی مختصر چھٹیاں اور شام کو تقسیم کیے جانے والے پاس مجھے یاد تھے۔ اپنی دریا دلی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے کمانڈنٹ کوئی درجن بھر کیڈٹوں کا انتخاب کرتا کہ وہ نزدیکی گاؤں میں جا کر اپنے فوطے خالی کرآئیں۔ یہ — غیر رسمی طور پر ''فک پاس'' کہلاتا تھا۔ ہر ایک کا نمبر آتا تھا۔ مجھے ایک گھر یاد ہے جس میں شمعیں روشن تھیں اور جس کا اندرونی صحن قالینوں سے بھرا تھا، اس میں ہر طرف کمروں کے دروازے کھلتے تھے جن میں مزید قالینوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ مجھے ایک فربہی مائل عورت یاد ہے جو ایک کمرے کے بیچوں بیچ بیٹھی ہوئی تھی، اور اسے چار پانچ لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔ ایک بوڑھی عورت ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لیے ہوئے اندھیرے میں سے نمودار ہوئی تھی، اس کے پیچھے ایک لڑکی نظر آئی جس کی عمر بمشکل دس برس تھی۔ اس کے ہاتھ میں شہد بھری پوریوں کا پیالہ تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ میرے ساتھی میری بہ نسبت وہاں زیادہ جایا کرتے تھے۔ فربہ عورت نے جو اس مقام کی مالک تھی، ہم میں سے ایک کو نام لے کر پکارا۔

''بہت دن سے نظر نہیں آرہے ہو! تمھیں سزا ملی تھی کیا؟ افسروں کو تم پر رحم نہیں آتا؟ بیلوں کو تھان پر باندھ دیا! کس قدر شرم کی بات ہے! جب میں اپنی لڑکیوں کا سوچتی ہوں، جو اپنا دن قالین بنتے گزارتی ہیں اور مجھ سے بار بار پوچھتی رہتی ہیں کہ آج شام کوئی ملاقاتی آئے گا یا نہیں... تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کیا جواب دوں۔''

ہم منمنا کر رہ گئے، کچھ نہ کہا۔ پھر چائے پی اور شہد کی پوریاں کھائیں۔ اس درمیان اپنی اپنی پارٹنر، بلکہ شکار کا انتخاب کرنے کی غرض سے لڑکیوں کی جانب دیکھتے رہے کیونکہ یہ کام ہم عجلت میں اور بدسلیقگی سے کرتے تھے۔ اگلی بار آنے کا خیال ذہن میں لیے ہوئے ہم لوگ ہمیشہ ہی اس فعل کو نمٹانے اور بدنصیب لڑکیوں کو اجرت ادا کرنے کی جلدی میں ہوتے تھے۔ چائے کے بعد مالکہ شمعیں بجھا دیتی اور ہم ایک ایک لڑکی کے ساتھ چل دیتے۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر، جیسے سب کچھ پہلے ہی طے پا چکا ہو۔ اندھیرے میں ہم سرگوشیوں کی اور تیز تیز سانسوں کی آوازیں سنتے اور چند منٹوں بعد کسی کی گھٹی ہوئی آواز سنتے؛ مرد کی وہ آواز جو وہ اپنا بوجھ اتارتے وقت نکالتا ہے۔ جس وقت ہم جانے کے لیے کھڑے ہوتے تو لڑکیاں چت لیٹی رہتیں، ٹانگیں پھیلائے ہوئے۔ ان میں سے بعض کہتیں، ''بس مردوں کی طرح! اندر اور باہر!'' ہم تھوڑی دیر ذرا شرمائے ہوئے کھڑے رہتے، جانے کو بیتاب۔ پھر باہر گلی میں قطار لگا کر کھڑے ہو جاتے اور دیوار پر پیشاب کرتے، اس یقین کے ساتھ کہ ان جراثیم سے جو ہمیں

لگ گئے ہوں گے، نجات پا رہے ہیں۔ مجھے اس پر کبھی فخر نہیں ہوا تھا۔ ہر بار میں عزم کرتا تھا کہ قالینوں کے تاجر، موٹے کوادا اور میڈم کے گھر دوبارہ نہیں جاؤں گا۔

21

اس قسم کی یادیں میرے لیے غیر اہم تھیں۔ مجھے ان یادوں کو مٹانے اور جلانے کی پروا نہیں تھی، جیسا کہ میں دوسری یادوں کے ساتھ کرتا تھا۔ بلکہ ان کو یادیں کہا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ تو ایک ایسے دور کی مٹیالی تصویریں تھیں جب ہم خاصے بے فکرے ہوتے تھے، ہماری آرزوئیں ایک قابل فوجی بننے تک محدود تھیں، مستقبل میں شاہی مسلح فوجوں کے افسر بننے کی تھیں۔ ہمارا مطالعہ بھی اعلیٰ درجے کا نہیں تھا، لیکن ہم زیادہ برے بھی ثابت نہیں ہوئے تھے۔ مجھے پڑھنے سے رغبت تھی۔ یہ میرا جنون تھا۔ ہر بار کی چھٹیوں کے بعد گھر سے لوٹتے وقت میں فاس سے کتابیں خرید کر لاتا تھا۔ کتب فروش ایک بوڑھا آدمی تھا جو خاصا کوتاہ بین تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کتابیں بیچتا ہے کیونکہ اسے عورتیں اچھی لگتی ہیں، وہی اس کی اصلی خریدار تھیں۔ وہ ان کی پسند اور ترجیحات سے واقف تھا۔ کسی ڈاکٹر یا عطار کی طرح وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کس خاتون قاری کو کون سی کتاب پڑھنے کا مشورہ دے۔ اس کے پاس ہزاروں کتب بے ترتیب انبار کی صورت میں جمع تھیں، جنھیں وہی سمجھ سکتا تھا۔ میرے لیے وہ فرانسیسی کلاسیکی ناول اور عربی شاعری کی جلدیں الگ رکھتا رہتا تھا۔ مطالعہ میرے لیے چور دروازہ تھا جس میں داخل ہو کر میں ملٹری اسکول سے نجات پا لیتا تھا، یا تربیت کے تشدد کو بھول جاتا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جاہل نان کومز کو ذہن سے دفع کرنے کے لیے مطالعہ کرتا تھا، جو اپنے احکامات عربی اور فرانسیسی کی درمیانی مسخ زبان میں چیخ چیخ کر دیتے تھے۔ مثلاً ''فال ان'' کے لیے ''فیلین''، ''ایگزیمپٹ'' کے لیے ''گزیم''، ''پرمشن'' کے لیے ''برمشن'' وغیرہ۔

جب میں کال کوٹھری میں تھا تو تنہائی میں بابا گو ریو کے صفحے میرے پاس چلے آتے۔ اکثر غیر متوقع لمحوں میں، مثلاً اس وقت جب میری ڈاڑھ میں درد تھا اور میں منھ تک نہ کھول سکتا تھا۔ الفاظ اور جملے بہتے چلے آتے اور میں انھیں خود کو اس طرح ادا کرتے ہوئے سنتا جیسے کسی بیمار بچے کو

سنا رہا ہوں، یا کلاس روم میں املا کی مشق کرا رہا ہوں۔ اس کا یاد آنا خدا کی جانب سے رحمت کی طرح تھا۔ اس کے کرم سے میرے حافظے نے برسوں پہلے پڑھے ہوئے سینکڑوں صفحے یاد دلا دیے۔ یہ مجھے بلاسعی یاد آتے گئے: میرے سامنے صفحات خود بخود کھلتے چلے جاتے تھے۔

''تیسرے سال کا خاتمہ ہوتے ہوتے بابا گوریو نے اپنے اخراجات مزید گھٹا دیے، اس طرح کہ پینتالیس فرانک ماہانہ کرائے کا بجٹ بنا کر وہ چوتھی منزل پر منتقل ہو گیا۔ اس نے تمباکو نوشی ترک کر دی، بالوں کے آرائش گر کی خدمات موقوف کر دیں، اور پاؤڈر کا استعمال چھوڑ دیا۔''

میرے بعض ساتھی اس اقتباس پر ہنس پڑے، اس خیال پر کہ آدمی پاؤڈر کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ میں انھیں وہ سماجی و سیاسی سیاق کس طرح سمجھاتا جس میں بالزاک لکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے کندھے اچکائے اور بات جاری رکھی۔

''گوریو ایک عمر دراز 'لبرٹین' (جنسی آزادی پسند) تھا، اور اُس کی بیماریوں کے لیے جو دوائیں تجویز ہوئی تھیں ان کے بداثرات سے اس کی آنکھوں کو ایک ڈاکٹر کی مہارت نے بچایا تھا۔''

''یہ عمر دراز لبرٹین کا کیا مطلب ہے؟''

تب میں الفاظ اور متن کی تشریح اور تجزیہ شروع کر دیتا، جس سے بات کا رخ ناول کی طرف سے ہٹ جاتا اور اکثر ہمارے معاشرے، اس کے رسم و رواج، اس کی منافقتوں اور جھوٹ کے تعلق سے سیاسی گفتگو پر ختم ہوتا۔ اور جب میں نے راستیناگ کی ماں اور بہنوں کے مشفقانہ خط جو اس کے نام تھے، سنائے تو میرے سامعین بے یقینی سے ان کا مذاق اڑانے لگے۔

''مغرب کی یا پولیس کی کوئی مہماتی کہانی سناؤ۔ ہمیں سچ مچ کا ایکشن چاہیے۔''

میں نے اپنا ''پڑھنا'' جاری رکھا، گو کہ اس سے چند سامعین بیزار ہو رہے تھے۔ میں ایسا اپنے حافظے کی کسرت کے لیے اور کنفیوژن سے بچنے کے لیے کیا کرتا تھا۔

جب میں حد سے زیادہ تھک جاتا تو بالزاک اور وِکٹر ہیوگو کے صفحات مجھ پر ایک ساتھ حملہ کر دیتے، خلط ملط ہو کر۔ اس سے میرا ذہن منتشر ہو جاتا اور سر میں شدید درد شروع ہو جاتا، جیسے اس امتزاج کے عناصر اس قدر بے میل ہوں کہ میری برداشت سے باہر ہو جائیں۔ میں خود سے کہتا: ''تمھیں پرسکون ہونا ہوگا۔'' پھر خود کو خود ہی سمجھاتا۔ ''تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمھارا حافظہ اچھا ہے—

بلکہ نہایت اچھا ہے۔ پرسکون ہو جاؤ، ہر شے اپنی جگہ درست ہو جائے گی۔“

یہ شاطر حافظہ... یہی تو تھا جو ہمیں اپنے باپ سے ملا تھا۔ اپنے اکثر بہن بھائیوں کی طرح میں بھی اس میدان میں استعداد رکھتا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی، وہ جو امریکہ چلا گیا تھا اور جس نے ایکٹرز اسٹوڈیو میں تعلیم پائی، گل ہائے شعر کی ہر نظم بغیر اٹکے اور بلا غلطی سنا سکتا ہے۔

باطنی قوت کے اس زوال سے کوٹھری میں میری حالت فوری طور پر متاثر ہوئی: میری کوٹھری پھر سے سکڑ گئی۔ دیواریں میرے قریب آ گئیں، چھت نیچی ہو گئی۔ مجھے جلدی سے کچھ کرنا تھا، اور اپنی استعداد کو پھر سے حاصل کرنا تھا تاکہ دور کی تصوراتی دنیاؤں کے رابطے میں رہ سکوں۔

”میں نے اپنی یادوں کو مٹا دیا ہے،“ میں نے خود کو یقین دلایا۔ ”میں نے وہ سب دور پھینک دیا ہے جسے یاد کرنا انتہائی تکلیف دہ ہے۔ میں نے کچھ چیزوں کو جلا ڈالا ہے، پھر بھی شاید سب باتوں سے نجات نہیں پا سکا ہوں، یا شاید کوئی غلطی ہو گئی ہے — میں نے شاید اپنی کم عمری کی تصویروں اور مقامات کے بجائے کچھ کتابوں کو جلا ڈالا ہے۔ خیر، مجھے ہر شے کو پھر سے درست کرنا ہوگا۔ میں شانت ہو رہا ہوں۔ میں پیٹ کی گہرائی سے آہستہ آہستہ گہرا سانس لیتا ہوں، اور دھیرے دھیرے چھوڑتا ہوں۔ میں اپنی داہنی ٹانگ پھیلاتا ہوں، اسے چھوٹے چھوٹے دائروں میں گھماتا ہوں۔ میں اپنی داہنی ٹانگ نیچے لاتا ہوں، پھر یہی عمل بائیں ٹانگ کے ساتھ بھی دہراتا ہوں۔ میں اب اپنے دونوں بازو آگے کی سمت پھیلاتا ہوں، اور دیوار کو چھوتا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے میں ہاتھ اوپر اٹھاتا ہوں۔ چھت سے دو انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ دیواروں کو پیچھے ہٹنا ہوگا۔ میں اپنی ہتھیلیوں سے انھیں دھکیلتا ہوں۔ کھڑا ہو جاتا ہوں، جھکے جھکے چھت کو اوپر دھکیلنے کی کوشش کرتا ہوں، جیسے وہ کوئی ڈھکن ہو۔ میں یہ عمل سارا دن بار بار دہراتا رہوں گا۔ جب میں تھک کر گر پڑوں گا، تب مجھے لگے گا کہ ایک آدھ انچ کھسکانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ یہ تجریدی مسئلہ — حافظے کا — کسی ٹھوس مسئلے پر، اپنے مقامِ حبس پر، حرکت میں رہ کر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں اپنی ذہنی آزادی کو منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو میں محفوظ رہوں گا۔ دیواریں اس کے بعد مجھ پر ظلم نہ کر سکیں گی۔ اگر میں ناول نگاروں کے متخیلہ کرداروں کو اپنے ذہن میں پھر سے ڈھونڈ لاؤں تو پھر مقام کی تنگی کا مسئلہ مجھے نہیں ستائے گا۔“

اسی لمحے مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔

''اگر یادداشت رخصت ہوجائے، تو پھر اپنے کردار خود اختراع کرلو!''

اصل میں حافظہ رخصت نہیں ہوا تھا۔ یہ تھکن تھی، بیزاری تھی جو حاوی ہوگئی تھی۔ بابا گوریو کو اور اس کے بعد لے مِزرابل کو میں نے بار بار اور اتنی مرتبہ پڑھا تھا کہ محفوظ کرنے کا نظام شل ہوگیا تھا۔ نئے صفحوں کی ضرورت تھی، کہانیاں میں نے صرف ایک بار پڑھی تھیں۔ انھیں تلاش کرنے میں کئی دن صرف ہوگئے۔ اپنی لائبریری کو میں نے بتدریج پھر سے ترتیب دیا۔ اس میں بہت ساری کتابیں تو نہیں تھیں لیکن ایک کتاب وہ بھی تھی جو میں نے مراکش کی سول سروس اکیڈمی کے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے وقت پڑھی تھی (اس امتحان میں ایک پوائنٹ سے ناکام ہوگیا تھا): البیر کامیو کی اجنبی — اوہ، میں کس قدر خوش ہوا تھا۔ ان صفحات کی بازیافت کتنی مسرت انگیز ہوتی ہے جن کا ہر لفظ، ہر جملہ بہت احتیاط کے ساتھ ذہن میں لایا جائے! پورے ایک مہینے تک میں اجنبی اپنے ساتھیوں کو سناتا رہا۔ مجھے غریب عبدالقادر یاد آیا جو صرف اس لیے مرگیا تھا کہ اسے کہانیاں سنانے والا کوئی نہ تھا۔ کامیو کے ساتھ میں بڑی سہولت محسوس کررہا تھا اور بعض اقتباسات کو یاد کرکے بہت خوش ہوا تھا۔ اس قرأت نے انھیں ایسی بے پایاں اہمیت عطا کی جو جرم کی اس کہانی سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اگر کوئی ناول کسی کال کوٹھری میں سنایا جائے، موت کی موجودگی میں، تو وہ ان معنوں اور نتائج کا حامل نہیں ہوسکتا جن کا اس وقت ہوگا جب اسے کسی مرغزار میں، چیری کے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پڑھا جائے۔

میری آنکھوں نے متن کے نقوش اجاگر کردیے تھے۔ میں اس کو بے توقف پڑھتا گیا، جیسے وہ میرے سامنے کسی تختۂ سیاہ پر لکھا ہو، یا کسی پروجیکشن اسکرین پر ابھرا ہو۔ بیچ بیچ میں، کوئی نہ کوئی اچانک کہہ اٹھتا، ''اس کو مکرر پڑھو، پلیز اس اقتباس کو پھر سے سناؤ!''

میں آہستہ آہستہ اقتباس دہراتا، سب لفظوں کو الگ الگ کرکے، تاکہ جملوں کے اجزا کو ان کے ذہنوں میں متصور ہونے کا وقت مل جائے۔ ''سورج کی کرنیں ریت پر بالکل سیدھی پڑ رہی تھیں، اور پانی پر ان کی تابش ناقابلِ برداشت تھی۔'' میں نے ''سورج'' اور ''تابش'' پر خصوصی زور دیا۔ میں نے سوچا کہ اس جملے کو دہرا کر میں اس بھٹ کو ناقابلِ برداشت روشنی سے بھر دوں گا۔ میں نے کہنا جاری رکھا، ''دھوپ اب ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ریت اور سمندر پر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گئی۔'' میں نے ''ریت'' اور ''سمندر'' کو خصوصاً زیادہ زور دے کر کہا اور مکرر کہا۔ میں آگے کہتا گیا، ''ایک لمحے کے بعد

میں ساحل پر لوٹا اور ٹہلنے لگا... اب بھی وہی سرخ تابش تھی۔ سمندر اپنی چڑھتی ہوئی موجوں کی تیز تیز، دبی ہوئی سانسوں کے ساتھ ساحل کی ریت پر ہانپ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چٹانوں کی جانب چل رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ جیسے دھوپ سے میرے سر میں ورم ہو گیا ہو۔ 'اب یہاں میں متذبذب ہو گیا۔ یہ ''سر'' تھا یا ''کنپٹیاں''؟ خیر، یہ محض تشریح کا معاملہ ہے۔ ایک جملے میں خرد برد ہو جانے پر میں نے کامیو سے پیشگی معذرت کر لی۔

قرأت پر ہر کوئی اپنی طرح سے ردِعمل ظاہر کرتا تھا۔ خیالی تصویروں کا میرا اپنا ذاتی ذخیرہ تھا۔ جو لبالب بھرا ہوا تھا۔ مجھے اسے تھوڑا سا خالی کرنا ہوگا۔ چند تصویروں کو مجھے زمین پر پھینکنا تھا، اور قبل اس کے کہ وہ مٹ جائیں، مجھے ان کی لمحاتی چمک کو دیکھنا تھا۔ قرأت اپنے ساتھ نئی تصویریں لے کر آئی۔ ان کا انبار لگ گیا، وہ آپس میں مدغم ہونے لگیں، ساتھ ساتھ پگھلنے لگیں اور پھر مٹ گئیں۔ سورج، ساحل، پسینہ، خون، گولیوں سے چھدے ہوئے بدن، دریا، اور میں... ''بدبختی کے در پر'' دستک دیتا ہوا۔

تاریکی سے لڑتا ہوا میں ابلتے ہوئے الفاظ کے کنویں کی مانند تھا۔ میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے پڑھنا، اور بار بار پڑھنا اب کافی نہیں رہ گیا تھا۔ کہانی کی اختراع ضروری تھی، اسے ازسرِنو اس طرح لکھنا تھا کہ وہ ہماری عزلت کے مطابق ڈھل جائے۔ اس قسم کی مشق کے لیے اجنبی آئیڈیل کہانی تھی۔ اپنے وجود کو ضائع ہونے سے بچانے کی فوری ضرورت کا معاملہ اگر نہ ہوتا تو میں اس ناول کو ہاتھ لگانے کی جسارت کبھی نہ کرتا۔ میں نے کامیو کے ساتھ خوب آزادیاں لیں اور مورسول کی کہانی کو پھر سے بنایا۔ میں نے کردار بدل دیے: ریمنڈ، میسن اور مورسول گرمیوں کے کسی اتوار کو سکون سے بانسری بجا رہے ہوں گے، تب بعض عرب، مہاجر عرب، ان پر حملہ کریں گے۔ اس وقت یہی دھوپ ہوگی، یہی روشنی، اور سب سے بڑھ کر یہی پوچ پن۔ جیسا کہ ناول میں ہے، نام صرف فرانسیسیوں کے ہوں گے۔ دوسرے لوگ، سارے عرب، مع اس شخص کے جو مورسول کے جسم میں چار گولیاں اتارے گا، بے نام ہی رہیں گے۔

مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ کامیو کے ناول میں تحریف نہیں کی جا سکتی۔ میں قرأت کے اپنے معمول کی طرف پلٹ آیا، حتیٰ کہ اتنا تھک گیا کہ اپنے سر میں دوڑتے جملوں کو مزید پڑھنے کے قابل نہ

رہا۔ وہ ایک طرح کی دھند میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ فی الوقت قرأت روک رہا ہوں۔ پھر میں نے دور سے آتی ہوئی سرگوشی کی طرح کتاب کا ابتدائی حصہ کسی کو دہراتے ہوئے سنا۔

''ماما آج فوت ہوگئی، یا شاید کل۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مجھے نرسنگ ہوم سے بھیجا ہوا ٹیلی گرام ملا ہے: 'ماں گزر گئی۔ تدفین کل ہے۔ تہہِ دل سے تعزیت۔' معنی واضح نہیں ہیں۔ شاید یہ کل کی بات ہے۔''

پھر میں نے دوسری آواز سنی۔

''میں آج مر جاؤں گا۔ یا شاید کل۔ نہیں جانتا۔ میری ماں کو تازمامرت سے کوئی ٹیلی گرام یا تعزیتی پیغام نہیں ملے گا۔ معنی واضح نہیں ہیں۔ شاید یہ کل کی بات ہے۔''

ایک اور آواز۔

''پھر میں نے ایک بے حرکت بدن میں چار گولیاں اتار دیں، گولیاں کوئی نشان چھوڑے بغیر اس میں غائب ہوگئیں۔ جیسے میں نے بدبختی کے دروازے پر چار بار آہستہ سے دستک دی ہو۔''

22

اشیا کی تعمیرِ نو کرنا، جیسے یہ بھٹ ہماری آخری اقامت گاہ نہ ہو۔ یہی ہماری دفاعی جنگ تھی: مسلسل، صبر و سکون اور حوصلے کے ساتھ، مستحکم، بلاشکست، جلادوں کا یا ان لوگوں کا خیال دل میں لائے بغیر جنھوں نے باریک ترین جزئیات کا یہ منصوبہ تیار کیا تھا کہ موت آہستہ روی سے کس طرح آئے، اتنی آہستگی سے کہ سرِ شک کی مانند بوند بوند کر کے ٹپکتی ہوئی ہماری روحوں کو چیرتی ہوئی اترے، حتیٰ کہ عقوبت ہمارے جسموں پر قابض ہو جائے اور ہمیں پیستے ہوئے بتدریج فنا کر ڈالے۔

ذہن کی مدد سے اشیا کی تعمیرِ نو، یادوں کے جال سے بچتے ہوئے۔ اتنے برس گزر گئے تھے کہ اب مجھے اپنے ماضی بعید سے —— بعید ترین ماضی سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ اب کسی اجنبی کی ملکیت بن چکا تھا۔ جب کبھی یاد آتا تو مجھے یہ خوف کبھی نہ ہوتا کہ نوسٹالجیا کے سبب مر جاؤں گا۔ مجھے اب

اپنے تخیلی پیکروں کو مٹانے یا تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ میں اب زیادہ مضبوط ہو چکا تھا، بجائے اس کے کہ آنسوؤں کی خواہش کروں جو دوسری ہی سرنگ کی جانب لے جاتے ہیں۔ میں اپنی یادوں کو اس طرح دیکھنے لگا تھا جیسے وہ کسی اور کی یادیں ہوں۔ جیسے میں ان کے درمیان کوئی خلل انداز، فضول تاکنے والا شخص ہوں۔ میں اپنی سابق منگیتر کا چہرہ ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ دھوپ میں، الصویرہ کی بندرگاہ میں، وہ ایک جھولنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ انیس سال کا کوئی شخص، جو میں ہی ہوں گا، مسکراتا ہے اور اس کی کرسی کو اپنے پیر سے ٹھوکا دیتا ہے تاکہ وہ جھکولا کھا جائے۔ وہ ہنس پڑتی ہے۔ وہ بھی ہنستا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا بوسہ لیا جائے۔ لوگوں کے بیچ میں، لنگرگاہ کے کیفے کی چھت پر، وہ اسے چومنے کی جسارت نہیں کرتا۔ کوئی گھومتا گھامتا فوٹوگرافر ان کا عکس اتارتا ہے اور کہتا ہے، ''کل، اسی وقت، اسی جگہ۔'' وہ جانے کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ نظروں سے اس کا تعاقب کرتا ہے، اس کے لمبے بالوں میں تابندہ روشنی کو دیکھتا ہے۔ اس خوف سے کہ وہ چلی جائے گی، اور یہ کہ وہ اس سے دور ہو جائے گا، وہ بھاگتا ہے، اور دوڑ کر اس کی کمر پکڑ لیتا ہے، دونوں ریت پر گر پڑتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر بچے ہنسنے لگتے ہیں۔ عاشق و معشوق اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی گھڑی دیکھتی ہے۔ ''مجھے جانا ہوگا۔ میرے ابا جب لوٹ کر آتے ہیں تو میرا گھر میں نہ ہونا برداشت نہیں کر سکتے۔ **کل ملیں گے، اسی وقت، اسی جگہ!**'' اس کا عاشق اداس ہو جاتا ہے۔ وہ ریت پر ٹہلتا رہتا ہے، بالکل تنہا۔ **سورج غروب ہو جاتا ہے۔**

میں نے جب ان تصویروں کو پھر سے دیکھا تو کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ ان سے وقت گزاری تو ہوتی تھی لیکن میں لاتعلق تھا۔ اس کا وہ عاشق — جس کے ساتھ میں خود کو شناخت تک نہیں کر سکتا، اب مجھ سے دور تھا۔ ''چلو اچھا ہی ہوا!'' میں نے اپنے دل میں کہا اور دوسری یادوں کی تصویریں دیکھنے میں منہمک ہو گیا، جہاں میں ایک ایسا اجنبی تھا جو اپنے خیال میں اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعات کو دیکھ کر حیران و مبہوت تھا۔ وقت گزاری! بظاہر یہی ہماری بنیادی مصروفیت تھی۔ وقت، لیکن حرکت نہ کرتا تھا۔ یہ مجھے محظوظ کرتا اور کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ بوریت کی طرح۔ ہم بوریت کی مخلوق بن چکے تھے، بوریت سے بھرے ہوئے بورے۔ بوریت میں ایسے مقبروں کی بو بسی تھی جن کے پتھر سیلن زدہ ہوں۔ یہ ہمارے چاروں طرف ٹکریں مارتی، ہماری پلکوں کو چباتی، ہماری جلد کو کھجلاتی، اور ہمارے شکموں میں

نقب لگاتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ میری بیش بہا یادیں کوچ کر چکی ہیں، رات کے دوسرے کنارے کی جانب؛ وہ شاید منتظر تھیں کہ جب میں اس بھٹ سے نکلوں تو وہ اپنی جگہ لوٹ آئیں۔ فی الحال وہ بہت دور تھیں، ایک طرف رکھی ہوئی، اور انھیں دیکھنا مجھے تکلیف نہ دیتا تھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا، اور میں جس حال میں تھا، اس سے زیادہ کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ تھوڑی سی آزادی لے کر میں ان کے ساتھ کھیلتا تھا، یا یہ اندازے لگاتا تھا کہ حالات نے کس طرح کے موڑ لیے ہوں گے۔ میری منگیتر اب میری منگیتر نہ رہی تھی۔ مجھے یہ حق نہ تھا کہ اسے گھر میں بند کر دوں۔ میں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ اسے یہ سب کیسے پتا چلا ہوگا؟ میں نے جلد ہی خود کو قائل کر لیا کہ ہمارے عزیز و اقارب نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہوگا۔ صرف میری ماں ہوگی جو مجھے ایک بار اور دیکھنے کی امید باندھے ہوگی۔ اپنے بچے کی موت اور زندگی کے بارے میں ماں کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اجنبی لوگ اس کے دروازے پر آ کر دستک دیتے اور دکھ کے ساتھ ان سے سرگوشیوں میں کہتے تھے، ''تمھارا بیٹا مر چکا ہے۔ دو مہینے قبل اسے موت کی سزا دے دی گئی؛ درخت سے باندھ کر، آنکھوں پر پٹی کس کر فائرنگ اسکواڈ نے گولی مار دی۔ آپ جانتی ہیں، میڈم، ہمیں یہ بات آپ کو بتانے کی اجازت نہیں، لیکن ہم سب مسلمان ہیں، اور ہمیں رحم دلی دکھانی چاہیے۔ ہم اللہ کی امانت ہیں اور ہمیں اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے!''

پھر وہ چلے جاتے، اپنے اونی جلابوں میں لپٹے ہوئے، ان کو سوال پوچھنے کا کوئی موقع دیے بغیر۔

بعض دوسرے لوگ آتے؛ جو اس کے برعکس دعوے کرتے، مسکرا کر اور اعتماد کے ساتھ:

''آپ کا بیٹا زندہ ہے۔ وہ خیریت سے ہے۔ دوسرے افسروں کے ساتھ ایک پہاڑ کی تعمیر کر رہا ہے۔ یہ بڑے راز کی بات ہے۔ اس بارے میں زبان نہ کھولنا...''

خوش قسمتی سے میری ماں صرف اپنی ہی بینش پر اعتماد کرتی تھی۔

میں اس کے پیغام وصول کرتا۔ پیش بینیاں۔ میں جانتا تھا کہ اسے معلوم ہے۔ میری منگیتر مجھے اتنا نہیں جانتی تھی کہ وہ خیالوں کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کرتی۔ قنیطرہ کی جیل کے صدمے کے بعد، جہاں وہ دو بار مجھ سے ملنے آئی تھی، وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ مستقبل میں اس کی زندگی میرے ساتھ نہیں۔ وہ

روئی تھی۔ الوداعی آنسو۔ اور پھر وہ آخری نظر، ایسی نظر جو آپ بسترِ مرگ پر پڑے کسی آدمی پر ڈالتے ہیں۔ اس نے میری جانب دیکھا، رخساروں پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ، پھر وہ پلٹی اور سرعت اور ثابت قدمی سے چلتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے خود کو پابند کر لیا کہ کوئی دکھ محسوس نہیں کروں گا، نہ پچھتاوا۔ دس جولائی 1971 سے پہلے میں جو کچھ جانتا تھا، جو کچھ گزرا تھا، میرے لیے اب کوئی شمار نہ رکھتا تھا، مجھے اذیت نہ دیتا تھا، میری کوٹھری میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں پرسکون ہوتا گیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تمام چیزوں پر دروازے بند کرتا گیا جو ماضی کی ہوا کو اندر آنے دیتی تھیں۔ میں گیم کھیلنے اور خود کو تسلی دینے کے بھی قابل ہو گیا تھا۔ کئی دن میں نے اپنی منگیتر کے لیے شوہر تلاش کرنے میں صرف کیے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ طول قامت ہو، کم از کم اتنا لمبا ضرور ہو جتنا میں اپنی قید کے شروعاتی دنوں میں تھا۔ میں نے تصور کیا کہ وہ گورا ہو، مجھ سے مختلف، یوروپین بھی ہو سکتا ہے، تعلیم یافتہ ہو، ادب کا پروفیسر یا کوئی آرٹسٹ۔ میں نے سوچا کہ اس کے لیے ایک شاندار زندگی اختراع کروں۔ وہ کوئی ایسا شخص ہو گا جو اسے وہ سب دے سکے جو مجھے دینے کا وقت نہ ملا تھا۔ وہ اسے یونان، اٹلی، اندلس لے جائے، میڈرڈ میں پرادو میوزیم دکھائے گا، پیرس کا لوور میوزیم بھی۔ وہ اس کے لیے کتابیں خریدے گا جنھیں وہ اپنے بستر میں ساتھ ساتھ پڑھیں گے۔ وہ تھیٹر سے لے کر کلاسیکی موسیقی تک، سب سے اس کا تعارف کرائے گا۔ وہ اسے ایک ایسی مراکشی عورت میں ڈھال دے گا جو دوسروں سے مختلف ہو گی۔ وہ اسے خواب دیکھنا سکھائے گا، وہ اسے وہ وقت بھولنے میں مدد کرے گا جب ہم ساتھ ساتھ تھے۔

اور مجھے بھی اپنی زندگی کے اس دور کو بھولنا ہو گا۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ اس کے لیے شوہر کا انتخاب کروں؟ شاید وہ اب تک خود تلاش کر چکی ہو گی اور مراکش یا کاسابلانکا میں وہ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہوں گے۔ شاید وہ جھگڑتے ہوں اور اپنی ناخوشی کے لمحوں میں وہ میرے بارے میں سوچتی ہو، ہمارے بارے میں؟ میں نے خواہش کی کہ وہ میرے بارے میں نہ سوچا کرے۔ کبھی نہ سوچے۔ اور مجھے بھی اب کسی شے یا انسان کے لرزیدہ حسن کے متعلق نہیں سوچنا ہے، گرمیوں کی راتوں کی نرمی کو یاد نہیں کرنا ہے، یا کسی بچے کی نیم خوابیدہ آنکھوں کو سہلانے کے شفاف خواب کے متعلق کچھ نہیں سوچنا ہے۔

میں نے اس سے آگے نہیں سوچا۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایسی کتاب میں تبدیل ہو چکا ہوں جسے کوئی بھی، کبھی نہیں کھولے گا۔

23

سیبان کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ پتا نہ چل سکا جو 1980 کی دہائی کے اوائل میں ہمارے ساتھ شامل ہوا تھا۔ محافظ اسے دوپہر کے کھانے کے وقفے میں لے کر آئے تھے۔ وہ طویل قامت تھا، خاصا لمبا، لحیم شحیم، میلے رنگ کا۔ اس کی چکنی چندیا پر ایک بھی بال نہیں تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا، نہ ہماری پکار کے جواب میں، نہ کسی سوال کے جواب میں۔ دوسرے دن مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی کہ اسے ہمارے روزمرہ کے معمولات اور ان اصولوں سے آگاہ کروں جو ہم نے اپنے لیے وضع کر رکھے تھے۔ میں نے اس کا نام کئی بار پوچھا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا، ''سیبان۔ مجھے سیبان کہو۔''

''تم کہاں کے ہو؟''

خاموشی۔

''یہاں کس وجہ سے آئے؟''

خاموشی۔

''سنو، سیبان۔ ہم یہاں کچھ ضابطوں کے مطابق رہتے ہیں۔ کبھی قرآن سیکھتے ہیں، کبھی کہانیاں سنتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار عمر ہمیں پیرس کے بارے میں بتاتا ہے۔ جب وہ بیس برس کا تھا اس نے ایک مہینہ وہاں گزارا تھا۔ سہ پہر کا وقت گروپ ڈسکشن کے لیے مخصوص ہے۔ آج کل ہم کوئی ایک مہینے سے نوآبادیات پر بحث کر رہے ہیں۔ تم ان سرگرمیوں میں شریک ہونے کے لیے آزاد ہو۔ رات کی خاموشی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ عشائیے کے بعد سب کے لیے خاموشی ضروری ہے کیونکہ ہمیں آرام کرنا ہوتا ہے۔ ہاں، یہاں بھی ہمیں آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوٹھریوں کی درمیانی دیواریں پتلی ہیں۔ ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں، آہ و زاری بھی اور خراٹے بھی۔ اگر تمھیں یہ نظام الاوقات تسلیم ہے تو بتاؤ، اور اگر بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تو اپنی کوٹھری کے دروازے پر دو بار دستک دو۔''

جب میں نے دوبار دستک کی آواز سن لی تو مطمئن ہو گیا۔ اپنی راتیں وہ جمناسٹک کرتے ہوئے گزارتا تھا، اور جب وہ ڈنڈ لگاتا تھا تو اس کے بھاری سانسوں کی آواز سب سن سکتے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ سو جاتا تھا۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ دو مہینے بعد، قدرے دقت ہی سے سہی، میں نے سیبان سے ملنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ایک محافظ کو میں نے مسئلہ سمجھایا جو خود بھی اس آدمی کا بھید جاننے کی جستجو میں تھا۔ اس نے مجھے اتنا ہی بتایا، ''مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ شاہی محافظوں میں تھا۔ اس نے ضرور کوئی ایسا خوفناک کام کیا ہوگا کہ یہاں بھیج دیا گیا۔ شاید کسی شہزادی کی شان میں گستاخی کی ہو... کون جانے!''

اس سے بات کرنے کے لیے میرے پاس صبح کا سارا وقت پڑا تھا۔ جب گارڈ نے اس کا دروازہ کھولا اور ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی تو میں نے فوراً دیکھ لیا کہ وہ بخار میں تپ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، اور پسینے کی بوندیں اس کی پیشانی پر چو رہی تھیں۔ میں نے اس سے وہ سوالات پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا جن کی کوشش ہم اس کی آمد پر کر چکے تھے۔ چند الفاظ ہکلاہٹ کے ساتھ کہنے سے پہلے اس نے محافظ کے جانے کا انتظار کیا۔ اپنا دایاں ہاتھ اپنی پشت پر رکھے رکھے اس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں مجھ سے کہا، ''مجھے اسپورٹ پسند ہے۔ یہاں سارا وقت اسپورٹ ہی میں گزارتا ہوں۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ تم رایل گارڈ میں تھے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''تم اپنی پیٹھ پر کیا چھپا رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔ ولو (کچھ نہیں)...''

''تم نے اپنا بازو پشت پر کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''کیونکہ۔ کچھ نہیں ہے...''

''خیر، مجھے دکھاؤ۔ دیکھوں؟''

چند ثانیوں کے بعد وہ گھوم گیا اور بولا، ''لو دیکھ لو۔''

''آئی ایم سوری، یہاں روشنی کبھی نہیں ہوتی۔ ہم فلیش لائٹ کے ساتھ گارڈ کی واپسی کا انتظار

کریں گے۔ اس بیچ میں لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ہوا تھا۔''

''اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ حد سے زیادہ تکلیف۔''

''کب سے؟''

''اوہ، جب میں آیا تھا، اس کے دو ہفتے بعد سے۔''

جب محافظ مجھے لینے آیا تو اس نے اپنی فلیش لائٹ سیبان کی پشت پر ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا بازو ٹوٹا ہوا ہے اور کہنی کی ہڈیاں گینگرین میں مبتلا گوشت میں سے ابھر آئی ہیں۔ سیبان دوبارہ گھوم گیا اور اپنا رخ دروازے کی سمت کرلیا۔

''تمھارے خیال میں اس کے پاس کتنا وقت ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ اس کے سارے بدن میں گینگرین پھیلنے سے پہلے شاید کاکروچ ہی اسے کھا جائیں گے۔''

اور یہی ہوا۔ ہزاروں کاکروچوں اور دوسرے حشرات نے جو ہماری کوٹھریوں سے نکل کر اس کی کوٹھری میں پہنچ گئے تھے، اسے زندہ کھالیا۔ محافظ اس کا دروازہ کھولنے سے خوف کھا رہے تھے۔ وہ یہ جاننے آئے تھے کہ وہ اب بھی زندہ ہے یا نہیں، اور پھر ہم نے اس کے دروازے پر ایک دو ٹھوکریں مارنے کی آواز سنی۔ دن نکلتے تک موت کی بساند کوٹھریوں کے سارے بلاک میں پھیل گئی۔ رات میں چیخنے والے الو نے ماتم کناں آواز میں چیخنا شروع کردیا، جو اس کی علامت تھا کہ خاتمہ نزدیک ہے۔ شروع میں ہم اس پر کچھ دھیان نہ دیتے تھے، لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ہم یہ جان چکے تھے کہ اس کے ماتمی گیت کے بعد قریب المرگ شخص ایک دو ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ کریم نے اس جانب سب سے پہلے توجہ دی تھی۔

میں نے سیبان کو کئی بار آوازیں دیں۔

''اگر تم مجھے سن رہے ہو تو کچھ جواب دو۔ یا پھر دروازے پر دستک ہی دو۔''

ایک گھنٹے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مرچکا ہے۔ دوسرے دن محافظوں نے کوٹھری کھولی اور اندر روشنی ڈالی، پھر دروازے کو دھڑاک سے بند کردیا اور گالیاں دیتے ہوئے بھاگ گئے۔

پھر وہ سہ پہر میں لوٹے۔ وہ حفاظتی دستانے اور چہروں پر ماسک پہنے ہوئے تھے۔ وہ اسے

چھونے سے خوفزدہ تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ان کی مدد کروں تو وہ مجھے باہر نکلنے دیں گے۔
گینگرین بہت تیزی سے پھیلا تھا۔ میں نے اس کے پیروں کے تلووں میں سے کاکروچ نکلتے دیکھے۔ کاکروچ اتنے زیادہ تھے کہ انھیں چھُنا اور جسد کو پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ نہایت ضروری تھا کہ پہلے ان ہزارہا حشرات کو مارا جائے۔ ایک محافظ زہر لے کر آ گیا جو فوج میں تل چٹوں کو مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سفوف مہلک تھا اور مجھے بھی دستانے اور ماسک پہننے پڑے۔ چند ہی منٹوں میں سارے کاکروچ دیواروں اور چھت پر سے گر کر فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ محافظ ایک پھاوڑا اور ریڑھی انھیں اٹھانے کے لیے لے آئے۔

سیبان کی موت نے ہمیں کاکروچوں سے نجات دلا دی۔ میں نے تھوڑا سا سفوف بچا لیا تھا جو میں نے تمام کوٹھریوں کی دہلیزوں کے کنارے کنارے چھڑک دیا۔ محافظوں نے مجھ سے کہا کہ تم قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔

''اگر ہم نے انھیں نہیں مارا تو یہ ہم سب کو چند دنوں میں ہی کھا جائیں گے۔ بہر حال، یہاں منشا یہ ہے کہ موت دیر سے آئے۔ ہو سکتا ہے میرا اقدام اصول کے خلاف لگے لیکن یہ اصول کے عین مطابق ہے۔ موت، برحق — لیکن رینگ رینگ کر آئے!''

''تم تو کمانڈنٹ جیسی باتیں کر رہے ہو!''

ہاں، میں نے اس کا جذبہ اور تکنیک اپنے اندر جذب کر لیے تھے۔ پہلی بار، محافظوں نے مجھے سلامی دی۔

24

ہر گروپ میں کوئی نہ کوئی حرام زادہ ہوتا ہے۔ ملٹری اکیڈمی میں تین لوگ ایسے ہی تھے — ان میں ایک مخبر تھا، ایک بزدل اور ایک وبالِ جان۔ یہ فطری تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی اس بھٹ میں ہمارے ساتھ اپنے انجام پذیر ہوتا۔
ہر شخص میں کچھ نہ کچھ بیہودگی چھپی ہوتی ہے۔ وہ شخص جس نے اپنے حصے سے زیادہ بیہودگی پائی

تھی اس غار کا سب سے ناقابلِ برداشت قیدی اشعر تھا۔ ایسا شخص جو انسانیت کے حدود سے پرے تھا۔ انسان کے بھیس میں وحشی۔ اشعر نہ صرف بدتہذیب بلکہ بدطینت بھی تھا۔ شروع میں وہ مجھ سے نفرت آمیز سلوک کرتا تھا لیکن میں نے اس کے تئیں اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ میری نظر میں اشعر لاتعلقی کے سوا کسی اور طرح کے جذبے کا مستحق نہیں تھا۔ میں اس کی موجودگی کو انتہائی مجبوری کے سوا کسی حال میں کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ میرے نزدیک لاتعلقی کا مطلب احساسات سے یکسر عاری ہونا نہیں تھا بلکہ ان کا منکر ہونا تھا۔

اشعر ہمارے لیے ایک اصلاح ناپذیر وبال تھا۔ وہ کوارٹر ماسٹر سارجنٹ تھا اور ہم میں سب سے زیادہ عمر دراز تھا۔ وہ ناخواندہ تھا، بدتہذیب، درشت، وحشی اور اپنی سنگدلی پر نازاں۔ وہ انڈوچائنا کے محاذ پر جا چکا تھا اور جنگ کے تعلق سے اپنے تجربات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا یا جھوٹے واقعات گھڑتا تھا۔ اس کے نزدیک ویتنامی ''چینی'' تھے جن کے لیے وہ نسلی تعصب سے معمور توہین آمیز الفاظ استعمال کرتا تھا۔

وہ محض اتفاق سے حکومت کا تختہ پلٹنے کی مہم کا حصہ اس طرح بنا تھا کہ اہرمیمو سے رخصت ہونے والے ٹرکوں میں سے ایک ٹرک پر چھپ کر سوار ہو گیا تھا۔ مفت کی سواری کا فائدہ اٹھا کر وہ رباط پہنچنا چاہتا تھا جہاں وہ اپنے کسی عم زاد سے، جو وہاں بساطی تھا، اپنا کوئی جھگڑا طے کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب ہمیں جلد ہی پتا چل گیا کیونکہ اپنی قید کے ابتدائی چند برسوں میں ہر روز جب صبح کو اٹھتا تب بھی، اور جب رات میں سونے جاتا تب بھی، وہ اپنے اس عم زاد کو کوستا رہتا تھا اور دعائیں مانگتا تھا کہ اسے خوفناک موت نصیب ہو۔

''خدا تجھے کسی ٹینک کے نیچے کچلے اور تو اپنی انتڑیاں اپنے ہاتھوں سے سمیٹے۔ تجھے سسک سسک کر موت آئے۔''

یا پھر کہتا، ''خدا تجھے انڈوچائنا کا ہڈی توڑ بخار چڑھا دے۔ تو مخبوط الحواس ہو جائے۔ تو اپنے ہاتھوں کی انگلیاں خود ہی چبا ڈالے، ایک ایک کر کے۔''

اشعر ایک برا انسان تھا۔ اس کے وسیلے سے میں نے بغض اور حسد کو پہچانا۔ دو ایسی بیماریاں جو

روزمرہ کی زندگی میں عام ہیں لیکن جن کے لیے ہمارے غار میں کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اشعر انھیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، اس نے ان بیماریوں کو بڑھنے دیا اور ہمارے حقیر وجود کو مسموم کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کی کوٹھری میری کوٹھری کے سامنے تھی۔ اس کا پسندیدہ مشغلہ ہماری بحثوں میں خلل ڈالنا اور رات کے وقت گنگناتے رہنا تھا، محض اس لیے کہ اس سے ہم پر جنون طاری ہونے لگے۔ اسے کسی ضابطے میں رکھنے کا ہمارے پاس کوئی طریقہ نہ تھا۔ مجھے لگا کہ جب ہم کچھ کرتے ہیں تو تعلیم کے فقدان کے باوجود اسے شامل کرنا ضروری ہے۔ اسٹڈی گروپ کو چھوڑ کر، جو قرآن سیکھنے کا کام کافی اچھی طرح کر رہا تھا، میں نے طے کیا کہ کتابِ مقدس میں خود ہی اسے پڑھایا کروں گا۔

''گروپ میں تم ہی کیوں ہو، میں کیوں نہیں ہوں؟'' اس نے شکایت کی۔ ''میں بھی آدمی ہوں، اچھا مسلمان ہوں۔ مجھے بھی تجربہ رہا ہے — چینی مجھے یاد کرتے ہیں!''

اسے اپنے ذہن کو مرتکز رکھنے میں پریشانی ہوتی تھی اور صحیح تلفظ میں بھی مشکل پیش آتی تھی۔ میں لفظ کے ہر جز کو بہت واضح کر کے سناتا، وہ اسے دہراتا، اور پھر اسلام اور قرآن کے لیے اپنی نفرت چیخ چیخ کر ظاہر کرنے لگتا۔ جب وہ ایسا کرتا تو سزا کے طور پر میں اس سے بات چیت بند کر دیتا تھا، حتیٰ کہ اسے اپنے رویے کی معافی مانگنی پڑتی تھی۔ میں اسے نماز پڑھواتا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی جہالت پر اس کا غصہ بڑھتا تھا۔ ایک مہینے کی مشق کے بعد وہ سورۂ فاتحہ بلا غلطی پڑھنے لگا۔ وہ واقعی ہمارے گروپ میں شامل ہونا اور خود کو ہمارے ساتھ شمار کرانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے حسد پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔

جس دن محافظ نے مجھے سیان سے ملنے جانے کی اجازت دی اسے شدید غصہ آیا۔

''یہ محافظ تم سے ہی بات کیوں کرتا ہے؟ اس نے تمھیں کیوں چنا، مجھے کیوں نہیں؟ میں تم سے بڑا ہوں، بزرگ ہوں۔ تمھارے ساتھ خصوصی برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے؟ اوئے، تم اس کو کچھ دیتے ہو کیا؟ تم ہی کیوں، میں کیوں نہیں؟ ہوں؟ اوئے، جواب دو۔ میں انڈو چائنا کی جنگ کا غازی ہوں۔ میں انھیں جانتا ہوں، ان چینیوں کو۔ تم، تم بھی انھی کی طرح ہو۔ تم مجھ سے بات نہیں کرتے۔ تم پھسلاؤ کہیں کے! یہ چپکے چپکے کیا ہیرا پھیری کرتے رہتے ہو؟''

میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ جلتا بھنتا رہا۔ جب دن تمام ہوا تو اس نے مجھ سے کہا، ''سورۂ بقر پڑھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آج نہیں، کل۔ یہ وقت خاموشی کا ہے۔ بولنا بند کرو اور اپنے سانس کے آہنگ کے ساتھ ساتھ سوچنے کی کوشش کرو۔ خاموشی کا احترام کرنا سیکھو۔ خود کو یہ سمجھاؤ کہ خاموش رہنے میں راحت ہے، تمھارے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، خصوصاً دوسروں کے لیے۔ ہمیں واقعی خاموشی کی ضرورت ہے۔ یہ روشنی کی قائم مقام ہو سکتی ہے جس کی یاد ہمیں اس قدر ستاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہونا؟ تم مجھے بتاؤ گے کہ سیبان نے تم سے کیا کہا۔ وہ مر چکا ہے اس لیے اب بتا سکتے ہو۔ پہلے وعدہ کرو، سن رہے ہو موسیو ہیرا پھیری؟''

''اشعر، اپنا منھ بند رکھو۔ ورنہ کل قرآن کی تعلیم کی چھٹی۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن میں نیند سے پہلے تک میں اس کی بڑبڑ سنتا رہا۔ بعض دفعہ وہ نیند میں زور زور سے بولنے لگتا تھا۔ اس کے چیخنے چلانے اور بڑبڑاہٹ سے میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ اگلی صبح کو جب میں اس کے بارے میں بتاتا تو وہ اپنی ماں کے سر کی قسم کھا کر کہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔

ایک دن محافظ نے اس کا کھانا روک دیا۔ اشعر کو غصہ آ گیا اور اس نے الزام لگایا کہ اس سزا کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ میرا اس سے کچھ لینا دینا نہیں لیکن وہ چیختا رہا اور سب کی توہین کرتا رہا اور آخر میں بددعائیں دینے لگا کہ مجھے بری نظر لگ جائے۔ لیکن ہم جہاں تھے وہاں بری نظر ہو کہ نابکار سحر، کالا جادو ہو کہ طلسم، یا کوئی اور افسوں — یہ سب ہمیں نہیں چھو سکتے تھے۔ ان معنوں میں ہم ان کی رسائی سے دور تھے۔ اس لیے میں ہنسنے لگا۔ اس سے اس کا پارہ اور چڑھ گیا۔ دوسرے دن جب محافظ اس کے حصے کا مانڈ لے کر آیا تو اشعر نے پوچھا کہ کیا اسے تھوڑا زیادہ ملے گا۔

''تم پہلے ہی خاصے موٹے تازے ہو،'' محافظ نے جواب دیا۔

اگر ضدی سبھاؤ اور بدمزاجیاں نہ ہوتیں تو اشعر عام قیدیوں جیسا ہی تھا۔ بقیہ لوگ جس طرح مل کر رہتے تھے اس سے میں نے یہ سیکھا کہ اس بھٹ میں، جہاں ہمیں سڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، ہم لوگوں کی کمینگیاں اور فاسد خیالات بھی برداشت کر سکتے ہیں۔

25

ایک شام کو جب میں نماز سے فارغ ہونے والا تھا (روز کی پنج وقتہ نماز نہیں، بلکہ آزادی کے دنوں کی قضا نمازیں) تو مراکش کا ننھا پرندہ مجھ سے ملنے چلا آیا۔ میرے بچپن کا پرندہ، وہ مقدس پرندہ جسے طبیبت یا الفقیرہ کہتے ہیں۔ اس کا پتا مجھے بعد میں چلا کہ گانے والا یہ پرندہ اسٹرایولاٹا بنٹنگ فیملی سے ہے۔ اس کے سر، گردن اور سینے کے حصے سرمئی رنگ کے ہوتے ہیں اور بقیہ پروں والا حصہ کتھئی یا سرخی مائل بھورا۔ کچھ عرصے تک مجھے اس پر شانچ کا گمان تھا کیونکہ یہ دونوں ایک ہی طرح گاتے ہیں۔ البتہ اُس وقت میں اس کے فرانسیسی نام اور پروں کے رنگ کا اندازہ لگانے کی اپنی کوششوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ پرندہ ہمارے اس سوراخ سے اتر کر آیا تھا جو جیل کے ہوادان کا کام دیتا تھا۔ وہ کوئی پندرہ منٹ تک گاتا رہا۔ ظاہر ہے میں نے اسے پانی میں بھگو کر روٹی کے ٹکڑے کھلائے۔ کھانے کے بعد وہ پھر گانے لگا اور اس کے بعد اُڑ گیا۔ اس کا آشیانہ ضرور کسی نزدیکی درخت پر رہا ہوگا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو اس بار مرکزی مدخل پر آ بیٹھا اور گاتا رہا۔ جب بھی وہ جیل کے باہر کسی حرکت کو محسوس کرتا، اپنا لحن بدل دیتا تھا، جیسے نگہبانی کر رہا تھا۔ محافظوں کی آمد کا اعلان بھی ہمیشہ طبیبت ہی کرنے لگا۔

مجھے اب بھی اس کے مختلف لحن یاد ہیں جنھیں میں نے جلد ہی الگ الگ پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن جب وہ تیز آواز کے ساتھ اسٹاکیٹو انداز میں چہکا تو میں اندازہ نہ لگا سکا کہ اس نغمے کا کیا مطلب ہے... لیکن طبیبت بارش کا استقبال کر رہا تھی! ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی وسیلہ نہ تھا کہ آسمان کا رنگ کب کیسا ہے، لیکن اس خوش الحان پرندے کی مہربانی سے ہمیں موسم کا احوال معلوم رہنے لگا۔ یہی پرندہ تھا جو ہمیں ریت کے طوفان کی آمد پر آگاہ کرتا تھا، گانے کے ایک مخصوص انداز میں وہ ہمیں وارننگ دے دیتا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وقت گزرنے اور تجربے کے بڑھنے کے ساتھ میں اس کے مختلف نغموں کا مطلب سمجھ لینے پر قادر ہوتا گیا۔ محافظ دنگ رہ جاتے جب ہم ان سے پوچھتے، ''باہر موسلا دھار ہوئی تھی!'' یا ''طوفان کیسا تھا؟''

اس کے گیتوں کے مہین فرق کو میرے ذہن پر نقش ہونے میں کئی مہینے لگے۔ مثلاً میں نے یہ سمجھ لیا کہ جب وہ صبح کا گیت بدلتا تھا تو ہمیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایک محافظ چھٹی پر چلا گیا ہے۔

ایک دن میں نے ڈیوٹی پر موجود دونوں محافظوں سے کہا، ''یہ کیونکر ہوا کہ وہ آدمی چھٹی پر چلا گیا

اور تم دونوں نہیں گئے؟''

''یہ تم کو کیسے پتا چلا؟''

''بس یوں ہی جانتا ہوں۔''

وہ بولے کہ تم لوگ جن ہو، ناپاک لوگ جنھوں نے ضرور شیطان کے ساتھ سازش کر رکھی ہے۔

طبیت میرا ساتھی بن گیا تھا، میرا دوست۔ جب وہ میرے ہوادان پر آ کر بیٹھ جاتا تو میں تصور کرتا کہ تاریکی کے باوجود میں نے اس کی آنکھوں کی چمک دیکھی ہے۔ میں اس سے نیچی آواز میں باتیں کیا کرتا تھا تا کہ اشعر حسد محسوس نہ کرے۔ میں پرندے کو اپنے دن کا احوال سناتا اور اس سے کہتا کہ وہ نماز کے وقت نہ آیا کرے۔ حیرت کی بات تھی کہ جب وہ اندر چلا آتا تو بڑے صبر کے ساتھ نماز کے ختم ہونے کا انتظار کیا کرتا۔ السلام علیکم کے الفاظ پر وہ جان لیتا تھا کہ نماز ختم ہو چکی اور اب میں اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا۔

حاسد اشعر ایک دن مجھ سے کہنے لگا، ''یہ پرندے کے ساتھ تمھارا کیا معاملہ چل رہا ہے؟ وہ تمھاری کوٹھری میں ہی کیوں آتا ہے، میری طرف کیوں نہیں آتا؟ تم نے اسے سکھا دیا ہے اسی لیے وہ میرے لیے نہیں گاتا۔ اس قدر بغض کیوں رکھتے ہو؟ یہ بے رحمی کیوں؟ مجھے بھی حق پہنچتا ہے کہ کوئی چڑیا میرے گندے دنوں کو روشن کردے۔ مجھے بھی ایک لعنتی پرندے کی ضرورت ہے جو میری تنہائی پر، میری بدحالی پر دھیان دے۔ تم اسے کیا دیتے ہو جس سے وہ تمھیں پیار کرنے لگا ہے؟ بولو، مجھے بتاؤ کہ تمھاری چال کیا ہے؟''

''پرسکون ہو جاؤ اشعر،'' میں نے اس سے کہا۔ ''یہ پرندہ خدا کے رحم و کرم کی علامت ہے۔ میرے لیے امید کا پیغامبر ہے — میں کہ جو امید پر بھروسا کرنا چھوڑ چکا تھا! وہ میرے پاس اتفاق سے چلا آیا ہے۔ شاید کسی دن تمھارے پاس بھی آئے۔ ایک ننھی منی چڑیا سے حسد مت کرو! یہ مضحکہ خیز بات ہے۔ نماز کی طرف دھیان دو۔ میں نے تب سے اپنے دنوں کا شمار کیا ہے جب مجھے پنج وقتہ نماز شروع کرنی چاہیے تھی، اور ایسے دنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جب میں پندرہ سال کا تھا تب سے بائیس برس کی عمر تک میں نے ایمان اور عبادت کو چھوڑے رکھا تھا۔ اب میں پرانے دنوں کی نمازیں

میں سے چھ دن کی قضا نمازیں ہر روز پڑھتا ہوں۔ ساتھ ہی روزانہ کی نماز بھی۔ یہ میرے لیے سود کی مانند ہیں جو میں اپنی تاخیر کے لیے ادا کر رہا ہوں، اپنی بھول کے لیے، راہ سے بھٹک جانے کے باعث پڑھ رہا ہوں۔ آج میں حساب لگا رہا ہوں کہ طویل عرصہ پہلے میں کیسا تھا۔ جیسا میں بیس برس کی عمر میں تھا اس پر میں اب قطعی نازاں نہیں ہوں۔ چنانچہ آج میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں، محمد پر ایمان رکھتا ہوں، عیسیٰ اور موسیٰ کو مانتا ہوں۔ میں عقیدے کی افضلیت پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں حال پر یقین رکھتا ہوں لیکن میرا کوئی ماضی نہیں بچا۔ ہر ایک دن جو گزرتا ہے وہ اپنا نشان چھوڑے بغیر، بے صدا، بے رنگ مر جاتا ہے۔ ہر صبح میں ایک نوزائیدہ بچہ ہوتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں خود کو طبیبت کی طرح مانتا ہوں جو ایک حساس پرندہ ہے، خاصا دانا اور شک وشبہ سے بالاتر۔ میں چڑیوں کی زبان کو انسانوں کی زبان کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سمجھتا ہوں۔ طبیبت مجھے سفر پر لے جاتا ہے، اور روحانیت کی جانب سفر پر وہ میرا ساتھی ہوتا ہے۔ اس کی سبکساری، اس کی نزاکت، اس کے نغموں کی مٹھاس، اس کے پیغاموں کی لطافت میرا بہت بڑا سہارا ہیں۔ عشا کی نماز کے بعد جب سردی میری ہڈیوں کو بھنبھوڑتی ہے، جب درد میرے میرے ہاتھوں اور بازوؤں کو شدت سے کاٹتا ہے، جب مدد کے لیے پکارنا یا یا چیخنا بے سود ہوتا ہے تو میں طبیبت کے نغمے کو یاد کرتا ہوں۔ میں اپنے حافظے کی مدد سے اس کی تخلیق نو کرتا ہوں اور اپنے ذہن میں اسے بار بار سنتا ہوں، یہاں تک کہ میری تکلیفیں اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتی ہیں۔ اشعر، یہی وجہ ہے کہ یہ پرندہ مجھ سے ملنے آتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ یہ بندھن ریشم کے دھاگے کی مانند بہت لطیف ہے، بال کی طرح۔ یہ واحد بندھن ہے جسے میں نے باہر کی دنیا سے قبول کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ پرندہ میرے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ ایک ماں کے درد نے اسے بھیجا ہے، یا پھر یہی مشیت ایزدی ہے   شب بخیر، اشعر!"

اس کے بعد اشعر نے دھیان دینا شروع کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے پانچوں وقت کی نماز سکھاؤں اور اس نے شرمندگی کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ فوج ہی اس کا واحد خاندان تھی، اور یہ کہ بیرکوں میں مذہب کا ذکر کبھی نہیں کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ انڈو چائنا کی جنگ کے دوران اس نے اللہ کو صرف اس وقت یاد کیا تھا جب وہ محاذ پر گیا تھا۔

لیکن اشعر اپنی رعونت سے، اور اپنی ترش روئی سے کبھی نجات نہ پا سکا۔

26

میں اپنی پرانی زندگی میں نہ صرف یہ کہ بری نیند سوتا تھا بلکہ خواب بھی بہت کم دیکھتا تھا۔ جیل کے ابتدائی برسوں میں میری نیندیں بھی اڑ گئیں اور خواب بھی۔ لیکن جب میں نے ماضی اور امید کے ساتھ رشتے منقطع کر لیے تو میری نیند معمول پر لوٹ آئی، سوائے شدید سردی میں ہڈیوں میں سوراخ کر دینے والی ان راتوں کے جب اکڑ کر مرنے سے بچنے کے لیے ہمارا جاگتے رہنا ضروری تھا۔ میں خواب بھی دیکھنے لگا تھا۔ میری تمام راتیں خوابوں سے معمور ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض اپنے نشان چھوڑ جاتے تھے اور مجھے یاد رہ جاتے تھے۔ بعض ایک دھندلا سا تاثر چھوڑ جاتے، جو ناگوار نہیں ہوتا تھا۔

اپنی نیند کو خوابوں سے سجانے والا میں تنہا شخص نہیں تھا لیکن ایسا واحد شخص ضرور رہا ہوں گا جس نے تین پیغمبروں کو اپنے خواب میں دیکھا۔

موسیٰ کے ساتھ میں نے ایک طویل سیاسی گفتگو کی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھے تھے اور میں زمین پر۔ میں نے ان سے کہا کہ انسانوں کی عدم مساوات ہی ناانصافی کا سرچشمہ ہے۔ وہ سنتے رہے لیکن کچھ بولے نہیں۔

عیسیٰ نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ کبھی کبھی آتے رہتے تھے، اپنی آنکھوں میں اداسی لیے اور بانہیں پھیلائے ہوئے۔

محمد کا جہاں تک تعلق ہے، میں نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا لیکن ان کی موجودگی محسوس کرتا رہا جو سراپا نور تھی۔ میں نے ایک آواز سنی — ایک عمیق، بھاری اور فاصلے سے آتی ہوئی آواز — میرے سر میں بازگشت کرتی ہوئی، جیسے کوئی بزرگ آدمی میرے کان میں سرگوشی کر رہا ہو اور صبر کی تلقین کر رہا ہو۔

"اے انسان! تو جو کہ رنج کھینچ رہا ہے
جان لے کہ صبر ایمان کا حسن ہے۔
یہ بھی جان لے کہ یہ اللہ کا عطا کردہ تحفہ ہے۔

پیغمبر ایوب کو یاد کر
وہ کہ جس نے سب کچھ برداشت کیا:
اللہ نے ان کو نمونہ بنا کر بھیجا اور انھیں احسن مانا ہے۔
اے مسلمان، تو بھلایا نہیں گیا ہے، اس تاریکی اور دیواروں کے باوجود۔
جان لے کہ صبر ہی تیری راہ ہے
اور ہر حال میں نجات کی کنجی ہے
اور تو یہ بخوبی جانتا ہے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو صبر کرتے ہیں!''

ان خوابوں کے سبب میں سکون محسوس کرنے لگا۔ انھوں نے میرا اعتماد بحال کیا۔ میں صداقت اور انصاف کے راستے پر تھا۔ مجھے اپنے دل کو امید سے معمور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ نے مجھے چھوڑا نہیں تھا۔ موت برحق، لیکن جہاں تک اذیت کا تعلق ہے میں نے اسے ایک معمولی بات سمجھنے کی کوشش کی جس پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ قوی اور مستحکم تھا میرا ایمان۔ یہ بے نیاز تھا، میرے نزدیک جس کا مطلب تھا کہ یہ خالص ہے۔ اس نے مجھے قوت دی اور وہ عزم بخشا جس کا میں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ میں نے پیغمبروں کے خواب کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ صرف میری ملکیت تھے۔ البتہ ایک خواب ایسا تھا جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ یہ خواب دلیے والے آدمی کے بارے میں تھا۔

اس خواب میں ہم میں سے بہت سے لوگ مسجد کے دروازے کے باہر جمع ہیں۔ ہم سب بھوکے ہیں اور ہمارے جسموں پر چیتھڑے لٹکے ہیں۔ شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ ہم مسجد میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرتے کیونکہ وضو کے لیے ہمارے پاس پانی نہیں۔ لوگ ہمیں دیکھے بغیر یا ہم سے بات کیے بغیر گزر جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک آدمی اچانک کھڑا ہوتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔ ہم اسے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن کوئی نادیدہ شے ہمیں جنبش کرنے سے روکے رکھتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ لوٹ آتا ہے، اس کے ہاتھ میں دلیہ گوشت کا پیالہ ہے جس میں سات سبزیاں پڑی ہیں۔ وہ اسے نیچے رکھتا ہے۔ ہم سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ لیکن وہ خود ایک کنارے کھڑا ہو جاتا ہے، نہ کھاتا ہے، نہ بات کرتا ہے۔ ہمیں دیکھتا ہوا وہ دھیرے دھیرے الٹے قدموں دور

چلا جاتا ہے۔

خواب کا بالآخر ایک صریح مفہوم سمجھ میں آ گیا: ہم میں سے ایک آدمی کی موت۔ لیکن میں واحد آدمی نہیں تھا جس نے پیش بینی کے ایسے خواب دیکھے تھے۔ جب میں نے صبح کو اپنے خواب کے بارے میں بتایا تو دوسروں نے اپنے اپنے خواب بتانا شروع کر دیے۔ وقرین نے کہا کہ اناج کے متعلق خواب دیکھنا بدشگونی ہے۔ اس کا خواب تھا: ''ایک آدمی سڑک کے کنارے کھڑا ہے، ایک کسان کے نزدیک، جو اناج کی بالیں بھون رہا ہے۔ وہ اسے ایک بالی مفت دیتے ہوے کہتا ہے، 'لو، کھا لو، یہ عمدہ اناج ہے، راستے کے لیے لے لو۔' آدمی جب آگے بڑھتا ہے تو راہ میں اسے ایک شناسا ملتا ہے لیکن وہ شخص اسے سلام کیے بغیر گزر جاتا ہے۔ اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے اسے پہچانا نہیں۔''

عباس کا خواب اس سے بھی زیادہ واضح تھا۔ محفل: قہقہے، روشنی، خوب دھوپ اور بیچ میں ایک بہت بڑا پنجرہ کبوتروں اور فاختاؤں سے بھرا ہوا۔ ایک سفید ہاتھ آسمان سے اترتا ہے، قفس کی تیلیوں میں سے اندر پھسلتا ہے اور واپس بادلوں میں گم ہونے سے پہلے ایک کبوتر کو اپنی گرفت میں لے جاتا ہے۔

خواب جن کا ہم تقابل کر رہے تھے، ایک ہی آگاہی پر مرکوز تھے۔ اسی عرصے میں موت کی بو ہمارے غار میں سما گئی۔ یہ ہر جانب بکھری ہوئی تھی، بعض مخصوص کوٹھریوں پر منڈلا رہی تھی، حتیٰ کہ ایک کوٹھری میں بیٹھ گئی۔ رات میں الوؤں نے اپنی غم افزا آواز میں چیخنا شروع کر دیا، اپنے ہی انداز سے یہ اعلان کر دیا کہ کوئی نہ کوئی جانے والا ہے۔ ان کے نوحے بعض اوقات دو دو ہفتوں تک جاری رہتے تھے اور تدفین کے بعد رک جاتے تھے۔

ہم بھی پرندوں کے پیغام کو توجہ سے سنتے تھے۔ صرف اشعر تھا جسے پیش آمدہ کو سمجھنے میں دقت ہوتی تھی اور اس پر ہماری سبقت کے سبب وہ جھنجھناتا رہتا اور ہم پر غصہ ہوتا تھا۔ ہم نے محافظوں کو آگاہ کر دیا: پلاسٹک کے تھیلے اور چونے کا سفوف تیار رکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ قبر کھودنے کا وقت۔ اس طرح کی تیاریاں وہ عموماً بے دلی سے کرتے تھے۔

''ہم نگہبان ہیں، کوئی گور کن نہیں!''

''مجبوری ہے،'' میں نے ان کو سمجھایا۔ ''ہمارے خواب بالکل واضح ہیں: کوئی نہ کوئی فوت ہونے والا ہے۔ بتا نہیں سکتا کہ موت ہم سے کسے اپنے ساتھ لے جائے گی۔ میری تیاری ہے، لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ابھی میری باری آئی ہے۔ اگر میری ریڑھ کا درد نا قابل برداشت ہو جائے تو تم مجھے گولی مار دینا۔ اسی سے راحت ملے گی۔''

''تمھارے خواب میں ہی ایسا ممکن ہے! جیسے ہم اتنے ہی تو رحمدل ہو جائیں گے! یہاں رحم کھانا ممنوع ہے۔ یہ بس یوں ہی ہے۔ تمھیں یہ سب معلوم ہونا چاہیے، خصوصاً یہ سب دیکھنے کے بعد۔''

''لیکن ہم سب تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں...''

''نہیں، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم وفادار اور ایمان دار سپاہی ہیں۔ یہ ہمارے لیے فخر کا مقام ہے کہ اس کام کے لیے فوج نے ہمارا انتخاب کیا۔''

''ہم سب ایک ہی خاندان سے ہیں!''

''تمھارے جیتے جی تو نہیں! اگر تم موت مانگتے رہو گے تو یہ تمھیں ملے گی ہی!''

''آگے بڑھو!''

''ہرگز نہیں!''

میں ہنسنے لگا، اشعر غصے سے بڑبڑانے لگا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ وہ الگ تھلگ پڑ گیا ہے۔

27

ہر سردیوں میں کم از کم ایک بار نگہبانوں پر جنون کا دورہ ضرور پڑ جاتا تھا۔

ہم سوئے ہوئے تھے کہ وہ دھمکتے ہوئے آئے، فلیش لائٹیں چمکاتے، ڈنڈے ہاتھ میں لیے اور سیمی مشین گنیں اپنے کندھوں پر لٹکائے ہوئے۔ وہ کافی پریشان نظر آ رہے تھے، جیسے کسی تخیلی فساد کو ختم کرنے کے درپے ہوں۔

''یہ شور مچانا بند کرو تم لوگ۔ خنزیروں کی طرح چیخ رہے ہو، جنوں کی طرح چیخ کر رہے ہو

—بند کرو یہ سب، ورنہ تم پر چوہے چھوڑ دیں گے!''

ہم گہری نیند میں تھے جب انھوں نے ہمیں جگا دیا۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہمیں تنہا چھوڑ دو، قسمیں کھائیں کہ ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بولا ہے، نہ ہنسا ہے، نہ چلّایا ہے۔ لیکن سب بے سود۔ انھیں یقین تھا کہ ہم محفل جمائے تھے یا انقلاب کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو ہم سے رہا نہ گیا، بے اختیار قہقہے لگانے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ لوگ مخبوط الحواس ہو گئے ہیں۔ وہ دوبارہ لوٹ آئے، پہلے سے بھی زیادہ اضطراب کے عالم میں اپنے ڈنڈوں سے ہمارے دروازے ٹھوکنے لگے۔ ان کا شور کان پھاڑ تھا۔

''اگر تم پر جن سوار ہیں، اگر تم لوگوں نے شیطان سے ساز باز کر رکھی ہے، تو ہم تمھیں پیٹ پیٹ کر ہلاک کر ڈالیں گے اور تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ بس بہت ہو چکا سرکس!''

ہمیں ان سے بحث کرنے کی یا یہ ثابت کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی کہ ہمارے بھٹ میں کوئی جن نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو، اگر جنوں کا وجود ہوتا تو وہ اس غار سے دور ہی رہتے جہاں شیطان لعین پہلے ہی کامیابی پا چکا تھا۔

بعض راتیں ایسی ہوتیں جن میں ہم گولیاں چلنے کی آوازیں سنتے۔ بعد میں پتا چلتا کہ اپنے خیال میں انھوں نے کوئی پرچھائیں دیکھی تھی جس پر انھوں نے گولیاں چلا دیں کیونکہ انھیں حکم تھا کہ ہر مشکوک شے کو گولی مار دیں۔

وہ بھوتوں پر مشتعل ہونے لگتے، خصوصاً پورے چاند کی روشنی میں، یا جب ان کے اعصاب جواب دے جاتے۔ اگلے دن صبح کو وہ کمانڈنٹ کو رپورٹ کرتے، جو اس کے جواب میں رباط میں واقع ہیڈکوارٹر کو واقعے کی تفصیلات بھیجتا: گولیاں غلطی سے چلائی گئیں۔ اعصابی تناؤ تھا۔ نگہبانوں پر ماہِ کامل کا منفی اثر ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ اس سے ہماری تفریح کا سامان تو ہو جاتا مگر ہماری زندگی کی خستگی کم نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اشعر ہمیشہ ہی خوشی کا اظہار کیا کرتا۔

''بہت بڑھیا!'' وہ کہتا۔ ''ہم اکیلے نہیں ہیں جنھیں آسیب نظر آتے ہیں۔ وہ بھی سڑی ہو رہے ہیں۔ میری حوصلہ افزائی کے لیے اچھا ہے۔''

ایک دن وہ آئے اور بھٹ میں ہر طرف جراثیم کش دوا چھڑکنے لگے۔ پھر وہ جلانے کے لیے

لوبان اوراگر لے کرآئے جس کا مقصد جنوں کو بھگانا تھا۔ اس سے میں سچ مچ گدگدی محسوس کرنے لگا۔ انھوں نے کئی عمل پڑھے جو کچھ اس طرح سے تھے: ''اللہ ہمیں ان لوگوں سے محفوظ رکھے جنھوں نے شیطان کے ساتھ سازباز کی ہے، جو شیطان کے ہم نوالہ ہیں اور جن کی آنکھوں سے بدی جھانکتی ہے! قادرِ مطلق شیطان اور اس کے چیلوں کے بدی کے جال کو نیست ونابود کر۔ اللہ ہمیں قوت دے اور بصیرت دے کہ اس کے کالے کرتوتوں پر فتح پائیں اور ہمیں جلدی چھٹی دلانے میں مدد کرتا کہ اس جنون کو بھول سکیں جو سدا کی اجاڑ اس سرزمین پر ہمیں خطروں میں مبتلا رکھتا ہے!''

پھر میں نے دوسری طرح کی دعا کا ورد شروع کردیا: ''میں خدا سے فریاد کرتا ہوں کہ ہمیں شیطان کے غضب سے محفوظ رکھے! اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم!''

میرے ساتھیوں نے میرے ساتھ ساتھ دہرایا، جبکہ استاد الغربی نے قرآن کی تلاوت شروع کردی۔ محافظ تلاوت سے ڈر گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم ان کا مذاق اڑا رہے ہیں، چنانچہ بھٹ سے نکل بھاگے۔ بعد میں پتا چلا کہ جنوں کو بھگانے کا یہ عمل ان کے اپنے ذہن کی اپج تھا۔ یہ واحد اقدام تھا جو انھوں نے اس بھٹ میں میرے اٹھارہ سالہ قیام کے دوران اپنے طور پر پہلی بار کیا تھا اور کمانڈنٹ کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے بھٹ میں خود کبھی قدم نہیں رکھا تھا لیکن وہاں جو کچھ واقع ہوتا سب خبر رکھتا تھا۔ شروعاتی دنوں میں، جب ہم میں سے ایک ساتھی شدید بیمار پڑا تو ہم نے محافظوں سے التجا کی تھی کہ کمانڈنٹ کو اس کی اطلاع دے دیں۔ جب انھوں نے ہمت کرکے اس سے جا کر کہا، مثلاً یہ کہ ''سولہ نمبر بہت بیمار ہے'' تو وہ ان پر بہت چیخا چلایا تھا۔

''مجھے یہ بتانے مت آؤ کہ فلاں فلاں بیمار ہے! میرے پاس آؤ صرف یہ خبر دینے کے لیے کہ وہ مر گیا ہے، تاکہ میں اپنی فائلیں اپ ٹو ڈیٹ رکھ سکوں۔ سمجھ میں آیا؟ میں یہ لفظ 'بیمار' سننا تک نہیں چاہتا۔ اب جاؤ— دفع ہو جاؤ!''

کمانڈنٹ، جس نے کبھی ہمیں اپنی صورت نہیں دکھائی، بذاتِ خود ایک معما تھا۔ ایک دن صرف تھوڑی توجہ پانے کے خیال سے اشعر نے دعویٰ کیا کہ کمانڈنٹ اس کا واقف کار ہے۔ اس کو چیلنج کیے بغیر ہم نے طے کیا کہ کمانڈنٹ کا حلیہ بیان کرتے ہیں، یا کم از کم یہی باتیں کرتے ہیں کہ ہم اس کو کیسا تصور کرتے ہیں۔

''وہ پستہ قد، موٹا اور بدصورت ہے۔''

''اس کی مونچھیں ہیں، جس سے اس میں مردانہ پن آ گیا ہے۔''

''اس کے منہ میں بساند ہے۔''

''وہ جاہل ہے۔ پڑھ نہیں سکتا، لکھ نہیں سکتا، سوائے مختصر اور سادہ رپورٹوں کے۔''

''وہ دبلا پتلا ہے، اس کے چہرے پر جھریاں ہیں، اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں، اور وہ سرد نظروں سے گھورتا ہے۔''

''اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی جسمانی خامی بھی ہے۔''

''اس کا کوئی گھر بار نہیں۔''

''وہ چین کی نیند سوتا ہے۔''

''اس کو ورغلایا نہیں جا سکتا۔''

''وہ نظم وضبط کا سخت پابند ہے اور آبی غذائیں نہیں کھاتا۔''

''وہ اس کتے کی طرح فرماں بردار ہے جسے اپنے شکار کو مارنے کی تربیت دی گئی ہو، کہ پہلے شکار کا گلا چیر ڈالے، پھر اس کا خون پیے اور جگر چبا ڈالے۔''

''وہ کبھی شک شبہے کا شکار نہیں ہوتا۔''

''شک کرنے کے لیے سوچنا پڑتا ہے — اور سوچنے کا کام وہ کبھی نہیں کرتا!''

''اسے ضرور کوئی لاعلاج بیماری ہوگی۔''

''میں شرط لگاتا ہوں کہ وہ خود کو اوفقیر * کی طرز پر ڈھال رہا ہے۔

''اس میں یہ سب کچھ ہے،'' اشعر نے مداخلت کی۔ ''اس کے علاوہ ایک بات ایسی بھی ہے جس کا تمھیں اندازہ نہیں۔ وہ آدم خور ہے۔ اسے آدمیوں کا گوشت کھانا پسند ہے۔ وہ شکم پرست ہے، اور کمسن لڑکوں کو ترجیح دیتا ہے۔ یہاں اس کا تبادلہ اسے رباط سے دور رکھنے کے لیے کیا گیا ہے، اور سزا دینے کے لیے بھی۔ لیکن وہ اسے سزا نہیں سمجھتا — اپنے اعلیٰ افسروں کا حکم بجا لانا اس کے لیے باعثِ عزت ہے۔ اسے فرمانبرداری پسند ہے اور اطاعت میں حد سے زیادہ مستعد ہے۔ اگر تم اس کو سڑک پر چلتے دیکھو تو اس پر دھیان تک نہ دو گے۔''

''تم درست کہتے ہو، اشعر۔ باطنی سفا کی راکشسوں کے چہروں پر نہیں لکھی ہوتی۔ یہ لنڈنٹ ضرور کوئی اچھا فوجی ہوگا اور ہو سکتا ہے وہ کوئی اعلیٰ افسر ہو۔''

بعد میں پتا چلا کہ یہ کمانڈنٹ نہایت سفاک تھا اور فرانسیسی کولونیل آرمی کا زائیدہ تھا۔ انڈو چائنا کے محاذ پر جا چکا تھا۔ وہ اس دستے میں تھا جو جنرل بوبُرڈی لاتور کے ماتحت مراکش میں تعینات تھا اور جسے بربر لوگ موحہ او لاتور کہتے تھے، اور جس نے نوعمر اوفقیر کو دریافت کیا اور اسے تربیت دے کر محل میں مامور کیا تھا۔

کمانڈنٹ کا تعلق اوفقیر کی نسل سے تھا۔ وہ بھی فرانسیسی افواج میں لیفٹیننٹ تھا۔ اس کو ترقی ملی، شاہی مسلح فوج میں شامل ہوا اور ملٹری اکیڈمی میں معلم بھی رہا۔ اس بھٹ نما جیل کا انتظام وانصرام سنبھالنے کے لیے اسے یوں ہی نہیں چنا گیا تھا۔ فوج اور پولیس میں وہ خصوصی خدمات کا حامل رہا تھا۔ خاموش مزاج، پتھر جیسا سرد دل قاتل تھا وہ۔

کمانڈنٹ دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے انسانوں جیسے ہوتے ہیں لیکن ان کے دل اور جسم بہت احتیاط سے انسانیت سے یکسر عاری کر دیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں سے ہر ایسا وصف جس میں انسانیت کا ذرا سا بھی شائبہ ہو، اس طرح نکال پھینکتے ہیں جیسے دوسرے لوگ اپنا ہی خون بہانا قبول کر لیتے ہیں۔ بلا پشیمانی، بلا جھجک۔

کمانڈنٹ نے اپنا رول خوف آگیں سادگی اور سکون سے نبھایا تھا۔ اس نے ایک ایسے شخص کا کردار پوری طرح سے قبول کر لیا تھا جو طے شدہ آہستہ روی کے ساتھ اور اذیت کی دقیق خوراک دے کر موت کو لاتا ہے۔ وہ بس ایسا ہی تھا۔ اسی مشن اور ایسی خواہش سے معمور جو دوسروں نے اس میں بیدار کی تھی۔ ایسی پیپ سے بھرا ہوا جسے وہ اپنے شکار میں منتقل کر دیتا تھا۔ اس کا پیٹ بے سود نفرت سے پھولا ہوا تھا، اس کی آنکھیں اپنے اعلیٰ افسروں کی اطاعت کے زرد خون سے یرقان زدہ تھیں۔

کمانڈنٹ کو یہ سوچنا اچھا لگتا تھا کہ وہ کمانڈنٹ ہے اور سب کی نظروں سے اوجھل رہ کر وہ بچے کھچے قیدیوں کے اعصاب سے کھیل رہا تھا، اور خوفناک لگڑ بگھے کی طرح اکیلا خود ہی قہقہے لگاتا تھا۔ یہ وحشی بذاتِ خود پاتال تھا۔

میں اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا تھا۔

28

میں حالانکہ حوصلہ شکنی کے خلاف مزاحمت کرنے قادر تھا، کمانڈنٹ کو اپنے خیالوں سے دور رکھتا اور یہ سمجھ رکھتا تھا کہ مجھے اس سے اور اس کے بھوتوں سے کشتی لڑنے کی نہیں بلکہ اپنے اندر سنگھرش کرنے کی ضرورت ہے، پھر بھی بعض دفعہ میں یہ سوچ کر حیران ہوتا کہ وہ کون سی قوت ہے جو میری روح اور تن کا رشتہ زندگی کے ساتھ جوڑے ہوے ہے۔

میرے لیے میری راہ اذیت نے طے نہیں کی تھی — میں نے خود طے کی تھی، تمام اذیتوں سے پہلے اور پرے۔ مجھے اپنے شکوک پر، اپنی ناکامیوں پر قابو پانا تھا، اور سب سے بڑھ کر ان واہمات پر جو ہر انسان کے وجود میں پرورش پاتے ہیں۔ وہ کس طرح؟ انھیں اپنے اندر ہی مرنے دے کر۔ میں اب ان تصویروں پر بھروسا نہیں کرتا تھا جو حقیقت کو جھٹلاتی ہیں۔ اپنے محسوسات پر حقیقت کا گمان کرنا، ایسے جھوٹ کی پرورش کرنا جو آدمی کے اندر جنم لے کر اسی میں دم توڑ دیتا ہے، اور پھر اسے ہنر سمجھنا کمزوری ہے۔

اس صحرا میں اپنی راہ پر آگے بڑھنے کے لیے مجھے ہر شے سے آزاد ہونا تھا۔ میں نے جان لیا تھا کہ صرف ایسا ذہن ہی جو سارے بندھنوں کو جھٹک دے، ہمیں اس لطیف طمانیت کی راہ دکھا سکتا ہے جسے میں وجد کہتا تھا۔

نمبر پانچ، عبدالمالک، ایک نیک سیرت لڑکا تھا۔ وہ کبھی شکایت نہیں کرتا تھا۔ اشعر اس کو پریشان کیا کرتا اور اس کی طمانیت پر حسد کرتا تھا۔

''عبدالمالک، کیا تمھیں کبھی درد نہیں ہوتا؟ تم ہمیں یقین دلانا چاہتے ہو کہ تم سپر مین ہو، میرے سامنے والے پڑوسی کی طرح۔ لیکن میرے خیال میں تم کچھ چھپا رہے ہو۔ اپنی خاموشی سے تم دھوکا دے رہے ہو، تم گروپ سے دور ہو گئے ہو۔ یہاں ہر آدمی بیمار ہے۔ کوئی بھی تندرست نہیں۔ تم ہی اکیلے ہو جو ہماری طرح تکلیف میں مبتلا نہیں۔ تم آخر ہمیں سمجھتے کیا ہو!''

اس مرحلے پر مجھے مداخلت کرنی پڑی۔

''اشعر، خاموش رہو۔ اسے تنہا چھوڑ دو۔ اس کی خواہشوں کا احترام کرو۔''

''اوہ، قدرتی بات ہے۔ تم بھی تو اسی جیسے ہو۔ تم بھی پھنسے ہوئے ہو۔ واقعی 'ہی مین' ہو۔ کوئی بات تمھیں پریشان نہیں کرتی۔ مجھے تمھارا کھیل سمجھ میں آرہا ہے۔ گاؤدی نہیں ہوں میں۔''

''یہ سب بند کرو، اشعر۔ ورنہ ہم تمھیں تنہا چھوڑ دیں گے۔''

''نہیں، یہ نہ کرنا۔ یہ میری جان لے لے گا... لیکن برائے مہربانی اپنے دوست سے کہو وہ مجھ سے بات کرے، بس تھوڑی سی۔''

''مجھے اس سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے لگے گا کہ تم سے بات کرنی چاہیے تو کرے گا۔ اگر وہ خاموش رہتا ہے تو اس لیے کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں چپ ہو جاتا ہوں! ٹھیک ہے... لیکن میں بیزار ہو رہا ہوں! تم بیزاری سے کس طرح بچتے ہو؟''

''میں غور و فکر کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، خود کو قرآن کی سورتیں سناتا ہوں، تم سب کو سنانے کے لیے کہانیاں کہتا ہوں۔ یہی سب کرتا رہتا ہوں۔''

ایک لمحے خاموش رہ کر وہ بولا، ''کیا تم سورۂ بقر پڑھنے میں میری مدد کرو گے؟''

''ابھی نہیں۔ یہ وقت فواد کا ہے، ہمیں انگریزی کا سبق پڑھانے کے لیے۔''

عبدالمالک نے ہماری سرگرمیوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ غیر حاضر رہنے لگا۔ مجھے اس کی فکر ستانے لگی تھی، لیکن میں نے اسے ڈسٹرب کرنے کی ہمت نہیں کی۔

محافظوں نے دیکھا کہ اس نے اپنا مانڈ کھانا چھوڑ دیا ہے، لیکن نان رکھ لیتا تھا۔ اس نے اپنے 1936 کے کمبل میں سے ایک کا تھیلا بنا لیا تھا اور نان اس میں سینت کر رکھتا رہتا تھا۔ وہ نان کو بالکل سخت ہونے دیتا، پھر اپنی ایڑی سے کچل کر انھیں ریزہ ریزہ کرتا، ریزوں کو بھگوتا اور نگل لیتا۔ روزانہ یہی اس کی واحد غذا تھی۔ وہ اسی باسی روٹی کے ریزے کھاتا تھا جو اس کے تھیلے میں کئی دن کی باسی ہو جاتی تھی۔

ہمیں یہ بات معلوم نہ تھی، لیکن اس نے مرنے کا اپنا راستہ چن لیا تھا۔ جب میں نے اس کو پکارا

تو وہ کہنے لگا کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور یہ کہ رہائی کی گھڑی اب نزدیک ہے۔ یہ بات مجھے مضحکہ خیز لگی، اور میں نے پوچھا کہ کیا اس نے بچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔

''ہاں، لیکن اس بار وہ مجھے پکڑ نہ سکیں گے۔''

وہی دراصل ہم میں واحد شخص تھا جس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس بھٹ میں ہماری قید کے ابتدائی دنوں میں ایک صبح جب محافظوں نے روٹی اور کافی اندر رکھنے کے لیے اس کی کوٹھری کا دروازہ کھولا تو وہ ان کو دھکا دے کر آگے بڑھا، کافی کے برتن کو، جو ٹین کا تھا، ٹھوکر ماری اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔ چیختے چلاتے محافظ اس کے پیچھے دوڑے، بیچ صحن میں اس کو جا پکڑا اور بری طرح پیٹنے لگے۔

''غلیظ حرامزادے! تم نے تو ہمیں مروا ہی ڈالا تھا! ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے جو ہمیں یوں کس رہے ہو؟ خوش قسمتی تھی تمھاری کہ ہم نے تمھیں پکڑ لیا — وہاں واچ ٹاور کے محافظوں کو حکم ہے کہ جس چیز میں بھی حرکت دیکھیں اسے گولی مار دیں!''

جب وہ اسے اس کی کوٹھری میں واپس لائے تو انھوں نے ہمیں فساد کا قانون پڑھ کر سنایا۔

''اگر تم لوگوں نے جیل توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی ماردی جائے گی — اور تمھارے ساتھ ہمیں بھی!''

اس کوشش کی ناکامی نے بچنے کے ہر خیال کا خاتمہ کر دیا۔ عبدالمالک اس صدمے سے کبھی باہر نہ آسکا۔ وہ کئی دن تک بھیانک تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد فوت ہوا۔ جب محافظ اس کے جسد کو لے کر چلے گئے تو میں اس کے کپڑے، کمبل اور تھیلا لینے گیا جو ابھی تک نان سے بھرا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے محافظ کے سامنے کھولا جس کے ہاتھ میں فلیش لائٹ تھی، تو میرا جی متلانے لگا: تھیلے میں روٹیاں کم اور کاکروچ زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ روٹی کے ریزوں میں انھوں نے انڈے دے رکھے تھے۔ غریب عبدالمالک کیسے دیکھ پاتا کہ وہ کیا کھا رہا ہے۔ وہ کاکروچوں کے ہزاروں انڈوں کے زہر سے مر گیا۔

اشعر پر اس کی موت کا گہرا اثر پڑا۔ وہ اس پر شرمندہ تھا کہ عبدالمالک کے خاتمے سے چند ہفتے پہلے اس نے اس پر طنزیہ فقرے کسے تھے۔

29

کریم جو ہماری بولتی گھڑی، ہمارا کیلنڈر اور اندھیرے میں ہماری روشنی تھا، اب تھکنے لگا تھا۔ وہ مہینہ اور برس تو بتاتا تھا لیکن دنوں اور گھنٹوں کا حساب رکھنا چھوڑ چکا تھا۔ مشین بوسیدہ ہوتی جارہی تھی، اس کا حافظہ جواب دے رہا تھا۔ مجھے وقت کا تقریباً درست اندازہ رہتا تھا، چنانچہ اس کی درخواست پر یہ ذمے داری میں نے لے لی۔

جیل میں رہتے ہوئے ہمیں تیرہ برس بیت چکے تھے۔ ہم میں سے آدھے سے زیادہ لوگ مر کھپ چکے تھے۔ ہمارے محافظ اب بھی وہی تھے جنھیں زندگی بھر کے لیے ہم پر مسلط کیا گیا تھا۔ کئی دفعہ پرندے آئے۔ ان میں سے بعض نے نغمے سنائے، بعض نے کبھی جیل کے صحن کی خبریں دیں اور کبھی موسم کا احوال بتایا۔

ہم نے اس جہنم میں مخصوص معمولات قائم کر لیے تھے۔ محافظوں کا موڈ اکثر خراب ہی رہتا تھا۔ ان میں بعض تنہائی کی شکایت کرتے۔ میں نے غور کیا کہ محافظِ اعلیٰ سارجنٹ مفاضل کبھی کبھی میرے بائیں جانب والی کوٹھری پر ٹھہر جاتا ہے اور وقرین سے تامازائٹ* زبان میں باتیں کرتا ہے، یوں ہی تھوڑی سی باتیں۔ ایک دن مفاضل نے اپنی آواز نیچی رکھی —— وہ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ میں نے مداخلت نہیں کی لیکن اندازہ لگا لیا کہ وہ شاید ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف سسرالی رشتے سے کزن تھے بلکہ ان کے خاندان بھی ایک معاہدے کے ذریعے باہم وابستہ تھے جسے بربر لوگ 'تاتا' کہتے ہیں۔ مجھے اس لفظ کے مصدر کا کبھی علم نہ ہوسکا۔ بیرکوں میں انڈوچائنا کے غازی اس لفظ کو ایسی گول جھونپڑی کے لیے استعمال کرتے تھے جس میں فوجیوں کو چند گھنٹے کی سزا کے لیے بند کیا جاتا تھا۔

لیکن بربروں کے نزدیک اس کے بالکل ہی الگ معنی تھے: بعض پیچیدہ وجوہ سے کوئی خاندان کسی دوسرے خاندان یا قبیلے کے ساتھ وفاداری کا عہد کرتا ہے اور خود کو اس کی امان میں، بلکہ ان کی سرپرستی تک میں دے دیتا ہے۔ یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

مقدس مانا جاتا ہے۔ اخلاقی تعاون، مادی امداد اور مکمل یک جہتی اس خاندان کے اراکین کے تئیں برتی جاتی ہے جسے 'تاتا' کہتے ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ انھوں نے ایک دوسرے کو کیسے پہچانا۔ وقرین اور مفاضل کو اس دریافت میں برسوں لگ گئے کہ وہ تاتا کے قوانین کے تحت باہم وابستہ ہیں۔

جب میں نے مفاضل کے ساتھ اس کی سرگوشیاں سنیں، اس کے چند ہفتوں بعد وقرین نے ہم دونوں کی کوٹھریوں کی درمیانی دیوار پر دوبار دستک دی۔

''کیا تم میری بیوی کے نام خط لکھ دو گے؟''

میں حیران رہ گیا۔

''خط؟ لیکن کیا تمھارے پاس ضروری سامان موجود ہے، کوئی کاغذ اور پنسل؟''

''مجھے یہ جلد ہی مل جائیں گے۔ میرے خیال میں اپنی بیوی تک خط بھجوانے کا ایک موقع مجھے ملنے والا ہے۔ لیکن ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''کاغذ اور پنسل تمھیں کیسے ملیں گے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو، جیسا کہ میں بھی جانتا ہوں، کہ یہ اشیا قیمتی ہیں اور اس بھٹ میں قطعاً ممنوع ہیں۔''

''سنو! میں اس کی وضاحت بعد میں کروں گا لیکن فی الحال یہ بتاؤ کہ کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ تم جانتے ہو کہ میں حروف بھول چکا ہوں۔ میں اب پڑھ نہیں سکتا۔ یہ میرا مرض ہے۔ لیکن تم نے اپنے ذہن کو درست رکھا ہے۔ مجھے اب الفاظ بھی یاد نہیں رہتے۔''

''یقیناً، میں تمھاری مدد ضرور کروں گا۔ لیکن بہت محتاط رہنا۔''

''بالکل۔ مفاضل میرا کزن ہے۔ دراصل وہ سچ مچ کزن نہیں بلکہ میری بیوی اس کی بیوی کی عم زاد ہے۔ میرا خیال ہے، ہم دونوں کے خاندانوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہے۔ کسی دن میں تم کو سمجھاؤں گا کہ کس قسم کا۔ اس کو بولنے کی اجازت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرا خط اسمگل کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ اس کے لیے اسے اپنی اگلی چھٹی کا انتظار کرنا ہوگا اور خاص طور سے اس محافظ کی تبدیلی کا جو فوجیوں کے جاتے وقت ان کی تلاشی لیتا ہے۔''

اور اس طرح تین مہینے کے انتظار، خفیہ ملاقاتوں اور خطروں کے بعد وقرین اپنی کوٹھری کے کھلے دروازے سے نکل کر میری کوٹھری کے دروازے سے کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ اور پنسل کا ایک چھوٹا ٹکڑا اندر کھسکانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے فرش پر ہاتھ پھیر کر ٹٹولا اور خاموشی سے اٹھا لیا۔ خوشی کے مارے مجھے چکر آ گیا، میں ناقابلِ بیان جوش سے معمور تھا اور مجھے سخت کوشش کرنی پڑ رہی تھی کہ یہ راز نہ کھلے۔ میں پنسل کو اپنے لبوں تک لایا — ہاں، میں نے لکڑی کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو بوسہ دیا جس کے اندر پنسل کا سکہ تھا۔ پھر میں نے کاغذ کو نرمی سے ٹٹولا۔ یہ کھردرا تھا۔ لیکن ایسے میں اس کاغذ کے معیار کی پروا کسے تھی جبکہ میں اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن دیکھ رہا تھا؟

سب سے پہلے میں نے خط کی عبارت اپنے ذہن میں ترتیب دی۔ کس طرح سے شروع کروں؟ اشاروں میں لکھوں، یا پھر سچائی کو سیدھے اگل دوں؟ میں اپنے ذہن میں جملے بناتا بگاڑتا رہا۔ وقرین نے التجا کی، ''میری بیوی کو بتاؤ کہ میں زندہ ہوں اور یہ کہ وہ مفاضل کے ہاتھ دوائیں بھیج دے۔''

''ہاں، لیکن ہمیں اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر دوسرے خاندانوں کو بھی ہمارے حال کی خبر کر دینی چاہیے...''

''مجھے تم پر بھروسا ہے، لیکن بھولو نہیں کہ مفاضل بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے! بس معمولی باتیں لکھو۔''

چنانچہ چار دن تک اس پر غور کرنے کے بعد میں نے کاغذ کو دو ٹکڑوں میں بانٹا اور ایک پر یہ عبارت لکھی:

''میں خیریت سے ہوں۔ ہم تازمامرت میں ہیں۔ کوئی روشنی نہیں۔ مفاضل کو درد کی دوائیں دے دو۔ وقرین۔''

یہ ایسا لمحہ تھا کہ جس کے بعد اور کاغذ کے ٹکڑے کے توسل سے ہماری بقا میں لحہ بہ لحہ تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ میں خود کسی کو کچھ نہیں لکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے شروع سے ہی طے کر لیا تھا کہ نہ تو میرا کوئی گھر ہے اور نہ منگیتر۔

پانچ سال گزرنے کو اور باقی تھے۔ خدشات بھرے پانچ سال جن میں امید لوٹ آئی تھی —

وہ امید جو میرے اصولوں کے خلاف تھی۔ مجھے اس پر بھروسا قطعی نہیں کرنا تھا اور موت کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اس جہنم میں انھی وسائل پر زندہ رہنا تھا جو ہمارے ہاتھ میں تھے: قوتِ ارادی اور روحانیت۔

مفاضل کاغذ کے ٹکڑے کو وقرین کی بیوی کے پاس لے گیا اور ایک لفظ بھی کہے بغیر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ چونکہ پڑھنا نہیں جانتی تھی اس لیے اس نے یہ ٹکڑا ایک ایسی عورت کو دکھایا جس کا بیٹا لاپتہ ہو گیا تھا۔ اور اس طرح ایک نوجوان کو، جو فرانس میں تعلیم پا رہا تھا، اپنے بڑے بھائی، نمبر اٹھارہ، عمر کا اتا پتا ملا۔ اس عورت کی ایک بیٹی تھی جو دوا ساز تھی۔ اس نے مفاضل کو چند دوائیں دیں جو زیادہ تر درد اور جلن کی تھیں۔ ساتھ ہی بھاری رقم بھی دی۔

جب چند مہینے بعد مفاضل وقرین کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ اسے کسی دوا کی ضرورت تو نہیں، تو مجھے اس وقت فوری طور پر احساس ہو گیا کہ اسے رشوت ملی ہے — خواہ اس نے قبائلی اتحاد کے سبب ہی یہ کام کیوں نہ کیا ہو۔ کرپشن جہنم تک میں اپنے کرشمے دکھا سکتا ہے! پہلی بار مجھے اس میں نیکی نظر آئی — یہ سوچ کر کہ کرپشن چند زندگیوں کو بچانے میں مددگار ہو سکتا ہے! کاغذ کے دوسرے ٹکڑوں نے بھٹ کے باہر جانے کا راستہ کھوج لیا اور مفاضل امیر ہوتا گیا۔ عمر کے بھائی نے کرسٹین سے رابطہ قائم کیا۔ یہ ایک غیر معمولی عورت تھی، انقلابی یا زیونا ریا کی مانند حقوقِ انسانی کی ایک کارکن جو اپنی زندگی کے آئندہ کئی سال اس جیل کے وجود کا پردہ فاش کرنے اور ہماری آزادی کے لیے جدوجہد میں صرف کرے گی۔ وہ ہمیں نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس نے خود کو ہمارے مستقبل کی فکر سے یوں باندھ لیا جیسے ہم سب اس کے بھائی ہوں۔ اس نے ہماری قید کی جانب دنیا کی توجہ دلانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیے، بالکل اسی طرح کہ جب اس نے اپنے شوہر کے لیے کوششیں کی تھیں جس کے نظریات نے اسے قنیطرہ کی جیل پہنچا دیا تھا۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ خبر لیک ہونے کے ماخذ کی جانچ کے لیے کمانڈنٹ ہمارے بھٹ میں نہیں آیا۔ اس نے شاید جیل بلاک اے کے لوگوں پر شک کیا ہو گا جہاں نظم و ضبط نسبتاً کم سخت تھا۔ خیر، لگتا یہ ہے کہ افسران اس خبر کے باہر نکلنے پر ناخوش نہیں تھے۔ حق تو یہ ہے کہ خبر کو پھیلنے دینے میں انھیں ہر ممکن دلچسپی تھی — خوف اور ایک طرح کی دہشت اس سے وابستہ تھی۔ شاید مفاضل

ہی کو ابتدائی خبریں لیک کرنے کا کام سونپا گیا ہو۔ اگر ایسا نہیں تھا تو اس کی رحمدلی نے ابھرنے میں تیرہ سال کیوں لگائے؟

پریس نے جیسے ہی تازمامرت کے بارے میں بولنا شروع کیا، مفاضل ڈر گیا۔ وہ چڑچڑا ہو گیا اور ہم سے بات کرنے سے گریز کرنے لگا۔ جب وقرین کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتا تو تھوکتا اور تامازائت زبان میں کوئی نہ کوئی توہین آمیز جملہ بڑبڑاتا۔

باہر خبر کو گردش کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ کرسٹین نے ایمنسٹی انٹرنیشنل سے اور چند بارسوخ صحافیوں سے رابطہ کیا تھا۔ اب ہمارا مقدر صرف کمانڈنٹ پر منحصر نہیں تھا، بلکہ اس کا انحصار بین الاقوامی رائے پر بھی تھا۔

اس دوران لوگ یوں ہی مرتے رہے جیسے رہائی کی امید سے جنمے پیراڈوکس کے سبب مر رہے ہوں۔

30

اپریل کی اس رات کو جو کچھ گزرا اس کے لیے میں آج بھی شرمندہ ہوں۔ میں نے خود پر سے قابو کھو دیا تھا۔ اس بار چڑچڑاہٹ، غصے اور مایوسی کے سامنے بے بس ہونے کی میری باری تھی۔ میں نے دو دن سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ مجھے ذہنی ریاضت اور یہاں سے نکل کر سنگِ اسود کی تلاش میں جانے کی خواہش بھی نہیں ہو رہی تھی۔ میری اپنی کمزوریاں تھیں جنھیں چھپانے اور جن پر قابو پانے کی کوششیں میں نے کی تھیں اور مجھے کامیابی بھی ملی تھی۔ اُس درد کو لگ بھگ پوری طرح سنبھالنا میں نے سیکھ لیا تھا جس نے میری ریڑھ میں کجی پیدا کر دی تھی اور میرے ہاتھوں کو مسخ کر دیا تھا۔ لیکن اب میں ہر صبح جاگنے کے بعد خود کو یہ سمجھانا نہیں چاہتا تھا کہ پردے — سیمنٹ کے وہ پردے جن کی سلوٹیں ہمیشہ یوں ہی رہیں گی — ہمیشہ کے لیے کھینچے جا چکے ہیں۔ یہ کہ مجھے اپنا سر جھکائے ہوئے اٹھنا ہے، ایک ایسے شخص کی مانند جو کسی طرح کی کوئی توقع نہیں رکھتا، اور یہ کہ مجھے اس 'کوئی توقع نہیں' کی عادت ڈال لینی چاہیے جو پتھروں میں سے رس کر اندر چلی آتی تھی — اس وجہ سے چلی آتی تھی کہ میں نے

وقرین کے لیے خط لکھے تھے۔

شاید مجھے بھی اسی امید کی چھوت لگ گئی تھی جو وقرین اور چند دوسرے لوگوں کے آس پاس منڈلا رہی تھی؟ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ میں اپنی رہائی کا تصور کرنے لگا۔ میں نے پھر سے سورج دیکھنے کے بارے میں سوچا۔ میں نے اپنے بچپن کی روشنیاں ایک بار پھر دیکھیں۔ وہ یادیں جنھیں میں نے دور پھینک دیا تھا، سیلاب کی مانند امنڈتی چلی آئیں۔ میں نے ماں کو دیکھا، سر سے پیر سے سفید لباس پہنے۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھا، بہت دیر تک۔ وہ رو رہی تھی۔ اور میں بھی۔

ہر وہ شے جو میں نے جیل کے پچھلے تیرہ برسوں میں بنا کر کھڑی کی تھی، آہستہ آہستہ منہدم ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ کرنا تھا، اپنی ذہنی کسرتیں پھر سے شروع کرنی تھیں تاکہ روحانیت کے قالب میں لوٹ سکوں۔ میں اسی نکتے پر سوچ رہا تھا کہ الحسین نے شومیِ قسمت سے مجھ پر طنز کسنے کی ٹھانی۔ مجھے اکسانے کے لیے اس نے اسی مخصوص رات کو کیوں چنا، شک و گمان اور ضرر پذیری کی رات کو؟

"مسخرے کی اولاد، تو حرامزادہ ہے۔ تو اپنے باپ کا بیٹا نہیں، اگر وہ تیرا باپ ہوتا تو کیا اس طرح سب کے سامنے تجھ سے دستبردار ہو جاتا، کیا اس طرح جہنم میں چھوڑ دیتا اور تیرے لیے اس سے بھی بری سزا کا مطالبہ کرتا؟ جواب دے، حرامی!"

مجھے جواب ہرگز نہیں دینا چاہیے تھا اور خود کو اس سراسر تکرار میں کھنچنے سے بچا لینا چاہیے تھا۔ اس نے وہیں ضرب لگانے کی کوشش کی تھی جہاں میں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ حالانکہ میں نے اپنے باپ پر غصہ نہ کھانا سیکھ لیا تھا، اسے بھول چکا تھا اور اس طرح جی رہا تھا جیسے میں ہمیشہ سے بن باپ کا یتیم ہوں لیکن اس رات میری حالت بہت خستہ تھی۔ میں پھر سے دوسروں جیسا ہو گیا تھا: بے آسرا، ہلکان، شکستہ۔ میں بھی الحسین کو ضرر پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب ہم قنیطرہ کی جیل میں تھے جہاں ہماری کوٹھریاں ساتھ ساتھ تھیں تو وہ دل کے عارضے کے سبب ہسپتال میں بھرتی ہوا تھا۔ وہاں جس ڈاکٹر کی نگرانی میں اسے دیا گیا تھا، وہ الحسین کو پسند کرنے لگا اور اس نے اس کی بیوی سے ملاقات کرانے کی پیشکش کی۔ اس وقت تک ہمیں خفیہ قید میں نہیں ڈالا گیا تھا۔ ہم اپنی دس سالہ قید کی سزا کاٹ رہے تھے اور عام قیدیوں کی طرح ہمارا بھی علاج معالجہ ہوتا تھا۔ الحسین کی بیوی ملنے آئی تھی اور وہ ہم بستر بھی

ہوے تھے۔ اس نے یہ واقعہ مجھے درجنوں بار سنایا تھا اور یہ تک قبول کیا تھا کہ اسے یاد کر کے وہ جلق لگایا کرتا ہے۔ ان کی اس ملاقات کے نتیجے میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ اس کو یہ خبر تازمامرت میں ہماری منتقلی سے ایک دن پہلے ملی تھی۔ وہ سرشاری کے عالم میں تھا۔ میں نے فی الفور حساب لگا لیا تھا کہ جیل کے ہسپتال میں ان کی ملاقات کے پورے نو مہینے دس دن بعد بچے کی پیدائش ہوئی۔ میں نے یہ سوچ کر اس سے کچھ نہیں کہا کہ شاید اس تک خبر پہنچنے سے کئی دن پہلے بچہ پیدا ہو چکا ہوگا۔ خیر، میں نے اس واقعے کو جوابی حملے کے لیے اُس رات استعمال کیا جب میں آپے میں نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، اگر تم اسی طرح سمجھتے ہو تو میں حرامی ہوں! اور تم، تم تو نجیب خاندان سے ہو۔ تمھارا باپ سچ مچ تمھارا ہی باپ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے بیٹے کے باپ ہو؟ یاد کرو، تمھاری بیوی نے نو مہینے اور دس دن کے بعد اسے جنم دیا تھا! تمھارا بیٹا وقت سے پہلے پیدا نہیں ہوا! وہ کس کا ہے؟ تمھارے بعد کسی اور نے گھسایا تھا۔ سوری الحسین، لیکن تمھی نے یہ سب بولنے کو مجبور کیا...''

''کتیا کے پلے! تم جانتے ہو کہ میری بیوی معزز خاندان سے ہے اور وہ ہر چیز سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تم یہ کہانی کیوں گڑھ رہے ہو؟''

''میں کوئی کہانی نہیں گڑھ رہا۔ تمھی نے مجھے ہر بات بتائی تھی۔ یاد کرو، تم نے اس پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا، پھر تم نے اس معاملے کو درکنار کر دیا اور اپنے بیٹے کا نام مبروک رکھا، اس کی ماں کے نام پر!''

''تمھارا باپ بھڑوا ہے!''

''مجھے کیا پروا! لیکن تم؟ تم تو پائیدان ہو۔ اکیڈمی میں کپتان تم سے تحقیر کا سلوک کرتا تھا لیکن تم نے اپنے لیے کبھی منھ نہیں کھولا۔''

''میں احکامات کی تعمیل کرتا تھا!''

''کوئی کیڈٹ کپتان کی بیوی کے گھریلو کام کرنا کیسے قبول کر سکتا ہے؟ یہ عام فوجیوں کا کام ہے۔ تم میں غیرت کا شائبہ تک نہیں۔''

''اور تم نرے احمق ہو! تمھارے باپ نے تمھیں ترقی دلا کر لیفٹیننٹ بنوانے کی کوشش کی تھی

لیکن تم نے کیڈٹ رہنا ہی منظور کیا، کیونکہ تم نکمے ہو...''

''ترقی کی ایسی تیسی! ذرا اپنے آپ سے پوچھو کہ اس نیک ڈاکٹر نے تمھاری بیوی کو تم سے کیوں ملنے دیا۔ تم کیا سمجھتے ہو اس میں اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا؟''

''میری بیوی ایسی نہیں ہے، تم دیکھتے رہنا، جب میں باہر نکلوں گا وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اور تم، کوئی بھی تمھارا منتظر نہ ہوگا! تم کسی کی اولاد نہیں، کوئی تمھارا ٹھور ٹھکانہ نہیں، گشتی کا بچہ...''

''اپنی عورت کے بھڑوے!''

''خائن!''

''نکمے!''

''بیگاری!''

''حاسد!''

''گدھے!''

''جلقی!''

''گناہ کی اولاد!''

گالیوں کا تبادلہ ہم ساری رات کرتے رہے۔ بے چارہ الحسین مجھ سے پہلے ٹوٹ گیا اور رونے لگا۔ میں بھی روہانسا ہو تھا، اور خود سے شرمندہ تھا۔ میں نے اسے جو تکلیف پہنچائی تھی اس سے نالاں اور رنجور تھا۔ میں مجرم ضمیری میں مبتلا ہو گیا کیونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ زود شکن تھا۔ میں نے اس سے معافی مانگی، اس کو تسلیاں دینے کی کوشش کی، یہاں تک کہ قسم کھا کر جھوٹ بولا کہ میری سب سے چھوٹی بہن تین ہفتے کی تاخیر سے پیدا ہوئی تھی... لیکن سب فضول تھا۔ الحسین کا دل ٹوٹ گیا۔ میرے طعنوں نے اسے ختم کر دیا۔ جہاں تک اس کے طعنوں کا تعلق ہے تو انھوں نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ مجھے بس میرے باپ کی یاد دلا دی، اور اس سلوک کی جو میرے باپ نے میرے ساتھ کیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے اسے سلطان کے قدموں میں پڑا ہوا تصور کیا، اپنے اس نالائق بیٹے سے دستبردار ہوتے دیکھا جس نے اس کے ساتھ خیانت کی تھی اور اس کے بادشاہ کے ساتھ اس کے رشتے کو زک پہنچائی تھی۔

لیکن الحسین دیوانہ ہو گیا۔ ہفتوں تک اس نے کسی سے بات نہیں کی، رات دن اپنی بیوی مبروکہ کے نام کی رٹ لگائے رہا۔ جب ہم قرآن کی تلاوت کرتے تو وہ بڑبڑاتا رہتا تاکہ ہمارے لفظوں کے آہنگ میں خلل پڑے۔ وہ ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا اور خود کو تباہ کر رہا تھا۔ جب مفاضل دوائیں لے کر آیا تو میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے چند گھنٹے اس کی کوٹھری میں گزارنے کی اجازت دے دے۔ یہ مئی کے مہینے کی بات ہے۔

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اسپرین دی۔ وہ ڈھانچے میں تبدیل ہو چکا تھا اور مسلسل رو رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو، پلیز''، میں نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ اپریل کی اس رات کو تم سے میں نہیں بول رہا تھا — وہ شیطان تھا جو مجھ پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ میرے تاریک خیالوں میں تھا، میری آواز میں تھا، اور وہی تم کو مجروح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بھی تکلیف میں مبتلا رہا، اور اب بھی تکلیف میں ہوں۔ ہم سب یہاں سے آزاد ہوں گے، صبر کرو۔ تمھاری بیوی اور بیٹا تمھارا انتظار کر رہے ہیں، انھیں ہرگز مایوس نہ کرنا۔ یہ لو، دوا کھا لو، اور کھانا بھی اچھی طرح کھایا کرو۔ ذرا یاد کرو الحسین کہ اسکول میں ہم کیسے دوست تھے اور کس طرح ہم قنیطرہ میں ساتھ ساتھ قید رہے اور یہاں بھی ساتھ ہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تمھیں ہمت سے **کام لینا ہوگا — پلیز**، نہ جاؤ۔ اگر تم ہمیں چھوڑ گئے تو میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اب زیادہ مشکلیں باقی نہیں۔ ہم تقریباً کامیاب ہیں! کیا تم وہ سب دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ پا رہا ہوں؟ براے مہربانی ہمت سے کام لو، اپنی آنکھیں کھولو۔ ذرا اس طرف دیکھو: تمھاری ماں، تمھاری بیوی اور تمھارا بیٹا تمھارے لیے خوشبوؤں کا پیالہ لے کر آ رہے ہیں، وہ تمھارے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ انھوں نے گھر پر سفیدی کرائی ہے۔ ہر شخص تمھارا منتظر ہے۔ پارٹی میں، میں بھی تمھارے ساتھ چلنا چاہوں گا۔ بولو، مجھے بھی دعوت دو گے نا؟ اس کے بعد ہم ساتھ ساتھ مکہ جائیں گے۔ قسم کھاتا ہوں تمھیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ صرف ہاں کہو اور میں تمھیں دعوت دوں گا۔ ہم جہاز پر سوار ہوں گے اور قاہرہ میں رکیں گے جہاں ہم اہرام دیکھنے جائیں گے۔ میں تمھیں اپنے ساتھ اس کیفے میں لے جاؤں گا جہاں نجیب محفوظ جاتا ہے، وہی مصری ادیب جنھیں نوبیل انعام ملا ہے۔ ہم ان کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں گے اور پھر ایک طمطراق سے زیارت کے لیے آگے جائیں

گے۔ اب ماندگی نہ ہوگی، مشقت نہ ہوگی۔ ہمت نہ چھوڑو...''

اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور صرف اتنا ہی کہہ سکا، ''یہ سچ ہے۔ میں اپنے بیٹے کا باپ نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہے۔ تم نے درست کہا۔''

''نہیں، قطعی نہیں۔ تم غلط کہہ رہے ہو! وہ تو میں نے تمھیں تکلیف پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ مجھے خود اس پر یقین نہیں تھا۔ الحسین، پلیز، میں تم سے التجا کرتا ہوں، مجھے معاف کردو! میں نے وہ کہانی اس لیے گڑھی کیونکہ تم مجھ پر حملے کررہے تھے۔ تمھارا بیٹا واقعی تمھارا بیٹا ہے۔ وہ تمھارا منتظر ہے۔ اس کو مایوس مت کرنا۔ تمھیں یہاں سے نکلنا ہے، اور تم دیکھو گے کہ یہ بات تمھارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھے گا...''

میں پھر سے رونے لگا۔ الحسین نے میرے بازوؤں میں دم توڑ دیا۔ میں نے اسے بھینچ لیا اور قرآن پڑھتے ہوے اور زیادہ سختی سے بھینچے رہا۔ یہ اندازہ کرکے کہ الحسین فوت ہوگیا ہے، استاد نے اپنی توانا آواز میری آواز میں ملادی۔

31

بعض دفعہ کامیو کے کردار کی مانند میں یہ سوچتا تھا کہ ''اگر مجھے درخت کے تنے کی کھکھل میں بند کردیا جاتا... نہیں... رہنے کو مجبور کردیا جاتا... سو سال پرانے درخت میں، جس میں موحہ رہتا ہے... وہاں کرنے کو کوئی کام نہ ہوتا، سوائے اپنے سر کے اوپر گل آسمان کو دیکھنے کے۔ اور میں بتدریج اس کا عادی ہوجاتا... میں رقص دیکھتا جو چڑیاں...'' ''نہیں... یہ چڑیوں، بادلوں اور ابابیلوں * سے متعلق کوئی بات تھی... میں ہر شے کو گڈمڈ کیے دے رہا ہوں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں میرے لیے آسمان کا پھول صرف طبیعت ہی ہوسکتا ہے، میرے بچپن کا پرندہ۔ جبکہ کھوکھلا درخت سرد اور مرطوب پتھر کا بلاک ہے، اور ٹنوں ریت اور سیمنٹ ہے، جو آسمان کے ساری یادوں کو مٹانے کے لیے کافی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ ایمان سے رجوع کرنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ نماز کے بعد میں مستغرق رہنے لگا۔ الحسین کی موت نے مجھے بے حد مضطرب کردیا تھا۔ میں اسے خواب میں دیکھتا

کرتا: میں نے دیکھا کہ وہ ایک چمن زار میں ہے۔ وہ خوش تھا، متعدد بچے اور بیوی اس کے پہلو میں تھے۔ وہ سرخ سیب کھا رہا تھا۔ جب میں بیدار ہوا تو یہ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی۔ ایک مرا ہوا آدمی جو خوش ہے — صرف میں ہی تھا جو احساسِ جرم سے اس قدر مرا جا رہا تھا کہ الحسین سے معافی مانگنے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔ میں نے خود کو اپنے رہنما فرشتوں کے حوالے کر دیا جنھیں میں نے علی اور علیلی کے نام دے رکھے تھے۔ دعاؤں کی مدد سے میں نے انھیں پکارا اور ان سے گفتگو کی۔

''اگر تم یہاں موجود ہو تو صرف اس لیے کہ خدا مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جب تک تم یہاں ہو، مجھے معلوم رہے گا کہ میں ہارا نہیں ہوں۔'' وہ یہیں موجود تھے، خاموش۔ میں نے اللہ کو اور محمد کو پکارا۔ مجھے اللہ کے جتنے نام یاد تھے، سب دہرائے۔ میں ان کو دہراتا رہا اور الرحیم، الکریم، الحکیم اور العلی کا خصوصی ورد کرتا رہا۔ میں نے اپنی آواز نیچی رکھی۔ اشعر کو میرا بدبدانا پسند نہیں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی منصوبہ بنا رہا ہوں۔ نماز کے وسط میں مجھے روک کر وہ پوچھتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی آواز بلند کر لیتا تھا تاکہ وہ یہ سمجھ جائے کہ وہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ وہ بھی دعائیں پڑھنی شروع کر دیتا تھا، لیکن وہ چونکہ لفظوں سے بخوبی واقف نہیں تھا اس لیے اسے رکنا پڑتا تھا اور پھر وہ مدد مانگتا۔ استاد الغربی مداخلت کرتا اور اس کی قرأت درست کرواتا۔

ایک دن میں نماز میں گہرے استغراق کے عالم میں تھا کہ مفاضل نے میری کوٹھری کے دروازے پر ڈنڈے سے دستک دی۔ ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میری طرف ایک ڈبا اچھال دیا جس میں دوا کی گولیوں کے دو پتے تھے۔ اشعر کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ بولا، ''اس میں گولیوں کا ایک پتا درد کے لیے ہے۔ بھولنا مت! میں تمھاری زندگی بچا رہا ہوں۔''

''تم نے اسے دوائیں کیوں دی ہیں؟'' اس نے زود رنجی سے پوچھا۔

''کیونکہ اسے ان کی ضرورت ہے، احمق آدمی!''

''لیکن صرف میں نے تم سے دوائیں مانگی تھیں، بہت پہلے۔''

''تو کیا ہوا؟ اگر تم اسی طرح شکایت کرتے رہے تو یہ بھی تم سے چھین لوں گا۔''

''نہیں، ایسا نہ کرنا۔ میں تو بس پوچھ رہا تھا... بس یوں ہی۔''

اس دن میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں اشعر کا کوٹ کوٹ کر بھرتا بنا دیتا!

ایک روز محافظوں نے ساری کوٹھریاں کھول دیں اور ہمیں چند منٹ کی مہلت دی کہ کھلے ہوئے داخلی دروازے سے آنے والی مدھم سی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ کسی نامعلوم وجہ سے اشعر نے وقرین پر حملہ کر دیا اور اس پر گھونسوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''گشتی کے جنے، تم سوچتے ہو کہ تم یہاں سے یوں ہی چلے جاؤ گے۔ میں تمھیں مار ڈالوں گا، جان سے مار دوں گا۔''

ہم سب نے انھیں الگ کرنے کی کوشش کی۔ کوئی سوال پوچھے بغیر مفاضل نے اشعر کو اس کی کوٹھری میں بند کر دیا۔ دو مہینے تک، ہر جمعے کو مفاضل ہمیں آدھے گھنٹے کے مختصر وقفے کے لیے راہداری میں رہنے کی اجازت دیتا تھا لیکن اشعر کی کوٹھری نہیں کھولتا تھا۔ چنانچہ اس طرح کا کوئی اور واقعہ پھر نہیں ہوا۔

ایک دن اشعر نے مجھ سے انکساری سے کہا، ''سنو، کیا تم مجھے مکہ لے چلو گے؟ مجھے اتنے سارے گناہ دھونے ہیں، ان پر معافی مانگنی ہے۔ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے، ایسا ہی ہے نا؟ مہربانی کرو، مجھ پر یہ احسان کرنے سے انکار نہ کرنا۔ میں اتنا برا ہوں، اتنا جاہل اور حاسد۔''

''میں تمھیں جانتا ہوں۔ اگر ہم کبھی یہاں سے نکلے تو پہلا کام تم یہ کرو گے کہ سیدھے کسبیوں کے پاس جاؤ گے۔ اس لیے اس سیاہ غار کو اپنی متعفن جہالت سے بھرنا بند کر دو۔ مقدسات کی توہین نہ کرو!''

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو، درست ہے۔ تم یقیناً مجھے جانتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہے۔ جب تک میں رہائی پاؤں گا تو وہ جھریوں سے بھر چکی ہوگی۔ قسم سے، اگر میں یہاں سے زندہ بچ گیا — اور مجھے یقین ہے کہ رہائی ضرور ملے گی — تو میں اپنے گاؤں کی کسی نوعمر اور شیریں لڑکی سے شادی کر لوں گا۔''

''بڑا اعلیٰ خیال ہے، کسی معصوم لڑکی سے شادی کرو گے جو تمھاری سب سے چھوٹی اولاد سے بھی کم عمر ہوگی!''

''تو کیا ہوا؟ زندگی اسی کا نام ہے!''

''اشعر، میں تم سے مزید بات کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے تم سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔''

اشعر جیسے آدمی سے بات کرنا نہایت تھکانے والا کام تھا۔ اس کی مداخلت نے میری عبادت میں خلل ڈال دیا تھا، فرشتے میری پکار کا جواب نہیں دے رہے تھے، مجھے اب ان کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ذہنی اور جسمانی خستگی نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ ان ساری آزمائشوں نے میری قوتِ ارتکاز کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اپنے روحانی عالم میں پہنچنے میں مجھے زیادہ وقت ہونے لگی تھی۔ بات یہ نہ تھی کہ مجھ میں قوتِ ارادی کی کمی تھی... بلکہ میں ماندہ و خستہ ہو چکا تھا۔ آج تک بھی اس سخت آزمائش کی اثراتِ مابعد میں مبتلا ہوں۔ میرے لیے پڑھنا اور لکھنا مشکل کام ہے۔ میں اپنے ذہن کو مسلسل چند منٹ سے زیادہ مرتکز نہیں رکھ پاتا۔

مجھے اشعر پر یا کسی پر بھی ناراض ہونے سے خود کو روکنا تھا۔ اشعر کے خیالوں میں غرق رہنے کے بجائے میں نے دوسروں کی طرف رخ کیا۔ قطار کا پہلا شخص میرا باپ تھا۔ میں نے اسے ریشم کے جلابے میں دیکھا۔ عورتوں کی طرح معطر، پر مسرت، گلابی رخسار، چکنا چہرہ، مرعوب کن فربہی، پر وقار چال، ایسے شخص کی وضع میں ڈھلا ہوا جو سلطان کے آگے جھکنے کو سدا تیار رہے، نظریں جھکائے ہوئے اور زبان کسی شوخ جملے کا تیر بر وقت چھوڑنے کو تیار — اپنے آقا کے لیے مسکراتے ہوئے، بلکہ قہقہوں کے ساتھ۔

میں نے اسے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ میں ایسے شخص سے کیونکر ناراض ہو سکتا تھا جو دربار میں اور زندگی میں بھی، صرف مسخرہ ہو؟ ایک ایسا باپ جسے یہ بھی یاد نہیں کہ کبھی اس کا گھر بار بھی تھا! وہ کوئی اداس دل مسخرہ نہ تھا۔ اس کی کوئی بات غم انگیز نہ تھی۔ وہ کامل رضامندی سے بے فکری کی تصویر بن چکا تھا، دربار اور خانوادۂ سلطانی کے عشق میں ڈوبا ہوا مسخرہ تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور یوں گزر جانے دیا جیسے زندگی میں کوئی پرچھائیں گزر جائے۔ اس سے نفرت کرنا، رنجیدہ ہونا اور انتقام کی خواہش دل میں پالنا نسبتاً آسان کام تھا۔ لیکن وہ آسانی میرے لیے ایک دام بن سکتی تھی: اگر تم اپنے دل کو نفرت کے لیے کھول دو تو وہ مہلک زہر بن کر خون میں دوڑنے لگے

گی۔

اپنے باپ کے بعد میں نے مزید ہیولے دیکھے، ان لوگوں کے سائے جنھوں نے ہمیں اس پھوہڑ بغاوت میں گھسیٹا تھا۔ وہ سب کے سب نہیں مارے گئے تھے۔ اب بھی کچھ افسر زندہ تھے جنھوں نے اپنی کھالیں کمال چالاکی اور ہنرمندی سے بچالی تھیں۔ مجھے ان سے بھی نفرت نہ تھی۔ وہ نپٹ حرامزادے تھے۔ میرا کوئی دشمن نہ تھا۔ میں اپنی شدید ترین ترنگوں کے آگے بھی اب ہتھیار نہیں ڈالتا تھا۔ میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جن لوگوں نے مجھے اس قدر اذیتیں پہنچائی ہیں ان کا قیمہ بنانے پر اپنا وقت صرف کرنا کس قدر طاقت فرسا کام ہے۔ میں نے طے کیا تھا کہ ہرگز ان کی پروا نہ کروں گا۔ اور اس طرح میں نے ان سے نجات حاصل کرلی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ہاتھ آلودہ کیے بغیر میں نے انھیں قتل کردیا ہو، یا انتقاماً انھیں اتنی ہی شدید اذیت میں مبتلا کرنے کی خواہش کی آگ میں خود کو جلائے بغیر میں نے ان کا خاتمہ کرڈالا ہو۔

مجھے انتقام کے اس خیال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا تھا، اس کی اذیتوں سے اثرناپذیر رہنا تھا، کیونکہ انتقام میں موت کا تعفن ہوتا ہے اور یہ کسی مسئلے کو حل نہیں کرتا۔ میں نے جتنی بھی تلاش کرنے کی کوشش کی، کوئی بھی نہ ملا جس سے مجھے نفرت محسوس ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اپنی اس ذہنی کیفیت میں واپس آچکا تھا جو مجھے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی: میں اب پھر سے مردِ آزاد تھا۔

32

یہ مفروضہ اپنی جگہ کہ خبر لیک کرنے کا انتظام حکام نے سیاسی وجوہ سے خود کیا تھا، لیکن مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ محافظِ اعلیٰ، مفاضل، جو اپنے گروہ میں سب سے پرانا اور سب سے گھاگ آدمی تھا، آخر کس لیے اپنی اور اپنے ماتحتوں کی جان خطرے میں ڈال کر باہر کی دنیا میں پیغام لے جانے کو راضی ہو جاتا تھا۔ لالچ! اس نے وقرین کے لیے کام کرکے موٹی رقم کمائی تھی۔ ہمارے پاس کھونے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ہم موت کے دام میں تھے، سترہ سال سے زیادہ گزر چکے تھے، اور ہمارے نگران شروع سے وہی محافظ تھے۔ لوگ عادی ہو جاتے ہیں، ہم بھی ہو گئے تھے۔ صرف موت تھی جو آکر بقا کے

اس آہنگ کو توڑتی رہتی تھی۔ مفاضل نے اس سب کا فائدہ اٹھایا۔ اور ہم نے دقرین کے وسیلے سے ہر ممکن خبر باہر بھیجی۔ ہم نے چند احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی وسیلہ نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ بنیادی اہمیت اس بات کی تھی کہ بعض دوائیں ہمیں ملتی رہیں۔ اور بہر حال اس کی بھی کوئی راہ نہ تھی کہ ہم اپنے مستقبل کے لیے کچھ کر سکیں۔ مستقبل از خود سامنے آ گیا تھا۔ بعض کے لیے وہ موت کے ایک طویل کرب کے روپ میں تھا، بعض کے لیے ایک ایسے بے معنی صفر میں منجمد زندگی جیسا تھا جس میں کوئی دوائی نگل لینا ہی زندگی کا سب سے اہم واقعہ تھا۔ ہم ایک اندھے مقدر پر تکیہ کیے ہوئے تھے کہ شاید اس بھٹ میں کوئی کرشمہ ہو جائے جہاں ہماری تعداد روز بروز گھٹ رہی تھی۔

ہمارے پاس اب کوئی کیلنڈر نہیں تھا۔ انتباہ کا کوئی اشارہ دیے بغیر ہماری بولتی گھڑی نے اپنی روح کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ عبدالکریم، جسے ہم کریم کہتے تھے، خستگی اور کم غذائیت کے سبب خاموشی سے مر گیا تھا۔ اس کی بھوک مر گئی تھی۔ یہ ہمارے لیے بدشگونی، ایک برے انجام کی ابتدا کا اشارہ تھا۔ اپنی موت سے کافی پہلے اس نے مجھ سے یہ ذمے داری لینے کو کہا تھا جو میں نے قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ جس طرح حساب رکھتا تھا میں اتنی اچھی طرح سے یہ کام انجام نہیں دے پا رہا تھا۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ بعض دفعہ میں دنوں کو باہم گڈمڈ کر دیتا۔ نمبر چودہ، فلاح، جو نان کوم تھا، انھیں درست کرنے میں میری مدد کرتا تھا۔ فلاح قید کے ابتدائی دنوں میں ہی بیمار پڑ گیا تھا، اور بعد میں بھی اس کی صحت خراب ہی رہی۔ ہم نے کام آپس میں بانٹ لیا تھا۔ وہ ساعتوں کا شمار رکھتا تھا اور میں دنوں اور مہینوں کا۔ فلاح خاموش مزاج تھا، پستہ قد اور دبلا پتلا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک عورت نے اسے زہر دے دیا تھا۔

''میں 'مواکل'* ہوں۔ اس نے مجھے شہد کا کیک کھلایا تھا جس میں کسی عامل نے بہت ہی لطیف قسم کا زہر ملا دیا تھا: یہ زہر مارتا نہیں ہے، البتہ ہر قسم کی بیماریاں لاتا ہے۔''

''کیا تمھیں یقین ہے کہ تم قید کی وجہ سے بیمار نہیں ہوئے؟''

''یہاں بیماریاں قدرتی طور پر آتی ہیں۔ لیکن میرے پیشاب میں خون آتا ہے، بعض اوقات مواد کے ساتھ۔ اور اب انیس برس گزر چکے ہیں کہ میرا جنسی عضو اسی حالت میں ہے۔ تو اس کی وضاحت تم اور کس طرح کرو گے؟''

میں فلاح کو ایک سائنسی تجربے کی طرح دیکھنے لگا تھا: ہر طرف سے حملے ہونے کے باوجود اس

کا بدن مقابلہ کیے جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے دواؤں کے لیے کہا۔

''کس قسم کی؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے ہر جگہ تکلیف ہوتی ہے۔''

وقرین نے اس کی کوٹھری میں دوائیں کھسکا دیں۔ اس نے ان کو براہِ راست نگل لیا۔ جب ہم قنیطرہ میں تھے، اور جیل کے ہسپتال میں ہماری رسائی تھی، وہ ویلیم مانگا کرتا تھا، اور اتنی مقدار میں کھاتا تھا کہ مجھے لگنے لگا کہ وہ خودکشی کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ تو پہلے ہی اس عورت کے جادو کے زیرِ اثر تھا اور ویلیم کے ذریعے اس کا مقابلہ کرتا تھا۔ تا زمامرت میں وہ اپنی سکون بخش دواؤں سے محروم کر دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ کنارہ کر لے گا، لیکن اس نے ایڈجسٹ کر لیا، یا اگر اسے تکلیف رہی ہوگی تو اس نے بتایا نہیں۔ وہ اپنی قید کو بھی اسی ''جادو'' کی مہم کا حصہ سمجھتا تھا۔

اس نے مجھے بتایا، ''اس عورت نے قسم کھائی تھی کہ مجھ سے بدلہ لے کر رہے گی۔ وہ کامیاب ہوئی۔ خنیفرہ کی عورتوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔ وہ کمین ترین ہوتی ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ تم اس پر یقین کرو گے؟ ایک کسبی نے شوہر بنانے کے لیے میرا انتخاب کیا تھا! میں نے غلطی یہ کی تھی کہ اس کے پاس بہت زیادہ جاتا تھا، ہر بار کی چھٹیوں میں۔ میرا ایک ہی معمول تھا۔ میں شام کو اس کے پاس جلدی پہنچ جاتا۔ وہ میرے ساتھ تنہا ہوتی، میرے لیے چائے کا اہتمام کرتی۔ پھر وِسکی کی بوتل نکالتی اور ہم پیتے۔ رات کے کھانے سے پہلے ہم بستری کرتے۔ جب میں کھانا شروع کرتا، وہ خود غائب ہو جاتی۔ اس بات پر میں نے کوئی دھیان نہیں دیا... رات میں بھی ہم لوگ کئی بار پیار کرتے۔ جب میں اس کو ادا کرنے کے لیے پیسے نکالتا تو اسے غصہ آ جاتا اور مجھے ٹھوکریں مارتی۔ ایک دن کہنے لگی کہ اس نے دوسرے مردوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے اور یہ کہ میں ہی اب اس کا مرد ہوں، اس کا انتخاب ہوں؛ اور یہ کہ اس نے وہ بڑی عمارت چھوڑ دی ہے جہاں وہ دوسری طوائفوں کے ساتھ رہتی تھی اور نسبتاً چھوٹی جگہ منتقل ہو گئی ہے۔ میرے لیے کسی طوائف سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا! کیا تم تصور کر سکتے ہو؟ کتنا شرمناک، ذلت آمیز ہے یہ سب! مجھے اس کے بعد پھر اس کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن یہ خیال ذہن میں آیا ہی نہیں — ایسی قسمت کہاں تھی! خیر، میں مصیبت میں گھر چکا تھا، وہ مجھے ایسے کھانے کھلاتی رہی جن سے میں بیمار پڑ گیا۔ میں الحاجب میں ایک عامل کے پاس گیا،

اسی نے مجھے یہ سب بتایا۔ افاقے کے لیے اس عامل کے علاوہ میں کئی ڈاکٹروں کے پاس بھی جاتا رہا، اور وہ ایک دوسرے کے مجوزہ نسخوں کا توڑ کرتے رہے۔ صرف کوئی عامل ہی کسی دوسرے عامل کے کیے ہوئے جادو کا توڑ کرسکتا ہے۔ لیکن میرے پاس وقت نہ رہا۔ ہم اہرمیمو سے فوجی مشقوں کے لیے نکلے، اور یہاں پہنچ گئے۔"

"ذرا ٹھہرو۔ یعنی تمھاری مراد، تختہ پلٹنے کی کوشش سے ہے؟"

"کون سا تختہ پلٹ؟ ہم لوگ علی الصباح فوجی مشقوں کے لیے بوزنیقہ جانے کو نکلے تھے...."

"لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو ہم یہاں کیوں آئے ہیں، ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، ہم سب پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

"فلاح، تم مذاق کر رہے ہو!"

"میں؟ بالکل نہیں۔ ایک کام جو میں اب بالکل نہیں کرسکتا وہ ہنسنا اور لطیفے گڑھنا ہے۔ جب اس نے مجھے وہ چیز کھلائی، میں ہنسنے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ خیر، کیا اس کے بعد تم نے مجھے کبھی ہنستے ہوئے دیکھا ہے؟"

"نہیں، یہ سچ ہے۔ بہرحال، اس بھٹ میں کون ہنسنے کی خواہش کرسکتا ہے؟"

مجھے اندازہ ہوگیا کہ فلاح شدید بیمار ہے۔ آتشک انسان کو فاترالعقل بنا دیتی ہے۔ اس کا حافظہ تو برقرار تھا لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وقت کا حساب رکھنے کی اس کی صلاحیت پر سے میرا اعتبار فوراً جاتا رہا، اور ساعتیں بھی میں نے خود ہی گننی شروع کر دیں۔ اس کی دیوانگی عیاں نہیں تھی۔ وہ مربوط باتیں کرتا تھا، لیکن اچانک کوئی ایسی بات کہہ دیتا جو ناقابلِ فہم ہوتی تھی۔

"مجھے ماہرہ اچھی طرح یاد ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے۔ اس کا سینہ بہت بھاری تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت سیاہ تھیں، اور جب وہ ہنستی تھی تو اس کے رخساروں پر گڈھے پڑ جاتے تھے۔ اور پھر گھوڑا مینار پر چڑھ گیا۔ اس نے نیچے گزرنے والے لوگوں پر پیشاب کر دیا۔ ہاں، جنرل نے انجیر کے درخت کو سزا دی۔ اس نے اس کی ساری انجیریں توڑ لیں اور ماہرہ کو دے دیں۔ یہ بتاتا چلوں کہ یہ جنرل اس کی پہلی بیٹی کا باپ ہے، اسی بیٹی کا جس نے میرے لیے اس وقت دروازہ کھولا تھا جب میں فوجی مشق پر جا رہا تھا۔ مجھے واضح طور پر وہ صبح یاد ہے جب ہمسایہ عورت کے کتے نے الحبوس

والے نادر کی پنڈلی میں کاٹ لیا تھا۔ وہ رو رہا تھا، میں ہنس رہا تھا۔ ماہرہ نے مجھے کھانے کو کچھ دیا، اور پینے کے لیے سگریٹ میں بھی ملا دیا۔ میں نے انڈیا یا چائنا کی سوکھی جڑی بوٹیاں اس سگریٹ میں پی ہوں گی۔ وہ بہت سریع الاثر تھیں۔ مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ جادو میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ سنو، یہ مت مان لینا کہ میں فاترالعقل ہو گیا ہوں۔ میں بیمار ہوں۔ دنیا کی ہر بیماری مجھے لگی ہے، لیکن فوجی مشقوں کے خاتمے پر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ یہاں، ہم جو کچھ کرتے ہیں، اچھا ہے۔ ہم سردی سے، گرمی سے، بچھوؤں اور کاکروچوں سے مزاحمت کرنا سیکھ رہے ہیں۔ لیکن اگر جنرل مجھے کوئی دوا دے گا تو اچھا ہی ہوگا۔ لگتا ہے کہ وہ جاپانی دوربین سے ہم پر نظر رکھتا ہے۔ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ ہر ایک کو گریڈ بھی دیتا ہے۔ میں... میں کبھی اچھے گریڈ حاصل نہیں کر سکوں گا کیونکہ ماہرہ نے اس کے ساتھ سونے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ انتقام لے گا۔ جنرل اہم آدمی ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کوئی اسے 'نہ' نہیں کہہ سکتا، سوائے ماہرہ کے۔ میں اس کے جذبے کی قدر کرتا ہوں، اس کے باوجود کہ اس نے مجھے نقصان پہنچایا۔ جب ہم باہر نکلیں گے تو میں اس سے ملنے جاؤں گا اور دو باتیں اس سے کہوں گا: پہلی یہ کہ تم بہادر ہو، جنرل کے ساتھ نہیں سوئیں۔ دوسری یہ کہ تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا، درست نہیں تھا! مجھے یقین ہے اسے افسوس ہوگا، کیونکہ میرا جنسی عضو تباہ ہو چکا ہے۔ اب یہ کسی کے کسی کام کا نہیں رہا۔ جب پیشاب کرتا ہوں تو اس میں بھیانک درد ہوتا ہے۔ میں یہ سب اس کو بتاؤں گا۔ لیکن تم... تم جو اتنی ساری باتیں جانتے ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ یہ فوجی مشقیں کب ختم ہوں گی؟"

"جلد ہی، فلاح، بہت جلد۔"

"کیا تم میرے ساتھ خنیفرہ چلو گے، حسین و جمیل ماہرہ سے ملنے؟"

"یقیناً۔ میں تمھارے ساتھ ضرور چلوں گا۔ میں اس سے کہوں گا کہ اس نے جو کچھ کیا، ٹھیک نہیں کیا۔"

"تم... تم میرے دوست ہو۔ بتاؤ تو، کیا وقت ہوا ہے؟"

"لیکن ساعت کے انچارج تو تم ہو!"

"اوہ، میں بھول گیا تھا! لیکن تمھاری مراد کس ساعت سے ہے؟"

''وہی، اس جیل کی۔''

''آہ، تمھاری مراد ہماری بیرکوں کی گھڑی سے ہے! وہ تو طویل عرصے سے خراب پڑی ہے۔ مجھے اسے ٹھیک کرنا ہے۔ جب سویلین زندگی میں تھا تو میں گھڑی ساز تھا۔ میں فوج میں جنرلوں کی کلائی گھڑیاں درست کرنے کے لیے بھرتی ہوا تھا۔ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ جنرل ہمیشہ لیٹ ہو جاتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ جو گھڑیاں وہ لوگ پہنتے ہیں ان میں بہت سا سونا لگا ہوتا ہے۔ سونے کا وقت کے ساتھ اچھا تال میل نہیں ہوتا۔ سادہ دھات سے بنی گھڑی بہتر ہوتی ہے —— درست وقت کی گارنٹی دیتی ہے۔ یہ بات مجھے میرے باپ نے بتائی تھی، طویل عرصہ پہلے۔ فوج میں انھوں نے مجھے عام ڈیوٹی پر لگا دیا، جبکہ میں وقت کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انھیں بتانے کی کوشش کی تھی لیکن انھوں نے میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ تو تمھیں کیا لگتا ہے، ماہرہ سے شادی نہ کر کے میں نے ٹھیک کیا؟''

''ہاں، فلاح۔ تمھارا فیصلہ درست تھا۔''

''جب تم فوجی مشقوں پر جاؤ تو کوئی عورت پیچھے نہ چھوڑنا، خصوصاً ماہرہ جیسی عورت۔ ورنہ مجروح ہو جاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی مجروح ہوا ہوں۔ مجھے یا تو پیٹ میں گولی لگی ہے یا پھر پوشیدہ عضو پر۔''

''ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔ تمھیں معلوم ہے وہ حقیقی گولیاں تھیں۔''

''اوہ، یقیناً مجھے وہ سب یاد ہے۔ ایک دن پہلے کمانڈنٹ نے ہمیں ہنس کر بتایا تھا، ''زندہ بارود کے ساتھ فوجی مشقیں!'' جب اس نے یہ بات دوبارہ کہی تو ہم سب ہنسنے لگے تھے۔ لیکن کیا تمھیں وہ فرانسیسی ڈاکٹر یاد ہے جو افسروں کے جمگھٹے کے پاس گیا اور ان سے مذاق میں بولا تھا: تم لوگ کیا منصوبہ بنا رہے ہو، حکومت کا تختہ پلٹنے کا؟ اور کپتان نے اس سے کہا تھا: نہیں، اہم فوجی مشقوں کا۔''

''ہاں، مجھے بخوبی یاد ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں تنہا شخص نہیں ہوں جو تختہ پلٹنے کا ذکر کرتا ہے۔''

''ہاں، لیکن ہم نے کسی کا تختہ نہیں پلٹا۔ اس کا ہمارے فوطوں میں بوتا نہیں تھا۔ فوطوں کا موضوع چھڑ گیا تو بتا دوں کہ میری تو ایسی تیسی ہو چکی ہے۔ میرے اب ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ماہرہ نے انھیں کاٹ کھایا، اس نے میری ساری سانسوں کو، میری روح، میری زندگی کو نگل لیا۔''

''جب ہم یہاں سے نکلیں گے اور جب فوجی مشقیں ختم ہو جائیں گی تو ہم حاجی براہیم کے پاس چلیں گے، جو ماہر ترین فقیہہ ہیں۔ ان سے کہیں گے کہ وہ جادو کے اثرات کا توڑ کریں۔ تم دیکھنا فلاح، ہر بات ماہرہ کے خلاف الٹ جائے گی۔ اس بار پاگل ہونے کا نمبر اس کا ہے۔''

''ہاں، میرے دوست، ہم ماہرہ کو لکڑ بگھے کا بھیجا کھلائیں گے۔ میں ایک بوڑھے صحراوی کو جانتا ہوں جو مراکش میں یہ فروخت کرتا ہے۔ اور پھر جب میں ماہرہ کو کسوں گا تو وہ زندگی بھر کے لیے بیمار پڑ جائے گی۔''

''لیکن اس کے بعد وہ جس جس کو بھی کسے گی، سب کو بیمار کر دے گی، اور یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ تم ایسا ہرگز نہ کرنا۔''

''تم درست کہتے ہو۔ میں فی الوقت مچھلی کھانا چاہتا ہوں!''

فلاح نے وہ رات مچھلی کے لیے واویلا مچاتے گزاری۔ وہ عربی میں، اور پھر فرانسیسی میں گالیاں دیتا رہا۔ اس کے پاس ایسے الفاظ وافر تعداد میں تھے جو سیکس اور مذہب کا ملغوبہ بنا دیتے ہیں۔

اسی رات میں نے چیخنے والے الو کا نوحہ سنا اور سوچا، ''فلاح کی ساعتِ نجات آ پہنچی۔''

نہیں، یہ عبداللہ کی باری تھی — جو میری ہی طرح لیفٹیننٹ اور معلم تھا — وہ کئی ہفتے تک اسہال کا شکار رہنے کے بعد چل بسا۔ اس نے ہمیں اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی زندگی اس کے بدن سے خارج ہوتی رہی۔ وہ اسی میں بیٹھتا تھا، اسی میں سوتا تھا۔ تعفن اب ہمیں ان بیماریوں سے آگاہ نہیں کرتا تھا جو ہمارے بیچ مستقل ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔

موت کی اپنی بو ہوتی ہے۔ کھارے پانی، سرکہ اور مواد کا مرکب۔ تیز اور کسیلی۔ یہ مخصوص بو ہمیشہ چیختے الو کی ہمجولی بن کر آتی تھی۔ ہمیں اس کی تصدیق کی ضرورت نہیں پڑتی تھی — ہم اسے جبلی طور پر پہچان لیتے تھے۔ صبح کو جب محافظ کافی لے کر آتے، ہم ان سے کہتے تھے، ''شاید کوئی مر گیا ہے، بہتر ہوگا کہ چیک کر لو۔''

فلاح کا پیشاب بند ہو گیا تھا۔ وہ روح فرسا کرب سے گزر کر مرا۔ اس نے بات کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ بڑبڑا رہا تھا، ہکلا رہا تھا، چیخ رہا تھا، اور دروازے پر لاتیں مار رہا تھا۔ اور پھر ایک طویل رات

کے گزرنے کے بعد... سناٹا چھا گیا۔ حیرت ہے کہ چیختے الو نے اس کی موت کی پیشگوئی نہیں کی۔ اس کی موت پر کوئی نوحہ کناں نہ تھا۔

33

میں اپنے لاابالی پن کے زمانے میں اپنے بارے میں بہت اعلیٰ رائے رکھتا تھا۔ مجھے ہر بات کی جلدی ہوتی تھی۔ زندگی خوبصورتی کے ساتھ واضح نظر آتی تھی۔ اور خوش کن بھی۔

لیکن میں غلط ثابت ہوا۔ اپنے بارے میں اعلیٰ رائے صرف دوسروں کی قدردانی سے طے ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے آپ کو کئی صحرا پار کرنے ہوتے ہیں، بہت سی راتیں کاٹنی پڑتی ہیں۔ میں نے اپنی سخت آزمائش کو بلاشکایت برداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے ہر دو نمازوں کے درمیانی وقفے کی خاموشی میں اپنے سوا کسی کی ملامت نہیں کی۔ میں نے خدا سے دعائیں مانگیں، یہ سوچے بغیر کہ نتیجہ کیا نکلے گا، یا یہ دعائیں کیا رنگ لائیں گی۔ میں نے دعاؤں سے کوئی توقع نہیں رکھی۔ ان دعاؤں کے طفیل ایک ایسے شخص کی انکساری کے ساتھ جو کرب، بھوک اور ہیجان کی غلامی سے بچنے کے لیے اپنے جسم کو بتدریج چھوڑتا جا رہا ہو، میں اپنے وجود کے بہترین حصے تک پہنچ رہا تھا۔ میرے اعمال سراسر ایسا معاوضہ تھے جو بلا طلب ملا تھا۔ میں ان لوگوں جیسا نہ تھا جو خدا اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ دانستہ حساب طلبی کا رشتہ باندھ لیتے ہیں۔ خدا پر ایمان، اس کے رحم و کرم کی ستائش، اس کے ناموں کا ورد، اس کی روحانیت کا گن گان —— یہ سب میری فطری ضرورتیں تھیں جنھیں میں پورا کرتا تھا اور بدلے میں کوئی توقع نہیں رکھتا تھا، قطعاً نہیں۔ میں ترکِ دنیا اور ضبطِ نفس کی منزل پر پہنچ گیا تھا جس سے مجھے گہرا سکون حاصل ہوتا تھا۔ میں، جو پہلے یہ مانتا تھا کہ آدمی کبھی نہیں بدلتا، خود ایک الگ شخص میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں اپنی ہی ایک مختلف ذات کے روبرو تھا، سطحی زندگی کی تمام بیڑیوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ میری ضروریات صفر تھیں، مجھے کوئی سامانِ عیش نہیں چاہیے تھا۔ میں عریاں تھا، اور یہی میری جیت تھی۔

الحسین کی موت کے بعد، جراحتیں دینے والی تمام بھدی باتوں کے بعد جو ہم نے ایک

دوسرے سے کہی تھیں، مجھے یہ ادراک ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی باگ پھر سے اپنے ہاتھ میں لینی ہے اور اعلیٰ تفکر کے بے پایاں راستے پر لوٹ آنا ہے، سب سے پر اسرار اور مخفی ترین ذات کو پکارنا ہے، جس کا یقیناً ایک ایسی کائنات میں مسکن ہے جس کی چابیاں اور نشانیاں پہلے ہی میرے قبضے میں ہیں۔

سنگِ اسود، قلبِ کائنات، رحمتِ خداوندی کی یاد، ایمان کا شکوہ اور کامل بے غرضی: یہ وہ نشانیاں تھیں جو میری رہنمائی کرتی تھیں۔ اضافہ کرتا چلوں، بیچ بیچ میں میرے رہنما فرشتوں کی آمد کا، طبیعت اور افسوس چیخنے والے الو کا بھی، جو ہماری یقینی بدبختی کا اعلان کرتا تھا۔

میں خاموشی سے نمازیں پڑھتا اور موقعے کی مناسبت سے ہم آہنگ باطنی موسیقی کے دوش پر خود کو بہنے دیتا۔ دوسرے لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں، میں اب بالکل نہ سنتا تھا۔ میری پیٹھ اور ریڑھ کا درد اب بھی اپنے ہل سے لکیریں کھودتا رہتا تھا۔ میں چونکہ اپنی قوتِ ارتکاز کھوتا جا رہا تھا اس لیے وہ دوائیں لے لیتا تھا جو مفاضل اکثر مجھے دیتا تھا۔ نمازوں اور متصوفانہ شاعری کے طفیل میں اپنے درد کی شدت کو کم کرنے اور بعض مرتبہ جسم کو ترک کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا تھا، اس جسم کو جو مضروب اور مسخ ہو چکا تھا لیکن اب بھی سرکش تھا۔

بالآخر، میرا جسم میرے قابو سے باہر ہو گیا۔ وہ اب مجھے چھوڑ رہا تھا۔ چنانچہ میں اس سے چمٹے رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بلی کی طرح گٹھری بن کر سونے لگا، زمین سے چپک جاتا تا کہ میرا جسم مجھے کامل طور پر نہ چھوڑ سکے۔ میں نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ میں اب کسی شے کو تصور میں نہ لاتا تھا۔ میں خالی ہو چکا تھا۔ میں ایک عجیب الخلقت شے بن چکا تھا، اس بھٹ کے اندر جس نے اہر میمو کے میرے بائیس ساتھیوں میں سے پندرہ کو نگل لیا تھا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ میرا دماغ بس اب رخصت ہونے کو تھا۔

تقریباً اٹھارہ برس بیت چکے تھے جب میں نے آئینے میں خود کو آخری بار دیکھا تھا۔ میں اب کیسا نظر آتا ہوں گا؟ جب میں نے بدقت اپنے بازو کو اونچا اٹھا لیا تو ہاتھ کو اپنے چہرے پر آہستگی سے پھیرا۔ دیکھنے کے لیے میں نے نابینا شخص کی طرح اپنی انگلیوں کو استعمال کیا تھا۔ میرے رخسار پچک گئے تھے، ان کی ہڈیاں سخت تھیں اور ابھر آئی تھیں اور میری آنکھیں اپنے حلقوں میں گہری دھنس چکی تھیں۔ میں بدہیئت مریل آدمی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

کسی چیز کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے یا محض اپنا عکس پہچاننے کے لیے خود کو آئینے میں دیکھنے کی خواہش سے، یا یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ واقعی یہ میں ہی ہوں — اپنی اس گمشدہ اور بسری ہوئی عادت سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ خود کو دیکھنے سے کیا فائدہ؟ دوسروں سے محبت کرنے کے لیے، تمھارے دل میں اپنی ذات کے لیے تھوڑی سی تو محبت ہو! لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے — ایسا کوئی نہ تھا جس سے میں محبت یا نفرت کرتا۔

ایک دن راہداری کے سنکرے شافٹ کی روشنی کے طفیل استاد الغربی نے مجھ سے پوچھا کہ آیا اس کا چہرہ اب بھی اپنے صحیح مقام پر موجود ہے۔ میری الجھن کا اندازہ کر کے اس نے جلدی سے اضافہ کیا، ''میرا مطلب ہے کیا میرا چہرہ پیچھے کی جانب ہو چکا ہے؟ کیا میرا نرخرہ میری گردن کی پشت پر آ گیا ہے؟''

''اپنے چہرے کو ہاتھ سے محسوس کرو، اور خود دیکھ لو۔''

''نہیں، میں محسوس نہیں کر سکتا، میرے ہاتھ سُن ہو چکے ہیں۔''

وہ قوتِ لامسہ کھو چکا تھا لیکن درد اب بھی محسوس کرتا تھا۔

''میں اندرونی تکلیف میں مبتلا ہوں،'' اس نے بتایا۔ ''میرا دل اور سینہ درد کے شکنجے میں جکڑے رہتے ہیں۔ میں شک میں بھی مبتلا ہونے لگا ہوں۔ میں کلامِ پاک پڑھتا ہوں۔ اللہ کو اور اپنے پیغمبر کو پکارتا ہوں، ان پر خدا کی رحمت ہو، اور پھر خود کو وہیں کھڑا پاتا ہوں جہاں سے چلا تھا — تنہا اور بے سہارا۔ میں کتابِ مقدس کے سمندر میں غوطے لگاتا ہوں، ایک بے کراں سمندر میں ہچکولے کھاتا ہوں اور لفظوں کی لہروں میں لگ بھگ ڈوب جاتا ہوں جو اب مختلف سمتوں میں رواں رہتی ہیں۔ میرے اعصاب دُکھتے ہیں، میرا سر درد سے پھٹتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میں یہ سب تمھیں آج بتا رہا ہوں کیونکہ مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ میں سورج یا روشنی کو دیکھے بغیر ہی مر جاؤں گا۔ شاید، دوسری دنیا میں، جہنم اس سے کم بے رحم ہو گا جس میں انھوں نے ہمیں یہاں مبتلا کر رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے خدا مجھے معاف کر دے گا۔ خدا ہی عدل ہے۔ خدا ہی خیر ہے۔ خدا ہی کرم ہے۔ خدا ہی رحم ہے۔ میری تمنا ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اور وہی ہے جس کے پاس تمھیں لوٹ کر جانا ہے، وَانا الیہ راجعون۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، پھر بھی میں نے کوئی زندگی نہیں جی۔ یہی میرا مقدور

ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری گھڑی آن پہنچی۔ برائے مہربانی، میرے اوپر انھیں چونا چھڑکنے نہ دینا! میں اس کے لیے تم پر بھروسا کر رہا ہوں کہ اپنے خدا کے سامنے میں صاف ستھرا ہو کر جاؤں، سفید کفن میں۔ اور یہ کہ میرے جسد پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔ اب میں تلاوت کروں گا تا کہ میرے سینے کا یہ درد مٹ جائے — یہ لوہے کے ایسے سریے کی مانند ہے جو ٹن بھر وزنی ہو۔ یہاں ہے، میری پسلیوں کے قفس کے اوپر۔''

وہ اس حالت میں داخل ہو گیا جسے ہم 'سکرات الموت' کہتے ہیں، موت کے وقت کا کیف — بلکہ نشہ۔ یہ نشہ نہایت پاکیزہ لوگوں کا وصف بنتا ہے۔

اس کا دل چند لمحوں کے بعد ہی بیٹھ گیا۔ راہداری میں ہم سب ساکت کھڑے تھے۔ محافظ ہلے تک نہیں۔ استاد گر پڑا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ اسے اتنا وقت مل گیا کہ اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی جانب اٹھائے اور اپنے ایمان کا اقرار کرے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ وہ الفاظ دوہرائے جو ہر مسلمان یہ دنیا چھوڑتے وقت ادا کرتا ہے۔

مفاضل نے ہمیں استاد الغربی کو باضابطہ دفنانے کی اجازت دے دی۔ ہم میں سے اب زیادہ لوگ زندہ نہیں بچے تھے۔ ایک محافظ میرے پاس سفید چادر لے آیا، کفن بطور استعمال کرنے کے لیے۔ یہ واحد تدفین تھی جس کی مناسب رسومات ادا کی گئیں۔ اس دن آسمان سرمئی تھا جس کی روشنی مدھم تھی۔ قبرستان میں قرآن کی تلاوت کرتے وقت ہم تھوڑی دیر تک رکے رہے۔ ایک محافظ نے اپنا ایک آنسو خشک کیا۔ ہم سب جذباتی ہو رہے تھے۔ ہمیں استاد کی آواز یاد آ رہی تھی۔ میں نے اس کے بوسیدہ کپڑے قبر کے پاس ڈال دیے۔ جیسے ہی ہم بھٹ میں واپس جانے کے لیے مڑے، وقرین نے مجھے بائیں جانب متوجہ کیا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس سے مجھے کوئی جھٹکا نہیں لگا لیکن دوسرے لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا: صحن میں سات قبریں کھدی ہوئی تھیں۔ ہم سات ہی بچے تھے۔ یہ ہماری قبریں تھیں۔ مخالف سمت میں بھی ایک درجن کھلی قبریں تھیں۔ یہ جیل کے دوسرے بلاک کے قیدیوں کی رہی ہوں گی۔

اس شام ساری گفتگو اسی قبیح دریافت پر مرکوز رہی۔ وقرین، جو سب سے زیادہ خوفزدہ تھا، یہی کہتا رہا کہ وہ لڑے گا، اور یہ کہ سزائے موت کے مقام پر اسے جدوجہد کے بغیر ہرگز نہ لے جایا جا سکے

گا۔ ہم سب یہی سوچ رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ قبریں ہمارے لیے نہیں ہیں۔ یہ بس ایک احساس تھا جو میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن میں دوسروں کو قائل کس طرح کر سکتا تھا؟ میں ایسی کوشش کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"ایک گولی سر میں پشت کی جانب سے۔"

وقرین کو یہی رٹ لگی تھی۔ اس نے ان لفظوں کو ہر ممکن لہجے اور لحن میں دوہرایا۔ فرانسیسی میں دوہرایا، عربی میں اور تمازائت زبان میں بھی۔

"A bulllet in the heeeaaad"

"*Kartassa felkfa.*"

"*Tadouat aguenso takoja'at.*"

"kartassa in the *takoja'at*."

کراسہ، گولی، گدی، کراسہ، گدی، گولی، کراسہ، گدی، گدی، کراسہ...

یہ الفاظ میرے بھیجے کو اڑا رہے تھے۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے، ذہنی دباؤ میں تھے اور استاد کی موت سے بری طرح مضطرب بھی۔ میں نے خود کو پرسکون کیا اور جیسے تیسے وقرین کی آواز کو ان سنا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اگلی صبح میں نے اپنی طبیعت کو رکے انداز میں گاتے ہوئے سنا۔ وہ مجھے صحن کی سرگرمیوں کی اطلاع دے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مفاضل آگیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ رات کیسی گزری۔ میں حیرت زدہ تھا! کسی بھی محافظ نے ہمارے دنوں اور راتوں کے بارے میں کبھی کوئی فکر نہیں جتائی تھی۔ اس نے وقرین سے بھی یہی سوال کیا۔ وقرین کے بجائے اشعر نے جواب دیا۔

"اس نے ہمیں رات بھر جگائے رکھا۔ وہ ساری رات چیختا رہا۔ اب اسے ہرگز نہ جگانا—وہ پھر سے شروع ہو جائے گا! سر کی پشت میں گولی، کراسہ..."

مفاضل نے اسے خاموش رہنے کو کہا، پھر وقرین کا دروازہ کھولا اور دیکھا کہ قیدی کوٹھری کے آخری سرے پر گٹھری بنا پڑا ہے۔ دہشت زدہ وقرین محافظ کی داہنی ٹانگ سے لپٹ گیا۔

"مجھے بتاؤ کہ تم ایسا نہیں کرو گے؟ تم نہیں، تم مجھے نہیں مارو گے، ٹھیک ہے نا؟ میرے دوست،

میرے عم زاد! وہ ہمارے لیے نہیں ہیں، وہ قبریں۔ تم میرے سر میں پیچھے سے گولی نہیں مارو گے۔ نہیں، تم نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے تقریباً اٹھارہ سال سے واقف ہیں۔ اپنے پیچھے کھڑے آدمی سے واپس جانے کو کہو، اسے بتاؤ کہ یہاں تم انچارج ہو، پلیز اسے بھگا دو۔ وہ مجھے اپنی آٹومیٹک پستول سے دھمکا رہا ہے! میں نے اس آدمی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا، یہ کہاں سے آ گیا؟ کس نے اسے بھیجا ہے؟ یہ ہمارا قاتل ہے — اس نے وردی کیوں نہیں پہن رکھی؟ کیا یہ سیاسی پولیس کا آدمی ہے؟ کچھ کرو، مفاضل۔ یہ لوگ خطرناک ہیں! اگر یہ ہمیں مارے گا تو تمھیں بھی مار ڈالے گا، کیونکہ تم بہت کچھ جانتے ہو!''

''خاموش ہو جاؤ، وقرین!'' مفاضل چلایا۔ ''میں تنہا ہوں۔ میرے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ تم ہیجان میں ہو! کوئی تمھیں مارنے نہیں آیا۔ یہ میں ہوں، تمھارا دوست۔ اور میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم آج کیا کھانا پسند کرو گے۔ مچھلی کھاؤ گے، یا گوشت؟''

''آہ، تو میرا اندازہ ٹھیک تھا! یہ سزا یافتہ کی آخری خوراک ہے... بھرے پیٹ مرنا ہے، تندرست ہو کر۔ بس اتنا ہی — عالم بالا میں بھیجنے سے پہلے وہ ہم پر دھیان دے رہے ہیں۔ میری بات سنو، لوگو۔ میں پاگل نہیں ہوں! یہ بات نارمل نہیں ہے کہ وہ ہمارے ابدی مینو کو بدل ڈالیں اور ہم سے اتنے اخلاق سے پوچھیں کہ ہم کیا کھانا چاہتے ہیں! سنو، دانا لوگو، تمھارا کیا خیال ہے؟''

میں نے جواب دیا، ''میرے خیال میں بھی یہ بات نارمل نہیں۔ اگر وہ ہماری غذا کو بہتر کر رہے ہیں تو اس لیے کہ ان کا کوئی اور منصوبہ ہے۔ لیکن یہ کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے کوئی اندازہ نہیں۔''

''آہ، میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ بہر حال، یہ پر اسرار ہے: تازہ کھدی ہوئی قبریں، ہمارے دوست استاد کو مسلمانوں کے صحیح طریقے سے دفنانا، اور اب ہمارے لیے بہتر غذا کی تجویز۔ کوئی چال تو ہے جو یہ لوگ چل رہے ہیں۔''

''سنو وقرین، خود پر قابو رکھو اور چلّانا بند کرو۔ مجھے یقین ہے کہ مفاضل کو بھی نہیں معلوم کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے چیخنا چلّانا بند کرو، نماز پڑھو، اور انتظار کرو۔''

مفاضل نے دروازے بند کر دیے اور ایک لفظ بھی کہے بغیر چلا گیا۔

میں نے استاد الغربی کے بارے میں سوچا اور اس مہیب خلا کے بارے میں جو وہ اپنے پیچھے

چھوڑ گیا تھا۔ میں اب بھی اس کی گہری، پرجلال آواز سن سکتا تھا... وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوا تھا اور اس نے ہماری تقدیر کے خلاف کبھی بغاوت نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ وہ ''خدا کی بے لوث بندگی'' کے عالم میں ہے، یہ کہ وہ یہاں صرف عبادت کے لیے ہے، اپنے ساتھیوں پر نکتہ چینی کے لیے نہیں۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا تھا کہ مرا ہوا آدمی زیادہ عظیم ہوتا ہے بہ نسبت زندہ آدمی کے، اس لیے کہ مٹی کی جانب لوٹنے کا مطلب ہے کہ وہ مٹی ہو گیا۔ اور مٹی سے زیادہ عظیم کوئی شے نہیں ہوتی۔ وہ ہمارا مقبرہ بنتی ہے، ہماری آنکھیں بند کرتی ہے اور ایک خوبصورت ابدیت میں پنپتی ہے۔

34

جولائی 1991 کے دن تھے۔ ہمیں وطن اور باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں نے شمار کیا کہ جیل سے پہلا خط اسمگل ہونے اور ہماری غذا میں تھوڑی سی بہتری آنے کے درمیان کتنا عرصہ گزر چکا ہوگا۔ مجھے ان دونوں کے درمیان ایک تعلق نظر آیا، امید کے متعلق سوچے بغیر — کسی قسم کی جیت کا خیال تو آیا ہی نہیں۔ خطوں اور بوتل میں بند پیغاموں کے پانچ سال۔ مجھے ان سب کوششوں کا علم کیونکر ہوتا جو میڈم کرسٹین، فرانس میں رہائش پذیر میرا بھائی، عمر کی دواساز بہن، وقرین کی بیوی اور دوسرے بہت سے لوگ کر رہے تھے؟ جو ہمارے اس دوزخ کے بارے میں خبریں پھیلا رہے تھے جس کے وجود کو گزشتہ اٹھارہ سال سے مخفی رکھا گیا تھا؟

وقرین پرسکون ہو چکا تھا، لیکن ہمارے دو ساتھی، نمبر گیارہ محمد اور نمبر سترہ ایشو، جو تاغونائٹ کے بربر قبیلے سے تھے، ایک طویل بیماری کے سبب قریب المرگ تھے جس میں کھانستے کھانستے ان کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ انھیں خصوصی علاج کی ضرورت تھی۔ باقی سب لوگ مفاضل کی لائی ہوئی دوائیں کھاتے تھے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہم جس حال میں ہیں وہاں یہ ہمیں فائدہ ہی پہنچائیں گی۔ ان دونوں کی کھانسی کی آواز سن کر مفاضل نے مجھے بتایا کہ شاید جلد ہی بعض ڈاکٹر ہمیں دیکھنے آئیں گے۔

''پھر وہ قبریں کس کے لیے ہیں؟'' میں نے جواب میں پوچھا تھا۔

''مجھے کیسے علم ہو؟ مجھ سے اس قسم کے سوال کرنا بند کرو۔ اٹھارہ سال ہو گئے ہیں! تمھیں

اندازہ ہونا چاہیے کہ میں اس غیر معمولی جیل میں محض ایک محافظ ہوں۔ ہم نے اتنا وقت ایک ساتھ گزارا ہے کہ ایک دوسرے کو چلانے کی کوشش نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن جاؤ اور دیکھو کہ وقرین کیسا ہے۔ میں اس کے متعلق پریشان ہوں۔''

مفاضل نے اس سے تامازائت میں بات کی۔ وقرین نے اپنے بچپن کی ایک لوری گائی اور پھر ہم اپنی بقا کے معمول لوٹ آئے۔ میں نے پھر سے آئینوں کے بارے میں سوچا اور اپنے چہرے کے بارے میں بھی جس کے سارے تاثرات مٹ چکے تھے، بلکہ یہ اکڑ کر ایک ایسے شخص کی مستقل چڑچڑاہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا جو ناراض اور پریشان ہو تو ہو لیکن اس پر حیران نہیں تھا کہ اب اس کا چہرہ پہلے جیسا کیوں نہیں رہا۔ میں اسے بار بار چھو کر دیکھتا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرا چہرہ چوری ہو گیا ہے۔ میرے بدن پر میرا چہرہ نہیں تھا، یہ وہ چہرہ نہیں تھا جسے میری ماں پیار کرتی تھی... اس کے علاوہ اگر کوئی معجزہ ہوا اور ماں سے میری ملاقات ہوئی تو وہ مجھے نہیں پہچان پائے گی۔ میرے پاس آنے اور مجھے گلے لگانے میں، جیسا کہ وہ اس وقت کرتی تھی جب میں سفر سے لوٹتا تھا، اسے وقت لگے گا۔ خیر، میں سفر پر ہی تو تھا: زمین کے نیچے کی ساری دنیا کا چکر لگا رہا تھا، سارے کرے پر، سمندروں اور پہاڑوں کو عبور کرتا، آوارہ گھوم رہا تھا، کوٹھری میں اس طرح جھکا ہوا جیسے کسی قبر میں پہیے لگا دیے گئے ہوں اور نشے میں دھت کمانڈنٹ اسے دھکیل رہا ہو۔ اس سفر میں عجیب الخلقت جانوروں نے کمانڈنٹ کو ڈسنے اور مجھے آزاد کرانے کی کوششیں کیں۔ میں نے تابوت میں، جسے بالشتیے اٹھا کر لے جا رہے تھے، ایک مُردے کو قہقہے لگاتے دیکھا۔ جب اس نے بیٹھنے کی کوشش کی تو کھجور کے آدھے آدھے ٹکڑے جو آنکھوں کی جگہ لگے ہوئے تھے، اس کے حلقوں سے گر پڑے۔ اچھا ہے کہ وہ اندھا ہو چکا تھا۔

میں نے ایک بیمار سارس دیکھی جو سڑک کے بیچوں بیچ لیٹی تھی اور ہوا کو روکنے کے لیے اس نے اپنے پنکھ اٹھا رکھے تھے۔

برق نے مجھے وقت کے کنویں میں لا پھینکا اور میں سر کے بل قلابازیاں کھانے لگا۔ اس بار پیکر و کمانڈنٹ کے بجائے میں نے لمبی دُم والے بندر کو دیکھا جو مجھ پر مسکرا رہا تھا۔ میں کہاں تھا؟ میں ایسا کیوں محسوس کر رہا تھا جیسے اپنی پیشانی سے کسی کشادہ کھڑکی میں ٹکریں مار رہا ہوں؟ میں سائے کا متلاشی تھا جہاں چھپ سکوں — میں، کہ جسے روشنی سے محروم کر دیا گیا تھا! — لیکن سایہ جو پڑ رہا تھا وہ شاہ بلوط

کا تھا اور میں گھاس کے ساتھ کھیلنے، انگلیاں چٹخانے اور تتلیاں پکڑنے کو آزاد تھا۔ بالشتیوں نے اس مردے کو جو مردہ نہیں تھا، پھینک دیا اور ایک لفظ بھی کہے بغیر میرے ہاتھ پاؤں باندھنے لگے۔ ان میں سے ایک مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ان سب کے چہرے مفاضل جیسے تھے۔ میں ہنس پڑا اور کوٹھری کے انتہائی کنارے پر گڑمڑیا بن گیا۔

دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی، میرا سر سبک تھا۔ میں ایسے خوش تھا جیسے کسی حیران کن سفر سے لوٹ کر آیا ہوں۔

میں خاموشی کا نگراں بن چکا تھا، امید کی طویل رات سے کوئی بھی مکالمہ کرنے سے انکاری تھا۔ مجھے اس رات سے سلامت گزرنا تھا، اس کے پوشیدہ گڑھوں سے بچنے کی کوشش کیے بغیر، پتھروں کو تھامے بغیر، حشرات سے کلبلاتی مرطوب مٹی کو کھائے بغیر۔

میں نے یہ جان لیا تھا کہ آدمی ہر شے کا عادی ہو جاتا ہے، یہاں تک کے چہرے، سیکس، یا امید کے بغیر بھی جینے کا عادی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ دوسرے لوگ اپنی جنسی خواہشوں سے کس طرح نمٹ رہے ہیں لیکن میں نے اپنا مسئلہ اس بھٹ میں ڈالے جانے کے بعد تین دن میں ہی حل کر لیا تھا۔ یہ طے کرنے کے بعد کہ میرا کوئی گھر بار نہیں، کوئی منگیتر نہیں، کوئی ماضی نہیں، میں باہر کی دنیا کے بارے میں سوچنا چھوڑ چکا تھا اور اس طرح خواہشوں اور فنتاسیوں سے میں نے خود کو محروم کر لیا تھا۔ اپنے جنسی عضو کا استعمال میں صرف پیشاب خارج کرنے کے لیے کرتا تھا۔ بقیہ وقت وہ سرد پڑا رہتا تھا، اپنی سادہ ترین صورت میں محدود۔ مجھے کسی طرح کے شہوانی خواب بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ میرے جنسی عضو نے احتجاج نہیں کیا، مزاحمت نہیں کی، مجھے پریشان نہیں کیا۔ اس کے متعلق کوئی خیال میرے دل میں کبھی نہ آیا۔ جب بیچارے رشدی نے اپنے نامرد ہوتے جانے سے متعلق شکایت کی تو میں نے موضوع بدل دیا تھا۔ میں جیل میں جنسیت کے سوال کا سامنے کرنے سے خوفزدہ نہیں تھا لیکن یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ ہر ایک کا نجی مسئلہ ہے۔ زندگی پر یلغار کے خلاف سنگھرش، باہر کی دنیا کے خیالوں کے خلاف جدوجہد کو متواتر جاری رکھنا ضروری تھا۔ ہمیں کچھ بھی ایسا نہیں ہونے دینا تھا، کسی بھی ایسی شے کو اندر نہیں آنے دینا تھا جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے: خواب ہوں یا منصوبے، گلاب کی خوشبو ہو یا

عورت کی۔ ہماری جدوجہد اس دیوار کو مزید اونچا کرنے اور مضبوط تر کرنے کی تھی، اس کے باوجود کہ ہمارے زندان کی دیواریں کسی خصوصی مسالے سے تعمیر کی گئی تھیں جس سے وہ بالکل غیر جاذب ہو گئی تھیں۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنے مرنے والے ساتھیوں کی تدفین کے لیے جانے پر اصرار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شروع میں ہم تھوڑی بہت روشنی، تھوڑا سا آسمان، تھوڑی سی زندگی چھیننے میں کامیاب رہے تھے— اس کے باوجود کہ عسکری مظالم نے اسے کسی قدر مجروح کر دیا تھا۔ یہ ہمارے سنگھرش کے تیز تر ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ غربی کے جنازے میں اپنی آنکھیں میں زیادہ تر بند کیے رہا۔ آسمان پر حالانکہ دھند تھی، لیکن وہ مجھے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ روشنی سے مجھے اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میری جیت جیل میں ہی شروع ہونی چاہیے ورنہ میں بھی اپنے اکثر ساتھیوں کی طرح ضائع ہو جاؤں گا اور جدوجہد کے بغیر مر جاؤں گا۔

کھلی قبروں سے وقرین اب خوفزدہ نہیں تھا۔ اس نے ایک دن مجھے جگایا۔ ان کی توضیح ڈھونڈ لینے پر وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

"تمھیں معلوم ہے کہ انھوں نے وہ ہمیں ڈرانے کے لیے کھودی ہیں۔ کیا تم نے غور کیا کہ برسوں کے انکار کے بعد وہ ہمیں استاد کو دفن کرنے کی اجازت دینے میں بالکل نہیں ہچکچائے؟ انھیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی مرنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قبریں ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لیے کھودڈالیں۔ تم جانو کہ یہ ایک مصنوعی سزائے موت جیسی بات ہے۔ میں نے ایک امریکی فلم میں ایسا ہی دیکھا تھا۔ وہ اپنے شکار کی آنکھوں پر پٹی باندھتے ہیں، فائرنگ اسکواڈ آتا ہے، وہ گولی مارنے کا حکم دیتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں اور خوف کے مارے شکار کا پاخانہ نکل جاتا ہے۔ وہ گولیاں نقلی تھیں۔ ایسے ہی یہ قبریں بھی نقلی ہیں! لیکن ہم... ہم جانتے ہیں کہ صحن میں کھدے ان سوراخوں میں ہم داخل ہونے والے نہیں۔ ویسے بھی وہ بیرک کا صحن ہے، کوئی قبرستان نہیں۔ دیکھو میں نے ان کے کھیل کو کیسے پہچان لیا۔ میں احمق نہیں ہوں، اور تم بھی نہیں ہو، تمھیں مجھ سے اتفاق ہے، ایسا ہی ہے نا؟"

"یقیناً۔ میں متفق ہوں۔ وہ قبریں دھوکا ہیں۔ کیونکہ اگر رباط کے احکام ہمیں ختم کر دینے کے ہیں تو وہ ہمیں الگ الگ جگہوں پر دفنا کر خود کو تھکائیں گے نہیں۔ وہ ہم سب کو ایک اجتماعی قبر میں پھینک دیں گے اور نجات پالیں گے۔"

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم آج کیا کرنے والے ہیں؟''

''ہم دعا کریں گے کہ ہمارے ساتھی محمد اور ایشو اپنی تکلیفوں سے نجات پا جائیں۔''

وہ دونوں خاموشی سے مر گئے، اس کے ایک ہفتے بعد۔

35

مجھے اب یاد نہیں کہ کس شاعر نے کہا تھا کہ ''موت زندگی کا خاتمہ نہیں کرتی۔'' یہ تصور میرے ذہن پر حاوی رہتا تھا، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس پر کس طرح غور کروں اور اپنے ان چند ساتھیوں سے اس کے متعلق کس طرح بات کروں جو 1991 کے اس موسم گرما تک زندہ رہ گئے تھے۔

جیل کے بی بلاک میں پانچ ہی لوگ زندہ بچے تھے: اشعر، عباس، عمر، وقرین اور میں۔ موت اب بھی ہمسایہ تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنا کام ختم کرنے کی عجلت میں تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وقرین نے بتایا تھا کہ مفاضل کا کہنا ہے کہ جیل کے اے بلاک میں قیدیوں کو ریزر اور شیونگ کریم مہیا کیے گئے ہیں۔ یہ بات معقول لگی۔ جیل کے دوسرے بلاک میں قیدیوں کے ساتھ اکثر ہم سے بہتر سلوک کیا جاتا تھا، شاید اس لیے کہ دو یا تین اہم افسر بھی ان میں شامل تھے۔ جو بھی ہو، مجھے واقعی اس افواہ کی کوئی فکر نہ تھی اور میں نے دوسروں کے ساتھ اس پر بات کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن یہ کوئی اشارہ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ تو ہو رہا تھا۔ ہم نے مصیبت میں ہونے کے جو اشارے بھیجے تھے، ضرور کسی نے کہیں نہ کہیں ان پر توجہ دی تھی — شاید غیر ملکی پریس ہم پر بات کر رہا تھا، شاید بارسوخ سیاسی لوگ رباط پر دباؤ ڈال رہے تھے، شاید دانشور طبقے کے لوگ ہمیں آزادی دلانے کے لیے متحد ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ژاں پال سارتر اور سیمون دی بووار نے ہمارے حق میں آواز اٹھائی ہو اور بڑے بڑے اخباروں کے دفتروں میں کوئی پٹیشن گردش کر رہی ہو۔ ہم یہ سب کیونکر جان سکتے تھے؟ ہمیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ باہر دنیا میں ایسا کیا ہو رہا ہے جس سے ایک دن وہ ہمارے مقسوم میں دلچسپی کا باعث بنے گا... اس وقت مجھے یہ علم نہ ہو سکتا تھا کہ سارتر اور دی بووار فوت ہو چکے ہیں؛ میرے نزدیک دنیا ایک لاتغیر، غیر اہم وجود کی طرح جیے جا رہی تھی۔ شاید وہ ہماری ڈاڑھیاں صاف کریں گے،

نہلائیں گے، معقول کپڑے دیں گے اور شاید دوسرے کوارٹروں میں منتقل کر دیں گے تا کہ ہمیں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سامنے پیش کیا جا سکے؟

وہ ہمیں صاف ستھری جیل میں منتقل کر دیں گے، ایسی کوٹھریوں میں جو بستر، نائٹ اسٹینڈ، الیکٹرک لیمپ اور نئے کمبلوں سے آراستہ ہوں اور وہ ہمیں بھیڑ کا گوشت، بھنا مرغ اور تازہ مچھلی بھی کھانے کو دیں گے...

جولائی کے اوائل میں ہمیں تھوڑا سا گوشت دیا گیا: اٹھارہ برسوں میں پہلی بار اونٹ کا گوشت ملا جو آلو اور پھلیوں کے ساتھ پکا ہوا تھا۔ کھانا وافر مقدار میں تھا لیکن اس میں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ میں تو گوشت کی بو تک بھول چکا تھا۔ کبھی یاد بھی نہیں کرتا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا، اونٹ کے گوشت کی بھنی ہوئی بوٹیاں نانا کے گھر پر کھایا کرتا تھا۔ اس گوشت کی ایک مخصوص بو ہوتی تھی، خاصی تیز، جس سے میرا جی مالش کرنے لگتا تھا۔

بے اعتمادی اور احتیاط کے ساتھ میں نے صرف سبزی کھائی، اور شوربے میں ڈبو کر تھوڑی سی روٹی بھی۔ عباس غریب نے چربیلے گوشت کو چبائے بغیر نگل لیا اور نتیجتاً بدہضمی اور شدید بخار کا شکار ہو گیا۔ دوسرے دن فاقہ کرنے کے بجائے اس نے تھوڑی سی پھلیاں اور سویاں کھائیں۔ وہ پورے ہفتے الٹیاں کرتا رہا، بخار میں بھی ویسی ہی شدت سے مبتلا رہا۔ جولائی کے اواخر تک اس کی موت واقع ہو گئی۔ اشعر نے بھی گوشت کھایا تھا، لیکن اس کے اثراتِ بد میں مبتلا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی تنومند اور مضبوط تھا۔ وقرین نے مجھ سے کہا کہ گوشت سڑا ہوا تھا اور اس میں کیڑے پڑ گئے تھے اور یہ کہ وہ ہمیں زہرخورانی سے مارنا چاہتے ہیں۔ عمر نے میرے مشورے پر عمل کیا تھا اور گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ہمارے شکم ایسی غذا ہضم نہیں کر سکتے تھے جو ان کے لیے یکسر اجنبی ہو چکی تھی۔

عباس کی موت کے بعد انھوں نے ہمیں گوشت نہیں دیا لیکن سبزیاں ادل بدل کر دیتے رہے، اور شام میں سویوں کے بجائے ہمیں ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ چاول دیے جانے لگے۔

تقریباً ایک مہینے تک میری طبیعت، میری الفقیرہ ایسا نغمہ گاتی رہی جو پیارا بھی تھا، اداس کرنے والا بھی: ایسا نغمہ جس نے مجھے اس احساس سے معمور کر دیا کہ کوچ کا وقت نزدیک ہے: اس کا، میرا، یا ہمارا — مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے اسے تھوڑے سے چاول دیے۔ اسے بھی اب بہتر خوراک

میسر تھی۔ چیخنے والا الو چلا گیا تھا۔ جیل اپنے بیشتر ساکنوں کو کھو چکا تھا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ ہم چاروں اپنے اپنے گوشوں میں پڑے اندازے لگاتے رہتے تھے۔ میں وقت کا حساب رکھتا رہا۔ عمر کو یقین تھا، بلکہ وہ قائل تھا کہ ہمارے پیغاموں نے اثر کر دکھایا ہے۔ وقرین ایک مرتبہ پھر بے یقینی کے کرب کا شکار ہو گیا تھا۔ اشعر رہائی کے بعد کے منصوبے باندھتا رہا، جبکہ میں مستقبل کے بارے میں نہ سوچنے کی کوششیں کرتا رہا۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میری رہائی کھٹائی میں پڑ گئی ہے: ہر شخص جیل سے رہا ہو جائے گا اور وہ میرے متعلق بھول جائیں گے۔ میں سوتا رہ جاؤں گا اور کسی کو مجھے بیدار کرنے کا خیال نہیں آئے گا۔ یا پھر، کمانڈنٹ ہم سب کو جمع کرے گا، تقریر کرے گا اور جب وہ ہمیں رہا کرنے والا ہو گا تبھی مجھے یہ کہہ کر روک لے گا، "تم یہیں رہو گے۔ تمھارے باپ نے تمھاری رہائی رکوا دی ہے۔ تم اس جیل میں تنہا رہو گے، جب تک کہ تمھاری موت نہ آجائے۔" اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی، میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے رات اور اس نیند کو کوسا جس نے یہ خواب جنا تھا۔ ایک صبح اٹھنے کے بعد میں نے کمانڈنٹ کی تقریر سنائی جس کا مجھے ہر لفظ یاد رہ گیا تھا:

"باقم! اٹینشن! راحہ! ایٹ ایز! میں تمھارا کمانڈنٹ ہوں۔ میرا نام دباح ہے، یعنی قصائی۔ میں ہمیشہ کا ایسا ہی ہوں جس کے پاس جذبات نام کو نہیں، نہ اچھے، نہ برے۔ میں نے اپنے ملک کی، اپنے خدا کی، اور اپنے سلطان کی خدمت کی ہے۔ جب تم لوگ اس جیل میں آئے تھے تو تم تیئس توانا جوان تھے۔ اب صرف چار رہ گئے ہو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میرا مشن سو فی صد کامیاب نہیں رہا۔ اللہ میرا گواہ ہے کہ میں نے اپنا فرض ضابطے سے، وفاداری سے، اور احکامات کی سخت پابندی کر کے نبھایا ہے۔ خیر، تم لوگ زندہ ہو: اس بات کے ثبوت کے طور پر کہ ہر شے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمھارے لیے یہ سب ختم ہوا، تقریباً ختم ہو چکا۔ تمھیں معاف کر دیا گیا ہے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ یہ یومِ آزادی، یومِ میلاد یا عیدِ کبیر * نہیں۔ تم اپنی کوٹھریوں کو لوٹ جاؤ گے۔ تمھیں گھوڑے دیے جائیں گے اور تم چلے جاؤ گے۔ اٹینشن! ڈِس مس!"

تبھی اس نے مجھے پکار کر بلایا اور بتایا کہ تمھیں معافی نہیں ملی ہے۔

اشعر کا خیال تھا کہ یہ خواب اس کے لیے تھا۔

اس نے مجھ سے کہا، "دراصل، تم چاہتے ہی نہیں کہ ہم یہاں سے نکلیں۔ میں تمھارے خواب کی

تعبیر بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تم چاہتے ہو ہم یہیں رہیں اور تم چلے جاؤ کیونکہ تمھارے باپ نے تمھاری رہائی کا انتظام کر دیا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ بتایا گیا ہے کہ خواب میں جو کچھ نظر آئے، تعبیر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ مجھے اس پر حیرت نہیں، خود غرض، بورژوا خنزیر!"

میں محتاط رہا کہ اس کی وجہ سے مجھے غصہ نہ آئے۔ میرا خواب سادہ سا تھا۔ اٹھارہ برس کے بعد، میرا باپ احساسِ جرم میں مبتلا ہوا ہوگا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ، عقیدہ یا تو خوف کو بڑھا دیتا ہے یا پھر اس کو پوشیدہ کر دیتا ہے۔ میرے باپ کو خدا کا خوف ہونا ہی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے، اپنی انانیت، اپنی بزدلی کی وجہ سے، اور سلطان کو خوش کرنے کی ضرورت کے تحت۔

میں دل ہی دل میں تلاوتِ قرآن کرتا رہا۔ وقرین نے جوڑوں میں درد کی شکایت کی۔ حرکت کرنے میں اس کی تکلیف مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ عمران گنت کو گن رہا تھا۔ جہاں تک اشعر کی بات ہے تو وہ زور زور سے اپنے خواب بیان کر رہا تھا کہ جب وہ باہر نکلے گا تو کیا کیا کرے گا۔

"میرے معاملے میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ میں ہمیشہ کا سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ جب میں گھر جاؤں گا تو گھر بیچ دوں گا اور مراکش میں لذیذ غذاؤں کی دکان خرید لوں گا۔ میں اس میں یورپ سے برآمد شدہ اشیا رکھوں گا۔ میں دوسری شادی کرلوں گا، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اور اس طرح ایک نئی زندگی شروع کروں گا۔ اگر میرے بیوی بچے بیس سال تک میرے بغیر جیتے رہے تو وہ آئندہ بھی اسی طرح رہ سکتے ہیں۔ میں انھیں بھول چکا۔ بھولنا ہی تھا۔ وقت گزر جاتا ہے۔ جو کبھی تمھاری آنکھوں کا تارا اور دل کا پیارا ہوتا ہے وہی ایک دن دھندلا پڑ جاتا ہے۔ اپنی رہائی کے دن میں ایک اصلی ریستوران میں کھانا کھاؤں گا۔ شراب پی کر بدمست ہو جاؤں گا اور جا کر خانقاہوں میں پیشاب کروں گا۔ آہ، اب مجھے چپ ہو جانا چاہیے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میں رہائی کے وقت تک رہوں گا بھی یا نہیں!"

اس کے دل میں کوئی شک نہ تھا، ذرا بھی تامل نہ تھا۔ میرے خواب جنجال تھے، اور میرے شکوک وشبہات فوج درفوج۔ میں بلاشبہ ایسا تجربہ کار قیدی تھا جو کسی وہم میں مبتلا نہ تھا۔ اشعراب میرے اعصاب پر حاوی نہیں ہوتا تھا۔ عمر کا شمار کرتے رہنے کا جنون اب مجھے پریشان نہ کرتا تھا۔

اس رات میں نے اپنی آخری جنگ لڑی۔ یہ گھنٹوں تک جاری رہی۔ موت نے میرے دل

میں اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ وہ اسے چیرنے کی کوشش کر رہی تھی، جبکہ زندگی سے چمٹے رہنے کے لیے میں اسے مخالف سمت میں کھینچ رہا تھا۔ اس غار میں اٹھارہ برس گزارنے کے بعد میں موت کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ میں جانتا تھا، جیت میری ہی ہوگی۔ مجھے پسینہ آرہا تھا۔ میں موت کے غضب ناک چہرے کو دیکھ سکتا تھا جو دانت پیس رہی تھی اور غیظ و غضب سے بلبلا رہی تھی۔ میں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ میں ہی جیتوں گا۔ اپنی آخری کوشش کرتے ہوئے میں اپنی معمولی قوت کی رتی رتی کو بروئے کار لایا اور محسوس کیا کہ موت کے پنجوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ میں ایسے گر پڑا جیسے میرے سینے پر گھونسا مارا گیا ہو۔ واماندہ و خستہ، لیکن سکون اور بخیر ہونے کے ایک ایسے احساس کے ساتھ جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں اپنے درد و کرب، خیالات اور ایک ایسے خستہ حال بدن کے ساتھ، جسے میں سائنس کے لیے عطیہ تک نہیں کر سکتا تھا، تنہا رہ گیا۔ میں ماندہ تھا، اور بالکل تنہا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرے سارے جوڑ باہم مل کر منجمد ہو گئے ہیں — میری اکڑی ہوئی انگلیاں، خمیدہ شانے، کبڑی کمر، پوچ بدن اور الجھے ہوئے افکار جو کسی ایسے بے رنگ خلا میں معلق تھے جو نہ سیاہ تھا نہ سفید، بس کسی شے کی انتہا پر معلق... زندگی میں اگر ایسی صورت سے پالا پڑا ہوتا تو میں نے کہا ہوتا کہ میں اپنے کھونٹے کی رسی کی انتہا پر تھا، لیکن یہاں یہ تصور کرنا بھی مجھے مشکل لگا کہ ہماری رسی کیسی نظر آتی۔ شاید جلاد کے پھندے جیسی۔

اس دن میں نے اپنے ساتھیوں کو بونوئل کی فلم *The Exterminating Angel* کی کہانی سنائی۔ میرے ساتھی دہشت کے مارے چیخ پڑے۔ فلم کی کہانی کو مراکشی پس منظر میں ڈھال کر میں نے انھیں بتایا کہ اس مشہور ڈنر کا اہتمام کاسابلانکا میں امیروں کے علاقے انفا کی ایک شاندار کوٹھی میں کیا گیا تھا۔ ہم لوگ بھی وہاں میزیں لگانے اور افسروں اور ان کی بیویوں کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔ ہم لوگ باغ کے خیمے میں تھے جبکہ مراکش کے اعلیٰ بورژوازی — بزنس مین، سیاست داں، سوسائٹی کی خواتین — انواع و اقسام کے تمام قابلِ تصور لذیذ کھانے سیر ہو کر کھا رہے تھے۔ اور پھر آدھی رات کے آخری گجر کے ساتھ ایک نادیدہ پنجرہ آسمان سے اترا۔ اس میں سب کو قید کر دیا اور بدبختی کے اس قفس سے نکلنے کی کوشش میں باہم لڑنے کے لیے چھوڑ دیا — ستم گر مقدر کے ایک ایسے

گلاس ہاؤس میں جہاں لوگ یہ بھول چکے تھے کہ وہ کون ہیں یا وہ کس کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ ہم انھیں دیکھ رہے تھے اور بیئر پی رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں ہنستے ہوئے دیکھا اور گالیاں دینے اور چلا چلا کر مدد کے لیے پکارنے لگے۔ ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ شیشہ کی دیواریں اٹوٹ تھیں۔ یہ خدا کی مرضی تھی، قدرت کا انصاف تھا۔ اور ہم، جو ہیجان زدہ اور مضطرب تھے، نہیں جانتے تھے کہ یہ ڈراما کس طرح ختم ہوگا۔ ایک مینا تور خانہ جنگی ہماری آنکھوں کے سامنے شروع ہو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھیں نکال رہے تھے، اس باوقار ڈنر پارٹی کے بعد بے رحمی سے جنگ آزما تھے۔ خون بہہ رہا تھا اور آنسو بھی۔ عورتوں کے پھٹے ہوئے ملبوسوں سے ان کی چھاتیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور کولھے عریاں تھے اور ان کے مرد ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ اپنی سچی فطرت ظاہر کرتے ہوئے وہ راکھشسوں اور آدم خوروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ پھر بھیڑوں کا ایک گلہ اٹلس کے پہاڑوں سے اترا اور کوٹھی کے چاروں طرف پھیل کر لان کی گھاس چرنے لگا۔ کرنل کی بیوی نشے میں رقص کرنے لگی اور دوسری عورتوں نے اس کی طلائی بیلٹ اور ہیروں کا نیکلس کھینچ لیے۔ اس کریہہ منظر پر کس کو ہنسی نہ آتی؟ خیمے کے پیچھے سارے ملازم جمع تھے، جنھوں نے نادانستہ خود کو گھر سے باہر نکلنے پر مجبور پایا تھا۔ اب وہ کہہ رہے تھے کہ یہ خدا کا انصاف ہے، اس کا یومِ حساب۔ علی الصباح جب پو پھٹ رہی تھی تبھی شیشے کی دیواریں ہٹ گئیں اور مہمانوں نے اپنے لباس درست کرنے شروع کر دیے۔ رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے تا کہ ان کی تلخ انجام خواری کو نہ دیکھ سکیں۔

یہ فلم میرے ذہن پر کیوں چھائی ہوئی تھی؟ میں نے اس کو مراکش میں اتنا حقیقی بنا کر کیوں پیش کیا کہ قابلِ یقین لگنے لگے؟ ایک خوبصورت کہانی، فہم و دانش کا کرشمہ۔ یہی شے یہ ہمیں یاد آتی تھی، اسی کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت تھی: فہم و دانش کی۔

کہانی کے آخر میں فلم کو اپنے ملک کے پس منظر میں پیش کرنے کے لیے میں نے بونوئل سے معافی مانگی۔

نادیدہ دیواروں یا ضعفِ ارادی کا یہ استعارہ حسبِ معمول اشعر کی سمجھ میں نہیں آیا جس میں فیشن ایبل سوسائٹی کے وہ لوگ مبتلا تھے۔ اس نے احتجاج کیا اور اس کی منطقی وضاحت کا مطالبہ کرنے لگا۔

جس دن میرے حوصلے اور مشقت نے میرا ساتھ چھوڑا تھا، اس دن میں اس فلم پر غور کرتا رہا تھا اور میں نے تصور کیا تھا کہ کمانڈنٹ ہمارے بھٹ تک چل کر آیا، اس نے اپنے ہاتھوں سے جیل کا دروازہ کھولا اور ہم سے کہا تھا، "یہاں سے دفع ہو جاؤ! تم لوگ آزاد ہو..."

ہم خارجی دروازے کی سمت بڑھے اور ایک نادیدہ مکڑی کا جالا جسے شیطان نے یا کمانڈنٹ کے اردلی نے بن دیا تھا، ہمارے راستے میں حائل ہو گیا۔ ہم مڑے اور حیرت زدہ کمانڈنٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں نفرت سے چمک رہی تھیں۔ اس کا قہقہہ ابل پڑا۔ جیل کا دروازہ بند کیے بغیر، وہ ہمیں، ہماری بلائے ناگہانی کے ساتھ تنہا چھوڑ گیا۔

36

ہم کیونکہ یہ جان سکتے تھے کہ ہم اپنی شہادت کے آخری ایام میں جی رہے ہیں؟ مفاضل نے اپنا رویہ بدل لیا تھا اور مجھ سے باتیں کرنے راہداری میں چلا آتا تھا۔ اس نے چند عجیب وغریب باتیں کہیں اور جب میں اپنے سر کو بیچ بیچ میں جنبش دیتے ہوئے سن رہا تھا تو میرے خیالات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔

"تمھیں پتا ہے، تم — تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ تم یقین نہیں کرو گے، لیکن اگر تم لوگ چلے گئے تو میں تمھی کو سب سے زیادہ یاد کروں گا۔ کسی کو کیا چاہیے — میں بھی انسان ہوں۔ مجھے تمھاری عادت پڑ گئی ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں یہ سب نہایت سخت تھا۔ درحقیقت، شروع میں میرا خیال تھا کہ تم لوگ زیادہ دن زندہ نہیں رہو گے۔ میرا خیال تھا — ہم سب کا یہی خیال تھا کہ تم میں سے کوئی بھی ایک سال سے زیادہ نہیں نکالے گا۔ لیکن انسان حیرت انگیز مخلوق ہے! اس کے پاس قوتِ ارادی کا غیر متوقع خزانہ ہوتا ہے۔ ہر رکاوٹ کے باوجود وہ مزاحمت کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سارے لوگ مزاحمت نہ کر سکے۔ لیکن ذرا سوچو — اگر تم رہا ہو گئے تو تم ایک چلتا پھرتا کرشمہ ہو گے! اندازہ لگاؤ، ہم یہ شرطیں تک لگاتے تھے کہ کون مرے گا اور کب مرے گا۔ تمھارے گروہ نے کوئی ناقابلِ برداشت کام کیا اور تم لوگوں نے اس کی قیمت چکائی۔ کھیل کے اصول ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ذرا تصور کرو، اگر تختہ پلٹنے کی

کوشش کامیاب ہو جاتی تو ہم انھی بیرکوں میں ساتھ ساتھ افسر ہوتے۔ ہو سکتا ہے میں تمھارا ماتحت ہوتا۔ اٹھاون سال کی عمر ہو چکی ہے اور میں ابھی تک نان کوم ہوں۔ تم اس وقت تک کمانڈنٹ یا کرنل بن چکے ہوتے۔ زندگی عجیب ہوتی ہے۔ میں یہ تمھارے لیے مزید وٹامن لے کر آیا ہوں۔ انھیں رکھ لو۔ یہ تمھیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ایک نوجوان عورت نے مجھے یہ ڈبا دیا ہے۔ ان گولیوں میں یومیہ ضرورت کے مطابق سب کچھ ہے۔"

"اور میں؟ میں یوں ہی مر جاؤں؟" اشعر چیخ کر بولا۔

مفاضل اس کے متعلق بھول گیا تھا۔

"تم، تم کبھی نہیں مرو گے، ایک موٹے خنزیر کے سے شکم کے ساتھ تو قطعی نہیں..."

"لیکن مجھے تکلیف ہے، مجھے ہر جگہ درد ہو رہا ہے۔ پلیز، مجھے بھی کچھ دوائیں دے دو!"

مفاضل نے اسے شکوہ کرتے چھوڑا اور چلا گیا۔ جاتے وقت کوٹھریوں کے دروازے بند کرتا گیا۔

اس لمحے مجھے ایک گہرے سکون کا احساس ہوا۔ مجھ پر اس سے زیادہ کچھ اور نہیں بیت سکتا تھا۔ جاؤں یا رہوں، زندہ رہوں یا مر جاؤں... میرے نزدیک یہ ایک ہی بات تھی۔ جب تک مجھ میں عبادت کرنے اور ذاتِ باری تعالیٰ کے حضور میں رہنے کی توانائی تھی، میں محفوظ تھا۔ میں بالآخر ابدیت کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا جسے انسان کی نفرت، اس کی خست اور خباثت کبھی نہ چھو سکیں گی۔ اس طرح مجھے ایسی باوقار تنہائی حاصل ہو گئی تھی، یا میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ جس نے مجھے تاریکی سے بلند تر اور ان کی رسائی سے دور کر دیا تھا جو بے آسرا لوگوں کا شکار کرتے ہیں۔ میرے اندر کچھ بھی نہیں کراہتا تھا، میرے اعضا خاموش ہو چکے تھے، جمود کی ایک ایسی صورت میں ڈھل گئے تھے جو راحت اور موت کے بین بین تھی۔

میں مزاحمت کی حدِ آخر پر پہنچ چکا تھا۔ میرا جسم میری اطاعت سے دست کش ہو چکا تھا۔ ایک ہی طرح کی عبادتوں سے، ایک ہی طرح کی تصویروں سے میرا دماغ متورّم ہو چکا تھا۔ پھر بھی... مجھے معلوم تھا کہ ہمارے اندر نور کا سیلاب آئے گا۔ آنکھیں بند کیے ہوئے میں اپنے وصال کا تصور کر کے خود کو تیار کر رہا تھا۔ میں تھوڑا سا اس فریب میں مبتلا ہو رہا تھا کہ میں ہیرو نہیں لیکن ایسا آدمی ضرور ہوں جو

اس جیل کے رنج ومحن میں اٹھارہ سال گزارنے کے باوجود اپنی انسانیت سے چمٹا رہا۔ دوسرے معنوں میں اپنی کمزوریوں اوراحساسات کی ان زلزلہ صفت قوتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے ساتھ زندہ رہا جن کے وجود کو میں طویل عرصہ پہلے تسلیم کرنا چھوڑ چکا تھا۔ میرا قلعہ اب منہدم ہو رہا تھا۔ مجھے ان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو ہمیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ یہ سب باتیں میرے سر میں، جسے میں اب اپنے ہاتھوں میں نہ پکڑ سکتا تھا، ایک ساتھ تیزی سے گردش کرتی تھیں۔ درد اور رنج سے مغلوب ہو کر میں اپنی عزلت کے مہیا کردہ احساسِ تحفظ کو کھو چکا تھا۔ اپنے ایمان کے ساتھ میں اب تنہا نہیں تھا۔ میرے باطن کے میدان میں خلل انداز آ گئے تھے: خرابیوں نے مجھ پر یورش کر دی تھی۔ میں نے لفظ ''کرب'' بولنے سے انکار کر دیا — اس کی جگہ 'Madness' کو ترجیح دی۔ میں حرف M پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے بازو اس طرح پھیلا دیے جیسے کسی سوئمنگ پول کے نیلے پانی میں غوطہ لگانے والا ہوں۔ میں حرف d کی مضبوط گولائی سے چمٹ گیا۔ میں گر پڑا اور بہ دقت واپس چڑھ سکا۔ e کو پکڑ کر میں نے اس کا حلقہ اپنے گرد ڈال لیا اور اسے اس طرح گرفت میں لے لیا جیسے وہ زندگانی کا محافظ ہو۔ لیکن میرے ساتھ جو کچھ گزر رہا تھا اس کی اس لفظ کے عمومی معنوں سے کوئی مطابقت نہ تھی۔ فطرت کی دیوانگی نے، میرے تخیل کی دیوانگی نے مجھے بچا لیا۔ ''میڈنیس... میڈنیس...'' میں گنگنانے لگا۔ خوش بختی سے کسی نے میرا گانا نہیں سنا، میری آواز اب بمشکل ہی آواز جیسی لگتی تھی۔ دوسرے الفاظ میرے بچاؤ کے لیے چلے آئے۔ میں لفظوں کے سمندر میں تھا، اڑتے ہوئے صفحوں کی ایک متغیر فرہنگ میں۔ اس میں سب سے راحت افزا لفظ astrolabe تھا۔ مجھے اس کی خوش کن صوت اچھی لگی۔ وہ نغمہ جو میں نے اس میں محسوس کیا، مجھے اچھا لگا۔ یقیناً اس آلے اصطرلاب سے اس کا کچھ تعلق نہ تھا جو ستاروں کے مدارج کا حساب لگاتا ہے۔ گو کہ.... Astro + Labe = aspire + labor

نماز کے بعد وقرین کی بلند چیخیں، جو جانے والوں سے پیدا ہونے والے جیل کے خلا میں گونج رہی تھیں، مجھے واپس کوٹھری میں لے آئیں۔ یہ سیاہ آسمان میں بجلی کی زوردار کڑک جیسی تھیں۔ وقرین اپنی چیخ وپکار پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ اس کی تکلیف اتنی شدید تھی کہ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ قابو سے باہر ہو چکا تھا، اس کا اپنے اوپر قابو نہ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی درندے کے

جبڑوں سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہیں سنا۔ ایسے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید اس نے موت کو دیکھ لیا ہو اور اب اس کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر رہا ہو؟

اس غار میں گزارے اٹھارہ برسوں میں، مرنے والے ہمارے تمام ساتھیوں کے ذریعے میں عزرائیل فرشتے سے قدرے آشنا ہو چکا تھا، وہی جس کو خدا مرنے والوں کی روحیں قبض کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ میں اسے دیکھا کرتا تھا، فروتن، سفید پوش، صابر اور سکون بخش۔ ان کے پیچھے عطرِ جنت الفردوس کی خوشبو آتی جسے شاید میں ہی سونگھ سکتا تھا، کیونکہ یہ بس گھڑی بھر کو ہی ٹھہرتی تھی۔ میں اس کی آمد کو، اس دھیمی سرد ہوا سے محسوس کر لیتا تھا جو جیل سے گزرتی تھی اور جب اس کی خوشبو میری کوٹھری کو بھر دیتی تو سمجھ لیتا تھا کہ وہ گزرا ہے۔ درانتی ہاتھ میں لیے ہوئے موت کے ڈھانچے کی تصویر کے مقابلے میں یہ ایک خوب تر تصور تھا۔

اس دن میں نے نہ تو اس کی موجودگی محسوس کی اور نہ خوشبو۔ وقرین کو اپنی اذیت برداشت کرتے رہنا تھا۔ اس کی آخری گھڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ رات ہوتے ہوتے اس نے چیخنا چلانا بند کر دیا، لیکن کسی بچے کی مانند زار و قطار روتا رہا۔

صبح ناشتے میں ہمیں تازہ روٹی دی گئی۔ وہ شاید دو دن پہلے تیار کی گئی ہو گی۔ اس کے ریزے اب بھی نرم تھے۔ کافی ویسی ہی تھی جیسی ہمیشہ ہوتی تھی: اونٹ کے موت جیسی۔ لیکن پہلی بار انھوں نے ہمیں تھوڑی سی شکر بھی دی۔ میں مٹھاس کا ذائقہ پوری طرح بھول چکا تھا۔ یہ مجھے تلخ لگی۔ میرا تھوک اس قسم کے کھانوں کا عادی نہیں رہا تھا۔ اشعر نے اطمینان کا نعرہ بلند کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب رہائی یقینی ہے۔ عمر نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جہاں تک وقرین کی بات ہے، وہ دھیرے دھیرے زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا، اور اس نے روٹی اور شکر کھائی۔

لنچ میں انھوں نے سارڈین مچھلی کے ڈبے اور سنگترے دیے۔ شام کے کھانے میں وہی معمول کی سویاں۔ وہ ہماری عادتیں ایک ساتھ زیادہ نہیں بگاڑنا چاہتے تھے۔ یہ جولائی کا مہینہ تھا اور محافظ نے ہمیں پوری بے شرمی سے بتایا تھا، ”آج نوجوانوں کا فیسٹول ہے، سیدنا کا یومِ پیدائش۔ خدا انھیں محفوظ رکھے اور اپنی رحمت نازل کرے...“

دوسرے دن علی الصباح وہ اشعر کو لینے آئے۔ اسے کوٹھری سے آنکھوں پر پٹی اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر لے جایا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے آزاد کیا جارہا ہے۔

''الوداع دوستو!'' اس نے کہا۔ ''میں سب سے بزرگ ہوں۔ مراکش میں ہم اپنے بڑوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے۔ یہ فطری بات ہے کہ رہا ہونے والا پہلا شخص میں ہی ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم لوگوں کی رہائی میں بھی اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

ایک محافظ نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

بعد میں پتا چلا کہ اسے اور دوسرے جیل بلاک سے ایک افسر کو قنیطرہ کے سول جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ لوگ ہماری رہائی کے بعد کئی مہینے تک وہاں رہے۔

اس رات میں نے یہ خواب دیکھا:

ہم سب نے سفید کفن پہن رکھے ہیں اور ایک مسجد میں جمع ہیں۔ ہم بلا انقطاع نماز پڑھ رہے ہیں۔ ہم پہلو بہ پہلو ہیں لیکن آپس میں بات نہیں کرتے۔ نمازوں کے بیچ میں ہم روایتی کورنش بجالاتے ہیں۔ مجھے چلنے میں دقت ہورہی ہے کیونکہ کفن میری ٹانگوں اور بازوؤں کے گرد سختی سے بندھا ہوا ہے۔ جب میں اس کا ایک بندھن اپنی انگلیوں سے کھولتا ہوں تو وہ کپڑا جس نے مجھے ڈھانپ رکھا ہے زمین پر گر جاتا ہے۔ میں عریاں نہیں ہوں۔ ایک اور کفن میرے بدن کو ڈھکے ہوئے ہے لیکن وہ میرے پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتا۔ میں چل سکتا ہوں۔ میں مسجد سے رخصت ہوتا ہوں جبکہ میرے ساتھی اب بھی نماز پڑھ رہے ہیں۔ میرے جانے کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ باہر نکلنے پر روشنی کی چکاچوند میرا استقبال کرتی ہے۔ میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور اپنی ماں کو دیکھتا ہوں۔ میں چلتا رہتا ہوں اور کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

میں یہ سوچنے کی جسارت نہیں کرتا کہ مسجد جیل خانہ تھی یا یہ کہ جیل خانہ عبادت خانے کی ترجمانی کرسکتا ہے۔

37

میری قید کی بدترین رات، دو تمبر 1991 کی رات تھی۔

ہمیں جیل کے بلاک اے میں لے جایا گیا جہاں زندہ رہ جانے والے ہم سے زیادہ تعداد میں تھے۔عمر، وقرین اور میں، تینوں ہی ذہنی اور جسمانی طور پر غور وفکر اور تکان کے دہشت ناک حال میں تھے۔ ہمارے لیے چلنا اور اپنے قدموں پر کھڑے رہنا دوبھر تھا۔وقرین زمین پر رینگ رہا تھا، جبکہ عمر گرنے سے بچنے کے لیے بار بار دیوار کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔مفاضل میرے قریب آیا اور اپنا بازو پیش کرتے ہوئے بولا، ”مجھے پکڑلو۔ دہشت ناک خواب ختم ہونے کو ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ختم ہوا۔ میں اس سلسلے میں اس سے زیادہ نہیں جانتا جتنا تم جانتے ہو، لیکن لگتا ہے کہ یہ سب ختم ہونے والا ہے۔“

میں نے گردن ہلائی، بولنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

ہم ننگے پیر تھے۔ انھوں نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور ہتھکڑیاں پہنادی تھیں۔ ایک آواز نے، جسے ہم پہچانتے نہ تھے، ہمارے نمبر پکار کر حاضری لی۔ اسی سے مجھے پتا چلا کہ دوسرے بلاک میں کون کون مر چکا تھا۔ اٹھاون سزا یافتگان میں سے اٹھائیس ہی زندہ تھے۔ ظالمانہ اذیت دہی کے تیس شکار، تیس مردے، تیس شہید، جو مختلف عرصوں میں اور مختلف اشتداد کے ساتھ انجام پذیر ہوئے۔

انھوں نے ہمیں ٹرکوں میں ڈال دیا۔ میں نے کینوس کا پردہ گرنے کی آواز سنی جس نے گاڑی کے پچھلے حصے کو مہر بند کر دیا۔ ہمارے اجسام رات بھر بری طرح جھٹکے کھاتے رہے، جیسے اس ٹوٹی پھوٹی سڑک کا انتخاب خصوصی طور پر کیا گیا ہو۔ ٹرک بغلی سڑکوں اور کچے راستوں پر بھی اسی طرح دوڑتے رہے۔

میں نے محسوس کیا کہ ٹرک کی رفتار دھیمی ہوگئی ہے۔ مخالف سمت سے دوسری فوجی گاڑیاں آ گئیں۔ ہمارے دونوں ڈرائیوروں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بلڈوزر تھے، دوسرے سزا یافتگان سے لدے ہوئے ٹرک نہیں جنھیں ہماری جگہ قید کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔

”بلڈوزر، ہاں بلڈوزر!“ ہمارے ڈرائیور نے چیخ کر اپنے معاون سے کہا۔ ”فولاد ہے—

فولاد جو ہر چیز کو نگل لیتا ہے، ہونہہ!"

"ہمیں چاہیے کہ انھیں گزر جانے دیں، ورنہ وہ ہمارا کچومر نکال دیں گے۔"

"ٹھیک کہتے ہو — فولاد کے ساتھ تکرار نہیں کی جا سکتی!"

میں اور کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ میں نے تصور کیا۔ میں نے اختراع کی۔ میں نے دیکھا کہ دھات کے جبڑے دیو ہیکل کرین سے لٹکے ہوئے ہیں اور بلڈوزر ہر شے کو منہدم کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اب کچھ نہیں بچا، کوئی کوٹھری نہیں۔ جیل کو توڑ دیا گیا، اس کی دیواریں منہدم ہو گئیں، پتھروں کو ریزہ ریزہ کر کے ریگ میں تبدیل کر دیا گیا۔ گرسنہ مشینیں ہر طرف جائیں گی، ہر عمارت کو کچل دیں گی۔ میں نے ایک خیال بچھوؤں کے لیے بھی بچا کر رکھا: وہ بھی دھول اور ریت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ لیکن ہر شے کا انہدام کیوں؟ آہ! دہشت کی تمام نشانیوں کو مٹانے کے لیے! دہشت کے تجربے سے بھی زیادہ بری بات اس کے وجود سے انکار کرنا ہے۔

میں تمھیں مسطح کرتا ہوں، تمھاری پشت توڑتا ہوں، تمھیں گڑھے میں دھکیل دیتا ہوں، میں تمھیں انتہائی اور بے جان تاریکی میں تل تل کر کے مرنے کے لیے چھوڑتا ہوں، اور پھر ہر شے کا منکر ہو جاتا ہوں۔ اس کا کبھی وجود نہ تھا۔ کیا؟ تازمامرت میں کوئی جیل؟ کون گستاخ احمق ہے جو یہ سوچنے کی جسارت کرتا ہے کہ ہمارا ملک ایسا جرم، ایسا ناقابلِ بیان گناہ کر بھی سکتا ہے؟ اسے باہر نکال پھینکو! اوہ! تو یہ کوئی عورت ہے! خیں کیا فرق پڑتا ہے، اسے دفع کرو۔ وہ مراکش کی سرزمین پر کبھی قدم نہ رکھنے پائے! غدار! بدراہ کہیں کی؟ وحشی! وہ ہم پر یہ شک کرنے کی جسارت کرتی ہے کہ نپٹ تنہائی میں سسکتی موت دینے کا انتظام کیا گیا؟ کیا جگر پایا ہے! وہ ہمارے ملک کے دشمنوں کی آلۂ کار ہے جو ہمارے استحکام اور خوش حالی سے حسد کرتے ہیں۔ حقوقِ انسانی؟ لیکن ان کا تو ہم احترام کرتے ہیں — ذرا اپنے چاروں طرف نظر ڈالو! سیاسی قیدی؟ نہیں ہمارے یہاں کوئی سیاسی قیدی نہیں۔ غائب کر دیے گئے لوگ؟ پولیس ان کو تلاش کر رہی ہے۔ ہمیں پولیس کو شاباشی دینی ہوگی کیونکہ وہ اپنا کام نہایت شاندار ڈھنگ سے کر

رہی ہے۔

یہ تقریر درد سے پھٹ رہے میرے سر میں گردش کرتی رہی۔ میں مسکرانے لگا۔ تو وہ ہماری جیل کو توڑ کر ختم کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے تصور میں فوجی سپاہیوں کو سیمنٹ کی سلوں پر ضربیں لگاتے، پسینے میں نہاتے دیکھا، ان کے سانس پھولتے دیکھے۔ انھیں بولنے یا سوال پوچھنے کی مناہی تھی۔ "ہیڈ کوارٹر کے آرڈر۔" ایک خفیہ آپریشن۔ اسے کوئی نام تک دیا گیا ہوگا: روز پیٹلس —— گلبرگ، املشیل * کے موسم کی وجہ سے، جس میں مرد اُن عورتوں کو گلاب کے پھول پیش کرتے ہیں جن سے وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک لطیف اشارہ ہے۔ میں نے دوسرے سپاہیوں کو کھجور کے درخت لے جاتے دیکھا—— مراکش کے کھجور کے باغوں سے تازہ اکھاڑے ہوئے درخت۔ اور انھیں اسی جگہ لگانے کی کوشش کرتے تصور کیا جہاں لوگ انتہائی اذیت کے تجربے سے گزرے تھے۔ پھر میں نے تصور کیا—— بلکہ شک میں پڑ گیا اور یقین کر لیا کہ کھجوریں مذبذب ہیں۔ سپاہی انھیں زمین میں لگاتے ہیں، انھیں سہارنے کی کوشش کرتے ہیں، انھیں رسیوں کے سہارے کھڑا کرتے ہیں، لیکن وہ کھڑے ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ جھکتے ہیں اور زمین پر گر جاتے ہیں، سرخ اور زرد دھول کے بادل اڑاتے ہوئے۔ سپاہیوں کو پھندا لگتا ہے، وہ کھانستے ہیں، اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن بے سود۔ کھجور کے درخت اس مشکوک زمین کو قبول کرنے کو تیار نہیں، اس ملعون مقام کو جس نے خونریزی اور بے سود اشک ریزی دیکھی ہے۔ کھجور کے درخت قبرستانوں میں نہیں اگتے۔ چنانچہ سپاہی کھجور کے پیڑوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور بلوط یا راش کے درخت اکھاڑنے ماموراکے جنگلوں میں جائیں گے اور ایک بار پھر کوشش کریں گے۔ آپریشن گلبرگ میں، شرمساری چھپانے کے لیے۔

اگر سپاہی جیل کے سارے نشانات مٹانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو بھی ہماری یادوں سے وہ سب کبھی نہ مٹا سکیں گے جو ہم نے وہاں برداشت کیا ہے۔ آہ، میری یادیں، میری رفیق، میری دولت، میرا احساس! ہمیں صبر کرنا ہے۔ ہمیں ہارنا ہرگز نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں—— واماندگی، اور اتنی ساری پریشانیاں۔ آہ، میری یادداشت، میرا ایکچہ جو میرے ان الفاظ کو زندگی کے دوسرے سرے تک لے جائے گا، مری دنیا سے بعید تر۔ چنانچہ جاری رکھو: انہدام، جھوٹ، چھپانا۔ آدمیوں کی راکھ پر رقص جاری رکھو۔ تمھارا سر چکرا جائے گا اور پھر وہاں ہوگا صرف... عدم۔

درد اور تکان کی شدت نے مجھے خاموش کر دیا۔ میرا سر ابلتے ہوئے پانی کی طرح کھول رہا تھا۔ میرے افکار اس میں تحلیل ہو رہے تھے۔ تصویروں نے بے قراری سے چکر کاٹے اور پھر رات کی سیاہی میں ڈوب گئیں۔ میرے شانوں میں درد تھا، میری پیٹھ دُکھ رہی تھی، میری جلد میں تکلیف تھی، یہاں تک کہ میرے بالوں میں بھی درد تھا۔ میری گردن اور ہاتھ اکڑ چکے تھے۔

ہمارا سفر پورے بارہ گھنٹے بعد ختم ہوا۔ جب ٹرک رکے تو ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ ہم جیل میں واپس آ گئے ہیں۔ ہم ٹرک سے نیچے اترے اور ایک سپاہی ہمیں وہاں سے لے چلا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لایا، میری ہتھکڑیاں نکالیں اور آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو درد کی شدت سے فوراً ہی بند کر لیں۔ دیوار کا سہارا لیے میں منتظر رہا، یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ میں نے پھر سے آنکھیں کھولیں۔ دیوار میں، اونچائی کی جانب میری نظر ایک چھوٹی سی کھڑکی پر پڑی جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ بے انتہا خستگی کے باوجود میں مسکرانے لگا۔ ایک طویل عرصے کے بعد پہلی بار۔ سپاہی نے مجھ سے کہا کہ تم بستر پر لیٹ سکتے ہو۔ میں جہاں تھا وہیں رہا، جیسے میں نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ احترام اور ہمدردی کے ملے جلے لہجے میں اس نے پھر کہا، "لیفٹیننٹ، اگر لیٹ جاؤ تو تمھیں زیادہ آرام ملے گا۔" وہ کیسے جانتا تھا کہ میں لیفٹیننٹ تھا؟ بیس برس کا عرصہ گزر چکا تھا جب کسی نے مجھے اس طرح مخاطب کیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اس عہدے پر میری ترقی 9 جولائی 1971 کو ہوئی تھی۔ اگلے روز مجھے اپنی وردی میں دوسرا اسٹار لگانا تھا۔ سپاہی نے بستر تک پہنچنے میں میری مدد کی۔ میں داہنی کروٹ سے لیٹ گیا۔ زمین لرزی، پلنگ ڈولنے لگا، دیواروں نے مجھے بھینچا اور پھر پیچھے ہٹ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ چھت ننھی ننھی روشنیوں سے جگمگا رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میں کسی خلا میں گرتا جا رہا ہوں۔ میں اون یا روئی کے بوروں پر آ گرا تھا۔ اس سے مجھے میری پہلی پیراشوٹ جمپ یاد آ گئی جس میں میں نے اپنے دل میں خوف کے سبب درد کی لہریں اٹھتی محسوس کی تھیں۔ لیکن یہ دہشت اس سے کہیں زیادہ بری تھی، جیسے مجھے کوئی پاتال میں کھینچ رہا ہو۔ میں ٹھٹھر رہا تھا۔ میں نے خود کو بے وزن ہوتا محسوس کیا اور میرا سر چکرانے لگا۔ اس نرم بستر کو فوراً چھوڑ دینا ضروری تھا۔ میری جلد کسی نرمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میرا جسم ہر طرح کے زخموں کی پیوندکاری کا مجموعہ تھا۔ میری روح سلامت تھی، بلکہ پہلے سے زیادہ توانا، لیکن میری جلد

بے انتہا مجروح ہو چکی تھی۔ میں نے پھر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ گرنے سے بچنے کے لیے میں گدے سے چمٹ گیا۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد میں کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا، اس طرح کمر جھکائے ہوئے جیسے اب بھی اپنی کوٹھری میں ہوں۔ چھت اونچی تھی لیکن مجھے نیچی محسوس ہو رہی تھی۔ کمبل اور چادریں کھینچ کر میں فرش پر لیٹ گیا جو سرد اور سخت تھا۔ اس سے میرا اعتماد بحال ہو گیا۔ بالآخر مجھے نیند آگئی اور میں رات کی عمیق ترین گہرائی میں اتر گیا۔

دوسرے سپاہی نے مجھے جگایا جو میرے لیے ٹرے میں ایسی غذا لے کر آیا تھا جو میں نے طویل عرصے سے نہیں دیکھی تھی۔ بھنا ہوا آدھا مرغ، آلو کا بھرتا، ٹماٹر اور پیاز کا سلاد، تازہ روٹی اور سب سے بڑھ کر ایک کٹوری دہی۔ ہاتھ لگانے کی ہمت کیے بغیر میں اس کھانے کو بیٹھا تکتا رہا۔ پھر میں نے روٹی، آلو اور دہی کھائے۔ میں نے سوچا کہ کچھ اور کھانے سے پہلے مجھے چند گھنٹے توقف کرنا چاہیے۔ جب میں نے چکن بریسٹ کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالا تو مجھے اسے چبانے میں پریشانی ہوئی کیونکہ میرے آدھے دانت ٹوٹ چکے تھے اور بقیہ ہل رہے تھے۔ جب میں نے نوالے کو نگلا تو کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ کھانے میں کوئی ذائقہ نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے ٹماٹر کی قاشیں کھائیں اور ایک بڑا گلاس پانی کا پیا۔ اس شام کو بھی وہ میرے لیے اتنی ہی اچھی غذاؤں سے بھری ٹرے لے کر آئے۔ یہ ضیافت جیسی بات تھی۔ میں نے سبزیوں کا سوپ پیا اور پسا ہوا گوشت کھایا۔ میرے پیٹ میں فوراً ہی درد شروع ہو گیا۔ مجھے اتنا زیادہ نہیں کھانا چاہیے تھا۔

اس رات میں نے ایک مرتبہ پھر بستر پر سونے کی کوشش کی۔ یہ اب بھی اتنا ہی آرام دہ لگا کہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ایک اور رات فرش پر گزاری۔ صبح ڈاکٹر مجھے دیکھنے آیا۔ اس نے خالص طبی نوعیت کے سوالات کیے۔ میں نے بلا تبصرہ ان کا جواب دیا۔ اس کو دکھایا کہ مجھے کہاں کہاں تکلیف ہے۔ اس نے کوئی گھنٹہ بھر میری جانچ کی۔ اس نے میرے خون اور پیشاب کے ٹیسٹ کا حکم دیا اور کھانے کے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں۔

تین دن کے بعد دوسرا ڈاکٹر دیکھنے آیا۔ وہ کسی قسم کا اسپیشلسٹ رہا ہوگا اور اسے صرف میرے پتے سے سروکار تھا۔

"تمھیں آپریشن کی ضرورت ہے۔ لیکن فوری طور پر نہیں، کیونکہ ابھی تمھارا جو حال ہے اس میں

بچنا مشکل ہوگا۔ درد کے حملے صورت میں یہ دوائیں کھانا، آپریشن کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے ...''

مزید ڈاکٹر میرے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ میں ایک استثنائی کیس رہا ہوں گا، خود میں ایک عجوبہ، کیونکہ میں بدترین ناروا سلوک کے باوجود زندہ رہ گیا تھا۔ میرا جسم اس کا گواہ تھا۔

اس طلائی قفس میں دو ہفتے گزرنے کے بعد ایک طبی اردلی مجھے ڈینٹسٹ کے پاس لے گیا جو تمام ضروری آلات سے بھری گاڑی کے ساتھ آیا تھا۔

گاڑی بلڈنگ کی اس راہداری کے پاس کھڑی کی گئی تھی جہاں میرا کمرہ تھا۔ کھڑکی سے باہر نظر دوڑا کر میں نے جگہ کو پہچان لیا۔ درخت بدلے نہیں تھے، نہ ہی کوہسار۔ آسمان کا رنگ عجیب سا تھا۔

آزاد کرنے سے پہلے ہماری دیکھ بھال کے لیے وہ ہمیں ملٹری اکیڈمی لے آئے تھے جہاں سے ہم بیس برس پہلے حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے رخصت ہوئے تھے۔ ہم اہرمیمو میں تھے جسے تازمامرت سے بچ جانے والوں کے لیے شفاخانے میں بدل دیا گیا تھا۔

وہ دن میری زندگی کا ایک تاریخی واقعہ رہے گا: میں جیسے ہی دانتوں کے ڈاکٹر کی کرسی پر نیم دراز ہوا، اوپر کی طرف کسی پر میری نظر پڑی۔ یہ اجنبی کون تھا جو مجھے تک رہا تھا؟ میں نے چھت میں معلق ایک چہرہ دیکھا۔ وہ میرے ہر تاثر کی نقل کر رہا تھا۔ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ لیکن یہ تھا کون؟ میری چیخ نکلنے کو ہوئی، لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔ جیل میں اس طرح کے واہمے دکھائی دینا عام بات تھی۔ لیکن اب میں قید میں نہیں تھا۔ مجھے اس ناخواستہ شہادت کو قبول کرنا تھا: وہ چہرہ — خستہ حال، لکیریں پڑا، جھریوں دار اور پراسرار نالیاں، دہشت زدہ اور دہشت ناک۔ یہ میرا اپنا چہرہ تھا۔ اٹھارہ برس کے بعد پہلی بار میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں خوفزدہ تھا۔ اپنی ہی بے آرام نحیف آنکھوں سے خوفزدہ۔ ایسے شخص کے آسیب زدہ حلیے سے خوفزدہ جو موت سے بال بال بچ گیا تھا۔ ایسے چہرے سے خوفزدہ جو بوڑھا ہو چکا تھا اور انسانی شباہت کھو چکا تھا۔

ڈینٹسٹ خود بھی لرز اٹھا تھا۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ اس آئینے کو ڈھک دوں؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''نہیں۔ شکریہ۔ مجھے اس چہرے کی عادت ڈالنی پڑے گی جو میرے اس علم کے بغیر موجود ہے کہ یہ کتنا بدل چکا ہے۔''

میرے دانتوں کا حال دیکھ کر اسے جھٹکا لگا، یہ اندازہ میں اس کے حیرانی کے تاثرات سے لگا سکتا تھا۔ ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی جو مجھ سے ہمدردی ظاہر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس نے اپنا خیال بدل لیا کہ میں اس کی جانب کتنے عجیب ڈھنگ سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ مجھ سے اور میرے دہشت انگیز حلیے سے ڈر گیا تھا، یا پھر میری عمومی حالت سے اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس کے منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا؟ اس نے گہرا سانس کھینچا، اپنی ناک اور منھ پر ماسک چڑھایا اور میرے دانتوں پر جمی سخت تہیں صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے مسوڑھوں سے خون رسنے لگا۔ اس نے ہاتھ روک لیا اور بولا، ''اگلی بار میں مسوڑھوں کی سوجن کا علاج کروں گا۔'' اس نے مجھے بعض دوائیں دیں اور کھڑے ہونے میں میری مدد کی۔ جب میں چلنے لگا تو میں نے پھر اس چہرے پر نظر ڈالی جس نے مجھے طنزیہ انداز میں دیکھا تھا۔ اس سپاہی نے جو میرے ساتھ تھا، مجھ سے کہا، ''فکر نہ کرو، لیفٹیننٹ۔ کوئی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا ہے!''

ایک نائی ہمارے سر اور ڈاڑھیاں مونڈنے آتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے آئینہ مانگا۔

''یہ احکامات کے خلاف ہے،'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم تمھاری دیکھ بھال کے لیے ہی ہیں، اور انھیں خدشہ ہے کہ کوئی مجنونانہ خیال تمھارے ذہن میں آسکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن اپنے آئینے میں کم از کم مجھے چہرہ تو دیکھنے دے سکتے ہو؟''

''میرے پاس آئینہ نہیں ہے۔''

مہینے کا آخر ہوتے ہوتے میری شباہت ایک نارمل آدمی جیسی ہونے لگی۔ میرا صرف ایک مسئلہ تھا: میری آنکھوں کا انداز ہر شخص کو جو میری طرف دیکھتا تھا، اعصاب زدہ کر دیتا تھا۔

طبیبِ نفسیات نے ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے وہ میری نظروں سے پریشان نہ ہوا ہو۔ وہ مجھ سے سوالات کرتا گیا جن کا میں نے اختصار سے جواب دیا۔

''فوج کے تعلق سے تم کس طرح محسوس کرتے ہو؟''

’’میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔‘‘

’’کوئی غصہ، انتقام کی خواہش؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’اپنی فیملی کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟‘‘

’’فیملی فیملی ہی ہوتی ہے۔‘‘

’’اپنے باپ کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟‘‘

’’وہ ایسا شخص ہے جو اپنے بچوں سے پیار کرتا ہے، لیکن وہ باپ نہیں ہے۔‘‘

’’کیا تمھیں اس پر غصہ آتا ہے؟‘‘

’’نہیں، بالکل نہیں۔‘‘

’’جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو کیا کرو گے؟‘‘

’’اندازہ نہیں۔ شاید اپنی صحت کی دیکھ بھال کروں گا۔‘‘

’’مجھے بتایا گیا ہے کہ جب ڈینٹسٹ کے آئینے میں تم نے خود کو دیکھا تو تمھیں جھٹکا لگا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟‘‘

’’ہاں، یہ سچ ہے۔ میری آنکھیں کسی جنونی کی سی تھیں۔ حالانکہ میرا دماغ الٹا نہیں ہے۔ میں ان آنکھوں کو تسلیم نہیں کر سکا ہوں، ان میں کوئی بات دہشت انگیز ہے۔ اور میں دوسروں کی آنکھوں میں بھی ایک طرح کا خوف دیکھتا ہوں۔ شاید مجھے خود کو اس صدمے کے لیے تیار کر لینا چاہیے تھا۔ میں ان کا عادی ہو جاؤں گا، بالآخر۔‘‘

’’مجھے یقین ہے، ہو جاؤ گے۔ جب سے یہاں آئے ہو، کیا تم نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟‘‘

’’ہاں، بہت دیکھتا ہوں۔ جب وہاں تھا تو خواب ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔ وہ سب ڈراؤنے نہیں ہوتے تھے۔‘‘

’’کیا تم مجھے کسی ایک خواب کے بارے میں بتا سکتے ہو؟‘‘

’’اب کا یا پچھلا؟‘‘

’’یوں کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا خواب جس نے تم پر گہرا اثر ڈالا ہو۔‘‘

''یہ خواب میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ میں مراکش میں ہوں۔ شہر کے پرانے مکان میں۔ یہ ایک ریاض * ہے جس میں بڑے بڑے صحن اور کمرے ہیں۔ باورچی خانے میں ماں کو دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے نہیں دیکھتی۔ میں وہاں سے آگے بڑھتا ہوں۔ پیچھے کی جانب واقع کمرے کی طرف جاتا ہوں جہاں ایک کنواں ہے۔ یہ اس کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے جس پر میری بہنوں نے اس وقت کشیدہ کاری کی تھی جب وہ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ میں اس تاریک کمرے میں پہنچ جاتا ہوں۔ مجھے دو آدمی نظر آتے ہیں جو کنویں کے داہنی جانب قبر کھود رہے ہیں۔ ایک طرف مٹی کا انبار لگا ہے۔ اس میں سے چھوٹے چمکدار سانپ نکل رہے ہیں۔ ان سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔ میری کوئی آواز نہیں، نہ ہی قوتِ ارادی ہے۔ میں بس یوں ہی وہاں موجود ہوں۔ دونوں آدمی میرے بازو پکڑ کر مجھے جکڑ لیتے ہیں اور اس گڑھے میں پھینک دیتے ہیں جو انھوں نے کھودا ہے۔ وہ مٹی میرے اوپر ڈالتے ہیں، بہت سرعت کے ساتھ۔ میں حرکت نہیں کرتا۔ میں چیخنے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ میں دفن ہو چکا ہوں لیکن باورچی خانے میں جو کچھ ہو رہا ہے، سب دیکھ اور سن سکتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ماں کھانا تیار کر رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ملازمہ فرش دھو رہی ہے، ایک بلی کو دیکھتا ہوں جو چوہے کا پیچھا کر رہی ہے۔ میں خوفزدہ نہیں۔ میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔ میں خود ہی ہنس پڑتا ہوں اور کوئی بھی مجھے وہاں سے نکالنے نہیں آتا۔ خیر، بس اتنا ہی، ڈاکٹر۔ مجھے یہ خواب پسند ہے کیونکہ جو کچھ میں محسوس کرتا تھا یہ واقعی اسی کا ترجمان ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں تازمامرت میں مرنے والا نہیں۔''

''تعاون کے لیے شکریہ۔ تم نے جو کچھ بتایا ہے مجھے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا۔ خدا تمھیں سلامت رکھے!''

38

اہرمیمو میں دو مہینے کی طبی دیکھ بھال کے بعد بتایا گیا کہ ہمیں رہا کیا جانے والا ہے۔ حکام دو یا تین قیدیوں کو گھر بھیجنے کے لیے منتخب کریں گے اور انھیں ان کی ضلعی پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ آخری لمحے تک ہمیں یہ علم نہیں ہو سکا کہ کون رہا کیا جا رہا ہے اور کسے ابھی اور انتظار کرنا ہے۔ میرا نمبر

پہلے گروپ کی رہائی کے دو ہفتے بعد آیا۔ میں اپنے کمرے میں تھا جب کمانڈنٹ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر تھا۔

''سلطان سیدنا نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ چند دنوں بعد تم اپنے گھر والوں کے پاس بھیج دیے جاؤ گے۔ غیر ملکی صحافی یقیناً تم سے رابطہ قائم کریں گے، ایسے لوگ جو ہمارے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کا واضح طور پر ایک ہی راستہ ہے: ان کے زہریلے سوالوں کا جواب مت دینا۔ ان کے ساتھ تعاون نہ کرنا۔ ان کے ساتھ کسی بھی طرح کے اشتراک سے انکار کر دینا۔ اگر تم نے کسی بھی قسم کی مصیبت کھڑی کرنے کی کوشش کی تو میں بذاتِ خود تمھیں کھینچ کر تازمامرت لے جاؤں گا! سمجھ گئے؟''

میں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا، ان کے کھیل میں شریک نہ ہونا طے کیا۔ لیکن میں یہ کہے بغیر بھی نہ رہ سکا۔

''سنو، کمانڈنٹ دباج۔ آخری جملہ واپس لے لو کیونکہ تازمامرت سے زیادہ برا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟''

میں اسے حیرت میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''ملٹری اکیڈمی میں ایک شخص ہے جسے میں جانتا ہوں، مجھے تم پر اسی کا شک ہوا۔ چنانچہ اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھو۔ اور مجھے ایک درخواست بھی کرنی ہے۔''

''درخواست؟ کیا مطلب ہے تمھارا؟''

''اگر میں یہاں سے جاتا ہوں تو مجھے لیٹ کر جانا ہوگا۔ مجھے گدے کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ تو میں اپنے گھر چاروں ہاتھ پیروں کے بل چل کر پہنچوں گا، اور میرا خیال ہے کہ یہ فوج کے لیے، پولیس کے لیے، اور یہاں تک کہ ملک کے حق میں بھی اچھی بات نہ ہوگی۔''

''ڈاکٹر، تمھارا کیا خیال ہے، کیا اس کی حالت اتنی ہی خراب ہے جتنا اس کا دعویٰ ہے؟'' کمانڈنٹ نے پوچھا۔

''اس کی صحت نہ صرف خراب ہے بلکہ اسے لیٹ کر ہی سفر کرنا چاہیے، ورنہ میں گارنٹی نہیں لے

سکتا کہ وہ مراکش زندہ پہنچ پائے گا یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے، تمھیں گدا مل جائے گا۔''

وہ چلا گیا، پھر لوٹا اور ادھ کھلے دروازے میں سے جھانک کر پوچھنے لگا، ''اکیڈمی میں تم کون سے سال میں تھے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم ساتھ بیٹھ کر اس دور کی یادیں تازہ کرنے سے تو رہے!''

اس نے دروازے کو بھینچ کر بند کر دیا۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

وہ مجھے لینے کے لیے دوسرے دن آئے — آدھی رات کو۔ وہ میرے لیے ایک سوٹ، قمیص، ٹائی اور جوتے لائے تھے۔ ان میں سے کچھ بھی میرے سائز کا نہ تھا۔ چنانچہ میں وہاں سے جاگنگ کے لباس میں رخصت ہوا۔

سفر تقریباً بیس گھنٹے بعد ختم ہوا۔ میں ٹرک کے پچھلے حصے میں لیٹا ہوا تھا۔ اوبڑ کھابڑ راستوں کا سفر تکلیف دہ تھا اور ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ مراکش ہم شام کو پہنچے۔ میں نے اذان، کاروں کے ہارن اور موٹر سائیکلوں کی آوازیں سنیں... زندگی کی موسیقی کی آوازیں۔

مراکش میں مجھے رائل پولیس فورس کے ہیڈ کوارٹر میں اتارا گیا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ مجھے ایک آفس میں لے جایا گیا اور کمرے کے وسط میں رکھی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میرے سامنے پولیس افسروں کی ایک قطار تھی۔ میں نے اپنے بازو باندھے اور کیڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جو مجھ سے بات کر رہا تھا۔ آپ کو یوں لگتا جیسے میرا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔

''سیدنا سلطان نے، خدا انھیں اپنی امان میں رکھے اور ان کا اقبال بلند کرے، تمھیں معاف کر دیا ہے۔ کل تم اپنے گھر والوں کے پاس چلے جاؤ گے۔ لیکن محتاط رہنا، غیر ملکی ضرور تم سے رابطہ کریں گے...'' وغیرہ وغیرہ۔

وہ سنجیدگی اور ہیکڑی سے بول رہا تھا، لیکن میں اس کی آنتوں کی گڑگڑاہٹ، پادوں کی آواز اور دانتوں کی کچکچاہٹ اور ایک برہم جسم کی بلند آوازیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اور خصوصاً سائز بدلتا دیکھ رہا تھا۔ میرے تصور میں اس کا لٹکتا ہوا نچلا ہونٹ میز سے جا لگا جہاں اس کے ہاتھ

ڈنڈے سے کھیل رہے تھے۔ اس کے دانت گرتی ہوئی کنکریوں جیسی آواز کے ساتھ گر پڑے۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اس کے بدن سے پسینے کی بوندیں گر رہی تھیں۔ کیڈ، جسے اس سب کا احساس تھا، مجھے دھمکیاں دیتا رہا اور میں اسے گھورتا رہا۔ میں جتنا زیادہ گھورتا تھا وہ اتنا ہی ہکلاتا تھا، بدحواس ہوتا تھا اور مناسب لفظوں کی تلاش میں اپنے جملے دہراتا تھا۔ محض میری آنکھوں کا تاثر ہی اسے مفلوج کیے دے رہا تھا۔ اس نے ڈنڈا میز پر مارا جس سے ڈوسیئر میں رکھے صفحات کمرے میں بکھر گئے۔ اس مرحلے پر وہ آپے سے باہر ہو کر چیخنے لگا۔

''نظریں نیچی رکھو! تم کیڈ کے سامنے ہو! سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، ضلعی کپتان کے سامنے!...

ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی تم سے رابطہ کرے تو تم ہمیں اطلاع دو گے۔ منظور ہے؟''

میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں بس اس کی طرف تکتا رہا۔ وہ بے چین ہونے لگا، سگریٹ سلگائی اور میز کو پھر سے کھٹکھٹانے لگا۔

''کافی ہے،'' سپرنٹنڈنٹ نے اس سے کہا۔ ''اسے تنہا چھوڑ دو!''

جب میں آفس سے نکلا تو دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی ایک نوجوان عورت کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔ میں یوں ہی کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ میرے بھائی نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا اور بولا، ''نادیہ کو پہچان رہے ہو؟ تمھاری چھوٹی بہن!''

نادیہ رو رہی تھی جبکہ میری آنکھیں خالی تھیں۔ گھر پہنچ کر مجھے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ میری گرفتاری کے وقت وہ نو اور گیارہ برس کے تھے۔ میں نے ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ الجدیدہ میں طبی نگرانی میں تھی۔ جیسا کہ مجھے طویل عرصے سے خدشہ تھا، وہ شدید طور پر بیمار تھی۔ شدتِ رنج سے میں کچھ نہیں بول سکا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں سو نہ سکا۔ فرش پر لیٹ گیا، میز کے نیچے۔ میں زخمی جانور کی طرح دوہرا ہو گیا۔ کروٹیں بدلتا رہا، اٹھ بیٹھا، نیچی میز پر اپنے سر سے ٹکریں ماریں اور پھر قالین پر گر پڑا — خراشیدہ اور کاملاً شکست خوردہ۔

یہ 29 اکتوبر 1991 کا دن تھا۔ میں ابھی ابھی پیدا ہوا تھا۔

39

میری پیدائش ایک اور سخت آزمائش تھی۔ میں ایک ایسے بوڑھے کی مانند نظر آتا تھا جو دنیا میں حال ہی میں آیا ہو۔ سکڑ کر میرا قد ساڑھے پانچ انچ کم ہو چکا تھا اور میری پشت پر کوبڑ تھا۔ پسلیوں کا قفس مسخ ہو چکا تھا، پھیپھڑے سکڑ گئے تھے۔ سر پر بال تو اچھے خاصے تھے لیکن جلد پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ جب چلتا تو داہنی ٹانگ کو گھسیٹنا پڑتا تھا۔ جو لفظ میرے منھ سے نکلتے، چھن کر نکلتے تھے۔ میں ان کا انتخاب بہت احتیاط سے کرتا تھا۔ میرا منھ بند رہتا لیکن میرا ذہن مسلسل مصروف رہتا تھا۔ میں ایسا نوزائیدہ تھا جسے اپنے ماضی کو اتار پھینکنا تھا۔ میں نے طے کیا کہ کچھ یاد نہیں رکھوں گا۔ بیس برس تک میں زندہ نہیں تھا۔ اور جو شخص 10 جولائی 1971 سے پہلے موجود تھا وہ مر چکا اور کسی پہاڑ پر یا سرسبز میدان میں مدفون تھا۔

میرے گرد و پیش میں جو لوگ موجود تھے انھیں میں کس طرح سمجھاتا کہ میں ایک بالکل ہی نیا شخص ہوں، سفر کی تکان کا مارا ہوا جس کا اس شخص سے کوئی تعلق نہیں جس کی وہ توقع کر رہے ہیں اور جسے ایک دن انھوں نے کبھی نہ لوٹنے کے لیے جاتے دیکھا تھا؟ الفاظ ناکافی تھے اور ان لوگوں کے لیے گمراہ کن جو اُن سے لغوی معنی اخذ کرتے تھے۔ چنانچہ میں بولنے سے اجتناب برتنے لگا، چیزوں پر تبصرہ کرنے اور معاشرتی زندگی میں شامل ہونے سے بچنے لگا۔ میں لوگوں کو اپنے بارے میں باتیں کرتے سنتا۔

''وہ اب بھی صدمے میں ہے۔''

''کتنا عجیب و غریب ہے۔''

''اس لیے ایسا ہے کہ وہ صدمے سے مجروح ہے۔ اور کون نہیں ہوگا...''

لوگ مجھے مدعو کرنا چاہتے تھے، میری عزت افزائی کے لیے، مجھے تحفے دینے کے لیے محفلیں سجانا چاہتے تھے۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ میں اس دوزخ کے بارے میں بتاؤں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مجھے خوش کر رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ میں کتنی دور نکل چکا ہوں، اپنی عبادتوں سے چمٹا ہوا، جلاوطن ہو کر اپنے عقیدے، روحانیت اور کنارہ کشی کی دنیا میں جا چکا ہوں۔ میں پیٹ کے بل سوتا تھا، بازو پھیلا کر اس طرح جیسے کوئی نامعلوم آدمی سڑک کے کنارے پڑا چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں سیدھا، چت

لیٹنے سے ڈرتا تھا۔ میں ایک ایسی دنیا میں کھویا ہوا اجنبی تھا جہاں میں کسی شے کو نہیں پہچانتا تھا، نہ کسی شخص کو۔

پانچ مہینے گزرنے کے بعد بھی میں نئی زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں سے پریشانی محسوس کرتا تھا۔ جب میں غسلخانے میں جاتا تو پانی کی ٹونٹیوں کو دیر تک تعریفی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ میں انھیں تکتا رہتا اور چھونے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ میں انھیں اس طرح سہلاتا جیسے وہ مقدس اشیا ہوں۔ میں انھیں نرمی سے گھماتا اور جب پانی بہنے لگتا تو اس کا استعمال کفایت سے کرتا۔ میں ہر چیز پر گہری توجہ دیتا۔ چپلیں پہننے کی عادت ڈالنا میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میں پنجوں کے بل اس طرح چلتا تھا جیسے گرنے کا خوف ہو یا سنگ مرمر کے فرش کے گندا ہو جانے کا خوف۔ میری سماعت خصوصاً بہت تیز ہو گئی تھی۔ کوئی آواز مجھ سے بچ نہ پاتی تھی۔ یہ بات بہت چڑچڑاپن پیدا کرتی۔ آوازیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ خاموشی میں، میرے کانوں میں تیز بھنبھناہٹ ہوتی اور مستقل ہوتی رہتی۔ میری آنکھوں میں تصویریں بلا امتیاز جذب ہوتی رہتی تھیں، جنھیں میں شناخت تک نہیں کر پاتا تھا۔ میں اسفنج جیسا ہو چکا تھا۔ جو بھی شے میری رسائی میں آتی، اپنے اندر جذب کرتا جاتا، ساری کی ساری غڑپ کر جاتا۔ اس سے میں یہ سمجھ گیا کہ میں ایک نادر قسم کا نوزائیدہ ہوں: میں دنیا میں ابھی آیا تھا لیکن پوری طرح بالغ ہونے کے بعد۔ ہر شے مجھے حیران کرتی تھی، سحر زدہ کرتی تھی۔ میں نے ان سب کو سمجھنے کی کوشش کرنا بند کر دیا اور میں جس حال میں تھا اس کی وضاحت اپنے گھر والوں سے کرنے کی کوششیں بھی ترک کر دیں۔

سونے کے لیے مجھے ایسے بستر کی ضرورت تھی جو سخت ہو۔ اس کے لیے میں نے لکڑی کا ایک تختہ اپنے گدے کے نیچے ڈلوا لیا۔

ڈاکٹروں نے میرے کیس پر غور کیا۔ وہ یہ پتا نہ لگا سکے کہ میں زندہ کس طرح رہ گیا۔ مجھے خاموشی کی ضرورت تھی، اور تنہائی کی بھی۔ ایک ایسے گھرانے میں ان کی فراہمی مشکل تھی جس میں دوسرے گھروں کے مقابلے میں زیادہ شور و غل رہتا ہو۔

میں ماں کے قریب بیٹھنے کو ترجیح دیتا۔ اسے کینسر تھا لیکن وہ اس تکلیف کو بلا شکایت برداشت کر رہی تھی۔

''میں تمھارے سامنے شکایت کرنے کی جسارت کبھی نہیں کروں گی،'' اس نے مجھ سے کہا۔

''میں جانتی ہوں، میرے بیٹے کہ تم نے کیا کیا برداشت کیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ جب انسان اپنے ہم جنسوں کو اذیت دینے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو وہ کیا کیا کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ میں اسی پر شاکر ہوں کہ تمھیں دیکھ لیا — مجھے کتنا خوف تھا کہ اس زخم کو دل میں لیے ہوئے ہی مر جاؤں گی۔ میری زندگی اب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ مجھے اپنے پاس بلاتا ہے تو میں راضی بہ رضا ہوں۔ کوئی آنسو نہیں، رونا دھونا نہیں، بس چند دعائیں اور مہربان خیالات۔ میرے بیٹے! مجھے بتاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تم اپنے باپ سے ملے تھے! یہ کیسے ممکن ہوا؟ اور کیسا رہا؟''

''یہ دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔ تمھاری نواسی کی بیسویں سالگرہ کی پارٹی میں موسیقار، شیخہ* اور بے شمار دوست مدعو تھے۔ مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ اس قسم کی محفل میں میں زیادہ دیر تک رکنا نہیں چاہتا۔ ابا حسبِ معمول دیر سے آئے۔ وہ کسی سلطان کی طرح داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی جوان عمر بیوی تھی۔ وہ اچھی عورت معلوم ہوتی ہے۔ ابا نے ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور ان میں سے زنانے پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ گئے تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قریب گیا۔ میں جھکا اور ان کے داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا، جیسا کہ میں ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے خیریت دریافت کی۔ میں نے بتایا کہ میں خیریت سے ہوں۔ انھوں نے کہا، تم پر خدا کی مہربانی ہو۔ میں نے ان کو وہیں چھوڑا، اپنے حشم و خدم کے گھیرے میں، اور اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ انھوں نے متعدد بار سنایا ہوا اس حجام کا قصہ سنانا شروع کر دیا جس نے اپنے مکان کا کرایہ پاشا الکلاوی کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔''

''میرے بیٹے، تم جانتے ہو کہ اس نے اپنے کسی بھی بچے کو باپ بن کر کبھی نہیں پالا۔ وہ ان سے محبت تو کرتا ہے لیکن تم اس سے اپنے لیے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ بعض اوقات میں اس کو معزز مہمان کہا کرتی تھی۔ تمھیں اپنے دل میں اس کے لیے کدورت نہیں رکھنی چاہیے۔ مجھے بتاؤ... سنا ہے تازمامرت کا کبھی وجود ہی نہ تھا؟''

''وہ ایسا ہی کہتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سچ ہے کہ اس کا وجود نہ تھا۔ مجھے بھی خواہش نہیں کہ خود جا کر دیکھوں۔ بظاہر بلوط کے پرانے درختوں کا ایک چھوٹا سا جنگل اس وسیع گڑھے کو

ڈھکنے کے لیے وہاں چلا گیا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ گاؤں کا نام بھی بدلا جانے والا ہے: وہ کہتے ہیں... وہ کہتے ہیں...''

❊❊

فرہنگ

احمد شوقی: (1932-1868) مصری شاعر اور ڈراما نگار جس نے کلاسیکی عربی شاعری میں جدید موضوعات متعارف کرائے۔

امیل شیل: مجمع جس میں مرد شادی کے لیے کسان لڑکیوں کو خریدتے ہیں۔ ان میں بعض دلہنیں نہایت کم عمر (بارہ برس تک کی) ہوتی ہیں۔

اوفقیر: جنرل محمد اوفقیر، مراکش کا دوسرے نمبر کا سب سے اہم آدمی جس نے 1972 میں سلطان حسن الثانی کے طیارے کو گروا کر مارنے اور اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد اوفقیر کو ختم کر دیا گیا اور اس کی بیوی اور چھ بچوں کو — جن میں ایک کی عمر صرف تین سال تھی — قید کر دیا گیا۔ 1987 میں اس کے کئی بچے بچ نکلے اور دوبارہ گرفتاری سے پہلے فرانسیسی صحافیوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خاندان بالآخر 1991 میں رہا ہوا۔

ایسپارٹو گھاس: شمالی افریقہ کی ایک سخت، تار جیسی خودرو گھاس جسے اسپینش گراس بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا استعمال رسی، کاغذ، جوتے وغیرہ بنانے میں کیا جاتا ہے۔

بابوش: پاپوش۔ ترکی یا مشرقی جوتیاں۔

بن براہیم: الہواری محمد بن ابراہیم السراج (جو شاعر الحمرا بھی کہلاتا ہے) 1893 میں پیدا ہوا اور 1954 میں گمنامی میں مرا۔ مراکش کے لوگ اسے محبت سے 'مراکش کا شاعر' کہتے تھے اور اس کا ممتاز سرپرست، مراکش کا پاشا التہامی الکلاوی اس کا دوست تھا۔ یہ 'ملعون شاعر' ایک گستاخ بت شکن اور مروجہ اخلاقی نظام کا سخت نکتہ چیں تھا۔

تامازائت (الامازیغیہ): بربر قوم جو شمالی افریقہ کے اصلی باشندے ہیں، اور الطوارق (Tuareg)

قوم کی زبان۔ لفظ 'بربر' لاطینی کے barbarus سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: ایسا آدمی جس کا رومن دنیا سے تعلق نہیں۔ لیکن بربر خود کو 'الامازیغ' یعنی آزاد قوم کہتے ہیں۔ فرانسوی زبانوں والے عرب ملکوں میں بربر اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اور ان کی زبان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے۔

جامع الفنا: مراکش کے قلب میں واقع ایک وسیع چوک جو کسی زمانے میں موت کی سزا دینے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ اب ایک کھلا بازار ہے اور اس کا میدان جشن منانے والوں، اسٹریٹ فنکاروں، نجومیوں، رقاصوں، موسیقاروں اور ہر طرح کے ہلڑ بازوں کا اڈہ ہے۔

جلابہ: ایک ڈھیلا ڈھالا ہڈ دار لباس جسے شمالی افریقہ کے مرد پہنتے ہیں۔

ریاض: روایتی کوٹھی۔ ایک مخصوص قسم کا بڑا، ہوادار، کئی منزلہ گھر جو ایسے باغ کے مرکز میں بنا ہو جس میں کنواں یا فوارہ بھی ہو۔

سیدنا: سلطان کے لیے احتراماً استعمال کیا جانے والا لفظ، جس کے ایک معنی صرف ''جناب'' بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ 'نعم سیدنا' سے مراد ہے، ''ہاں، عزت مآب۔''

سوق: مشرقِ وسطیٰ کا روایتی بازار۔

شیخہ: گانے والی عورتوں کا طائفہ جس میں وائلن نواز اور طنبورہ نواز بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ گروہ مقبول عام نغمے گانے کے لیے اجرت پر بلائے جاتے ہیں۔

صخیرات: مراکش کے دارالسلطنت رباط کا نواحی علاقہ۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مراکش فرانس کا تحت الحمایت ملک تھا۔ کچھ عرصے سیاسی انتشار کا شکار رہنے کے بعد 1956 میں آزاد ہوا اور حسن الثانی 1961 میں سلطان بنا۔ جولائی 1971 میں ایک ہزار سے زیادہ فوجی سپاہیوں نے صخیرات کے محل پر حملہ کر دیا اور سلطان کی بیالیسویں سالگرہ کے جشن میں موجود تقریباً سو مہمانوں کو قتل کر دیا۔ اس ناکام بغاوت کے ایک سال بعد سلطان کو قتل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی اور مراکشی ایئر فورس کے طیاروں نے سلطان کے طیارے پر ہوائی حملہ کیا۔ بے اطمینانی برقرار رہی لیکن سلطان نے جابرانہ پالیسیوں کے ذریعے ملک میں قدرے امن بنائے رکھا۔ حسن الثانی، جس کا انتقال 1999 میں ہوا، گولف کا شوقین تھا اور اس نے اس نادار ملک میں بہت سے خوبصورت گولف کورس بنوائے تھے۔

طنجیہ مراکشی: الطاجین بھنا گوشت جو کوئلوں کے چولھے پر اتھلے برتن پر مخروطی ڈھکن رکھ کر پکایا جاتا ہے (مٹی کے اس روایتی برتن کو بھی الطاجین کہتے ہیں)۔ مراکشی طنجیہ بھیڑ کے گوشت کو خاص طرح کے پارچوں میں کاٹ کر اور مراکش کے خاص مسالے اور جڑی بوٹیاں ڈال کر، جو راس الحنوط کہلاتے ہیں، پکایا جاتا ہے

۔اس گوشت کو بیلن نما بڑے سے برتن میں آٹے سے مہر بند کر کے تندور میں رات بھر پکایا جاتا ہے۔

عید کبیر: بقر عید، عید الاضحیٰ۔

فاتحہ: سورۂ فاتحہ۔ کہا جاتا ہے کہ مراکش کے سلطان حسن الثانی نے صخیرات کے قتل عام کو فاتحہ پڑھ کر اس وقت روک دیا جب ایک باغی لیڈر سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔

قندورہ: جلابہ سے ہلکا، بہت گھیر دار اور بے آستین لباس جو مشرقی افریقہ میں بعض اوقات زیریں لباس کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

کوسکوس: شمالی افریقہ کی ایک ڈش جس میں سوجی یا دانہ دار آٹے کو گوشت یا شوربے کے ساتھ بھاپ میں پکایا جاتا ہے۔ ''سات سبزیوں والا کوسکوس'' بہار کے موسم میں لیما پھلیوں، توری، گاجر، شلجم، بیضوی مرچ، پیاز اور چھولوں کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔

کیلب / کلیب: عربی کے کلب سے ماخوذ فرانسیسی لفظ، بمعنی کتا۔ فرانسیسی میں کیلب واحد اور کلیب اس کی جمع ہے۔

گرین مارچ: وہ علاقہ جو آج مغربی صحرا کہلاتا ہے، 1957 میں اسپین کا تحت الحمایت صوبہ تھا۔ تحریکِ بغاوت نے ہسپانیوں کو کھدیڑ دیا تھا جنھوں نے فرانس کی مدد سے علاقے پر پھر سے تسلط جما لیا اور اس کو اسپین کا ایک خارجی صوبہ بنا دیا۔ 1970 کی دہائی کے اوائل میں نامطمئن باشندوں نے آزادی کا مطالبہ کرنے کے لیے تنظیمیں بنائیں جن میں ساقیہ الحمرا اور ریو دی اورو (البولیساریو) کی آزادی ۔ عوامی محاذ Popular Front for the Liberation of Saguia el Hamra and Rio de Oro (Polisario) بھی شامل تھا۔ 1975 میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف نے ہسپانوی صحرا پر مراکش اور موریتانیہ کے دعووں کو مسترد کرتے ہوئے مقامی صحراوی باشندوں کے حقِ خود مختاری کو تسلیم کیا۔ لیکن تب تک مراکش کے حسن الثانی نے گرین مارچ (اسلام کے مقدس رنگ سے منسوب) منظم کر دیا تھا: تین لاکھ سے زیادہ مراکشی (جن میں کچھ رضا کار بھی شامل تھے) ہسپانوی صحرا پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ صحراویوں نے اپنے دفاع کے لیے اسپین سے مدد کی اپیل کی۔ اقوامِ متحدہ نے ڈھلمل رویہ رکھا اور مراکشی فوجیں متنازعہ علاقے کے شمال مشرق میں بولیساریو کے گوریلوں سے متصادم ہوئیں۔ 5 نومبر کو حسن نے مارچ کرنے والوں کے لیے سرحد پار کرنے کا حکم جاری کیا۔ ایسے حالات میں جبکہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار مراکشی اس علاقے کے اندر پہلے ہی داخل ہو چکے تھے اور الجزائر (جو بولیساریو کا حمایتی تھا) اور مراکش کے بیچ جنگ کا خطرہ بڑھ چکا تھا، اسپین مراکش کے ساتھ براہِ راست مذاکرات کے لیے آمادہ ہو گیا۔ میڈرڈ کے معاہدے کے مطابق اس علاقے کا 1/3 جنوبی حصہ موریتانیہ کو ملا

اور بقیہ سارا علاقہ مراکش کو، جس نے اگست 1979 میں موریتانیہ کے انخلا کے بعد سارے علاقے کا انتظام و انصرام سنبھالے رکھا۔ اقوامِ متحدہ نے اس الحاق کو تسلیم نہیں کیا ہے لیکن مراکش کی شاہی حکومت اس مسئلے کو قومی اتحاد اور تفاخر کی پرورش کے لیے استعمال کیا کرتی ہے، اس طرح یہی وضع چلی آ رہی ہے۔

مدینہ: کسی شہر کے مقامی باشندوں کا علاقہ یا ''قدیم شہر''۔

موا کل: ایسے مطیع شوہر کو کہا جاتا ہے جسے یہ مانا جاتا ہو کہ اسے قابو میں رکھنے کے لیے اس کی بیوی اس کی غذا میں پر اسرار اشیا ملاتی ہے۔

نکلائیاں: ایک عرب کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار ہونے کے بعد میور سال جیل میں بیٹھا یہ سوچتا ہے کہ وقت کے ساتھ انسان ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے: ''اگر میں کسی درخت کے کھکھل میں رہنے کو مجبور کر دیا جاؤں اور کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہو، سوائے اس کے کہ اپنے سر کے اوپر گلِ فلک کو نہارتا رہوں تو میں بتدریج اس کا بھی عادی ہو جاؤں گا۔ میں پرندوں کو اڑان بھرتے دیکھوں گا یا تیرتے ہوئے بادلوں کو اسی طرح دیکھتا رہوں گا جیسے ابھی میں اپنے وکیل کی عجیب و غریب نکلائیوں کو دیکھتا رہتا ہوں، اسی طرح جیسے میں اپنی پرانی دنیا میں صبر کے ساتھ انتظار کیا کرتا تھا کہ ہر ہفتے میری کے ساتھ عشق بازی کروں گا۔''

طاہر بن جلون

یہ بصارت گُش اندھیرے

یہ ناول مراکش کے سلطان کے خلاف ایک ناکام بغاوت کی پاداش میں دی جانے والی ہولناک غیر انسانی سزائے قید کی کہانی سناتا ہے۔ حقیقی تجربے پر مبنی ہونے کے باوجود یہ ناول کوئی سیاسی دستاویز نہیں ہے۔ یہ ان دروغ گویوں، قاتلوں اور اذیت دہندوں کو بے نقاب ضرور کرتا ہے جو تازمامرت کی ہولناکیوں کے ذمے دار تھے لیکن ان پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے سے انکار کرتا ہے۔ اس ناول کی ایک خوبی یہ ہے کہ ایک ہولناک قید کا بیان اپنے فوری سیاق وسباق سے اوپر اٹھ کر ہر طرح کی بے انصاف انسانی صورتحال کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے عجب نہیں کہ متعدد دوسرے ناولوں اور آپ بیتیوں میں دکھائے گئے مناظر اور بیان کیے گئے احساسات پڑھنے والے کے ذہن میں جابجا منور ہوتے رہیں جن کا قید سے تعلق نہ ہو۔ مثلاً کسی کو ملیالم ادیب بن یامین کا ناول بکری بیتی یاد آسکتا ہے، جو ایک انسان کے غلامی جیسی صورت حال سے گزرنے کی کہانی سناتا ہے، کسی اور کو ایرانی فکشن نگار ہوشنگ گلشیری کا ناول شہزادہ احتجاب، جو اقتدار کے ہاتھوں سیاسی مخالفین کے وحشیانہ قتل کا منظر دکھاتا ہے، اور کسی کو دلت آپ بیتیاں جن میں انسانوں کے پورے پورے گروہوں کو انسانی شرف اور دنیا کی قریب قریب ہر آسائش سے محروم کر کے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور اور اس زندگی کو بدلنے کی نہایت دشوار کوششوں میں مصروف دکھایا جاتا ہے۔ عالمی وبا کے دنوں میں اس ناول کو پڑھنے والے اس میں اپنی جھیلی یا دیکھی ہوئی صورت حال کی بھی کچھ جھلکیاں پا سکتے ہیں۔

ISBN: 978-969-648-043-3

Rs.300 یہ بصارت گُش اندھیرے